کبھی عشق ہو تو پتا چلے

نایاب جیلانی
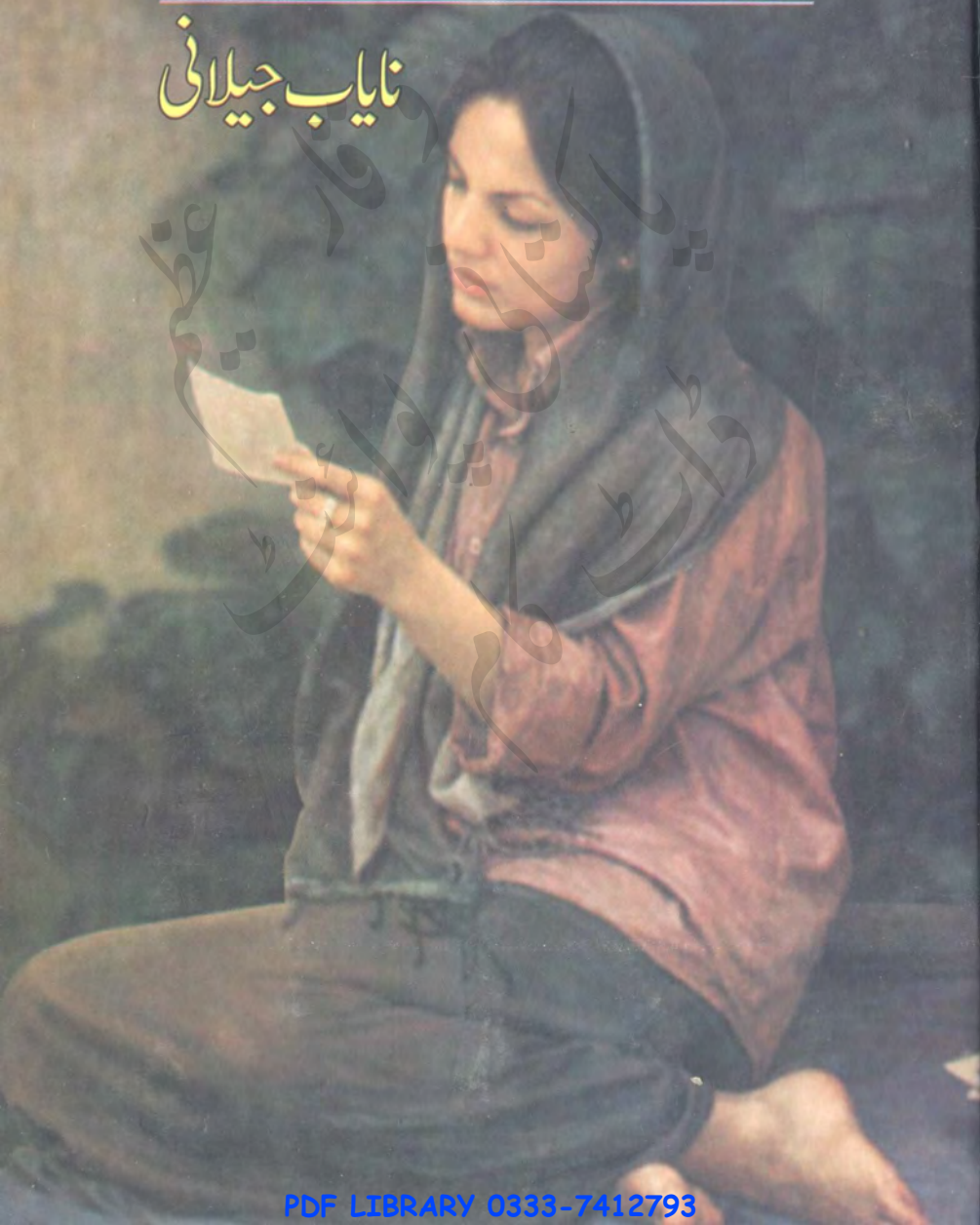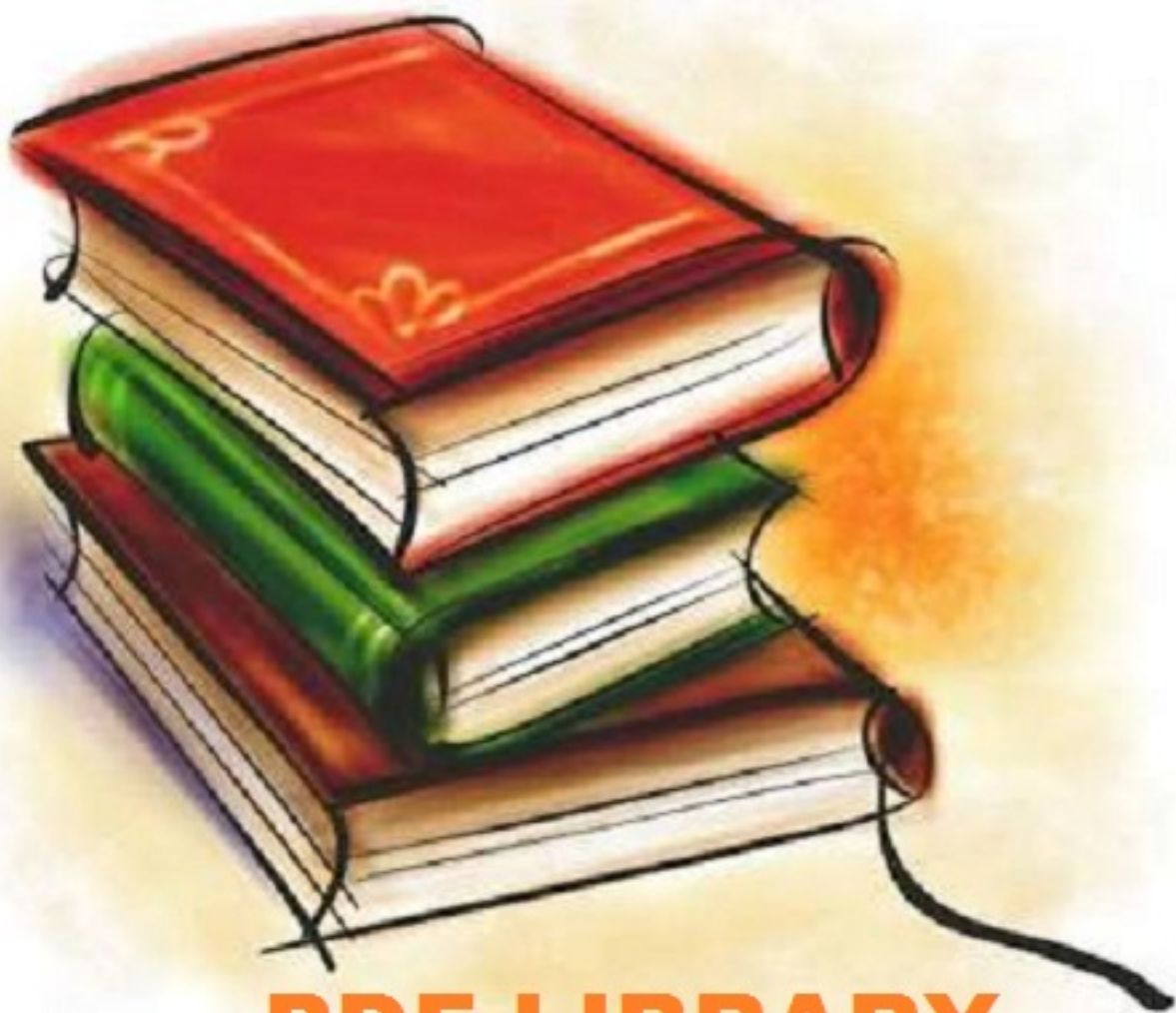
کبھی عشق ہو تو پتا چلے

بساط جاں پہ عذاب اترتے ہیں کس طرح
شب و روز دل پر عتاب اترتے ہیں کس طرح
کبھی عشق ہو تو پتا چلے
یہ جو روگ سے ہیں چھپے ہوئے پس دوستاں
تو یہ کون ہیں؟
یہ جو روگ سے ہیں چھپے ہوئے پس جسم و جاں
تو یہ کس لیے؟
یہ جو کان ہیں میرے آہٹوں پہ لگے ہوئے
تو کیوں بھلا؟
یہ جو ہونٹ ہیں صف دوستاں میں سلے ہوئے
تو یہ کس لیے؟
یہ جو اضطراب رچا ہوا ہے وجود میں تو یہ کیوں بھلا؟
یہ جو سنگ سا کوئی آ گرا ہے جمود میں
تو یہ کس لیے؟
یہ جو دل میں درد چڑھا ہوا ہے لطیف سا
تو یہ کب سے ہے؟
یہ جو پتلیوں میں ہے عکس کوئی خفیف سا

سو یہ کب سے ہے؟
یہ جو آنکھ میں کوئی برف سی ہے جمی ہوئی
تو یہ کس لیے؟
یہ جو دوستوں میں نئی نئی ہے کمی ہوئی
تو یہ کیوں بھلا؟
یہ جو لوگ پیچھے پڑے ہوئے ہیں فضول میں
انہیں کیا پتا، انہیں کیا خبر؟
کسی راہ کے کسی موڑ پر جو انہیں ذرا
کبھی عشق ہو تو پتا چلے

باہر طوفانی بارش برس رہی تھی اور اندر اس کی آنکھوں سے سیلاب جاری تھے وہ پچھلے تین دن سے مسلسل اسی طرح آنسو بہا رہی تھی اب تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ آنکھ سے آنسو خشک ہو گئے ہیں۔ روتے روتے ایک دم ہی اس کے پیٹ میں شدید درد اٹھا تھا جو کہ لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کے پورے وجود میں سرائیت کر گیا بائیں بازو میں الگ کھنچاؤ محسوس ہو رہا تھا سینے پر گویا کسی نے پتھر کی بھاری سل رکھ دی تھی۔ اس گھٹن زدہ کمرے میں اس سے سانس لینا دشوار تر ہو گیا تھا وہ کھانستے ہوئے بمشکل اٹھی تھی پھر آگے بڑھ کر اس نے کھڑکیوں کے پٹ کھول دیے۔

ٹھنڈی ہوا نے بجائے سکون دینے کے اک انوکھی اذیت اور چبھن سے دو چار کر دیا تھا اس نے بھیگی ہتھیلی کو کھول کر ایک مرتبہ پھر مشعل کے ٹوٹی پھوٹی تحریر والے خط کو پڑھا تھا اس کے دل کو گویا کسی نے آرے سے چیر کر رکھ دیا زیب نے مشعل کے ہاتھوں سے لکھی تحریر کو نہ جانے کتنی مرتبہ پڑھا تھا اور کتنی ہی مرتبہ لبوں سے لگا کر بے ساختہ چوما۔

''امی مجھ میں آپ جیسا جو حوصلہ نہیں ہے۔ میرے اندر برداشت کی کمی ہے۔ میں بہت ہی بزدل ہوں۔

بہت کم ہمت ہوں مجھ میں لوگوں کی باتیں طنز، اور طعنے سننے کا حوصلہ نہیں ہے امی! آپ تو جانتی ہیں نا؟ کہ میں بے قصور ہوں میرا وجود پاک ہے وہ بھی جانتا ہے اس کے باوجود اس نے میرے ساتھ باندھے تمام بندھن توڑ لیے ہیں۔ دل کے بھی اور کاغذ کے بھی اس نے میرے دل کی پروا کیے بغیر تمام تعلق توڑ لیے ہیں۔ اس لیے میں زندگی سے تعلق توڑنے لگی ہوں

کیونکہ مجھے اس سے بے حد و حساب محبت ہے''

''یہ تو نے کیا کیا ہے مشعل! اپنی ماں کو جیتے جی مار ڈالا ہے'' اس نے کھڑکی کے پٹ سے سر ٹکاتے اذیت سے سوچا، اس کی نگاہیں گویا ان چند لفظوں پر جم کر رہ گئی تھیں۔

''کبھی عشق ہو تو پتا چلے، کبھی عشق ہو تو پتا چلے''

☆☆☆

''آپ کل واپس جا رہے ہیں؟'' وہ سرخ آنکھیں لیے حد درجہ اشتعال کے عالم میں بیڈ روم میں آ کر بولی۔

''ہاں......'' زید کا اطمینان قابل دید تھا۔

''آپ نہیں جائیں گے'' اس نے چلا کر کہا۔

ابھی ابھی جو کچھ وہ سن کر آ رہی تھی اور جو کچھ وہ پچھلے تین سالوں سے سن رہی تھی وہ ہی اس کے لیے کافی تھا کہ زید ایک مرتبہ پھر اسے سب کی نگاہوں میں ذلیل کر کے جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ زینب کی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں مارے غصے اور توہین کے احساس کے اس کا بی پی شوٹ کر گیا تھا کانوں میں سے گویا گرم دھوئیں کی لپٹیں اٹھ رہی تھی۔

''تم کون ہوتی ہو مجھے روکنے والی'' زید پیکنگ کرنے میں مصروف تھا ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ سجائے تنفر سے بولا۔

''بیوی ہوں میں آپ کی، حق رکھتی ہوں'' زینب نے چلا کر کہا۔

''میں نے کبھی تمہیں اپنی بیوی نہیں سمجھا۔ تم صرف اور صرف ریان کی ماں ہو۔ اسی لیے تمہیں برداشت کر رہا ہوں ورنہ'' وہ ضبط کے کڑے مراحل سے گزرتا بمشکل ہاتھوں کو روک پایا تھا ورنہ جی تو چاہ رہا تھا کہ سامنے کھڑی اس عورت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔

''ورنہ کیا، ماریں گے نا، ہاں بولیں ماریں مجھے ایک ہی دفعہ مار ڈالیں۔ گھونٹ دیں میرا گلا یا پھر زہر پلا دیں اپنے ہاتھوں سے، یوں روز روز تو مرنا نہیں پڑے گا نا۔ ایک ہی دفعہ جان چھوٹ جائے گی میری بھی اور آپ کی بھی'' وہ اس کی شرٹ کو کھینچتے ہوئے چیخی۔ زید نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے بیڈ پر دھکیلا اور پھر اس پر جھکتے ہوئے نفرت سے بولا۔

''مارنا ہوتا تو اسی رات تمہیں موت کے گھاٹ اتار دیتا جب یشال کا جنازہ اٹھا تھا مگر میں تمہیں پل پل، لمحہ لمحہ سسکا کر مارنا چاہتا ہوں اتنی آسان زندگی جینے نہیں دوں گا، یہ میرا خود

سے وعدہ ہے"

"میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ میں بے قصور ہوں" زینب تڑپ تڑپ کر رو دی تھی۔

"مجھے تم سے نفرت ہے۔ اس دن سے جب تم ہماری زندگیوں میں زہر گھولنے چلی آئی تھیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں آگ لگا کر جلا دوں یا پھر کسی اندھے کنویں میں دھکیل کر ہمیشہ کے لیے تمہارے ناپاک وجود کو ختم کر دوں" اس کے لبوں سے شعلے نکل رہے تھے اور زینب ایک ان دیکھی آگ میں خود کو جلتا محسوس کر رہی تھی۔ بے تحاشا روتے ہوئے وہ ایک دم اٹھی اور اس کمرے کی دیواروں پر لگی میشال کی تصویروں کو دیکھ کر زیر لب بڑبڑانے لگی۔

"ہاں میشا! میں مجرم ہوں تمہاری، میں مانتی ہوں مجھ سے گناہ سرزد ہو گیا میں نے تمہارے محبوب کو چاہنے کا گناہ کیا۔ میں نے تمہاری جاگیر پر اپنے کمتر خوابوں کا محل کھڑا کر لیا۔ مجھے معاف کر دو میشال، اللہ کے لیے مجھے معاف کر دو" اس کے آنسو گالوں پر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر میشال کی تصویر کو اٹھا کر چوما۔

"تم بہت ہی خوش نصیب ہو میشال کہ تمہارا محبوب تمہیں اس حد تک چاہتا ہے۔ اس نے خود پر زندگی کی ہر خوشی حرام کر لی ہے۔ تمہاری صورت کے علاوہ کوئی اس صورت اس کی نگاہ میں جچتی ہی نہیں۔ تمہاری محبت کے علاوہ کسی اور محبت میں اتنی طاقت کہاں کہ زید کے قفل زدہ دل کو کھول سکے تم نہیں جانتیں میشا، زید نے تمہارے وجود پر مٹی ڈالتے ہوئے تمہارے پاس ہی اپنا دل، اپنی محبت، چاہت، امنگیں، خواہشات سب کچھ دفن کر دیا ہے۔

زید نے تمہاری امانت میں ذرہ برابر بھی خیانت نہیں کی۔ چاہو تو دیکھ لو میری بے رنگ زندگی کو میری سونی کلائیوں کو، میری ویران آنکھوں اور سدا کے پیاسے دل کو، یہ گھر، زید کا دل اس کا کمرا تمہارے تصور نے آباد کر رکھا ہے۔ میں کہیں بھی نہیں ہوں میشا، کہیں بھی نہیں" زینب نے اذیت سے تڑپتے ہوئے اپنے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے نوچا اور پھر تصویر کو سینے میں بھینچتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

☆☆☆

"اس منحوس کا سایہ جس دن سے ہمارے گھر پر پڑا ہے اس دن سے ہمارا چین سکون نہ جانے کہاں کھو گیا ہے" سحرش آپی بے حد حقارت کے ساتھ کہہ رہی تھیں۔ موٹی موٹی سرخ سرخ خوبانیاں کھاتے ہوئے مہوش نے بھرپور تائید میں سر ہلایا۔

زید آج رات کی فلائٹ سے "عمان" چلا گیا تھا پہلے اس کی پوسٹنگ فن لینڈ میں تھی وہ دو دن پہلے ہی آیا تھا وہ بھی مہرین آنٹی کے بے انتہا اصرار پر اس کے جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر پورے گھر میں پہلے کی طرح سکوت چھا گیا تھا۔

"نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتا پھر رہا ہے میرا شہزادوں کی سی آن بان والا بھائی۔ گھر میں سکون ہو تو ٹھہرے ناچار دن" ٹشو سے آنکھیں صاف کر کے انہوں نے خون خوار نظروں سے زینب کو گھورا تھا۔

"میشال کیا اس دنیا سے گئی ہے ہر شے بے رنگ بے رونق نظر آنے لگی ہے۔ ایک اسی کے دم سے ہی تو زید ولا میں رونقیں تھیں۔ نیچے جانے کو اب دل ہی نہیں کرتا۔ روبی آنٹی کی حالت دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے" مہوش بھی خوبانیاں کھانے کا شغل ترک کر کے آبدیدہ ہو گئی تھی۔

"اس گھر میں تمہارے کتنے دیوانے ہیں میشال۔ ایسی محبت اور چاہت تو مقدر والوں کو ملتی ہے۔ تم ہمارے درمیان نہ ہو کر بھی موجود ہو۔ نہ ہم تمہیں بھولے ہیں نہ بھولیں گے اور نہ ہی زید ہمیں بھولنے دے گا" کارنس پر سجی میشال کی ہنستی مسکراتی زندگی سے بھرپور تصویر کو دیکھ کر سحرش آپی نے بلند آواز میں کہا تھا یوں کہ کچن میں موجود ناشتا بناتی زینب بغیر کسی تردد کے سن سکے پیڑا بناتے ہوئے اس کا ہاتھ اک لحظے کو کپکپایا تھا اس کی آنکھوں میں نمی سی اترنے لگی۔ یہ کوئی آج کی بات تو نہ تھی پچھلے چار سالوں سے وہ اس دوہری اذیت کا شکار ان کی طنزیہ باتیں، طعنے، سننے پر مجبور تھی۔

"حسن کی آگ تو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ نہ جانے کس پل ہماری میشال کو اس "کمینی" کی نظر لگ گئی" زینب نے اذیت کی تیز لہر من میں اترتی محسوس کی تھی۔ پراٹھا توے پر بے دھیانی میں ڈالتے ہوئے اس کے ہاتھ پر گرم تیل گر پڑا تھا۔ جلن کے بے تحاشا احساس سے وہ بے اختیار رو پڑی۔

"آج کی تاریخ میں ناشتا ملے گا بھی یا نہیں، اٹھو مہوش مارکیٹ کا چکر لگا آئیں۔ ابھی کچھ ہی دیر بعد عذیر آ جائیں گے مجھے لینے اور پھر جلدی جلدی کا شور مچا کر بوکھلا کر رکھ دیتے ہیں۔ ابھی میں نے اپنی چیزیں بھی سمیٹنی ہیں"

سحرش آپی جلتے کلستے ڈائننگ چیئر کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مہوش نے بھی ان کی

پیروی کی تھی زینب نے بوکھلا کر ناشتا ٹرے میں سجایا اور پھر سرعت سے کچن میں سے نکلی۔

''آپی! ناشتا کرلیں''

''خود ہی کھاؤ پیو اطمینان سے بیٹھ کر دوسروں کی بھوک پیاس تو اڑا ہی چکی ہو'' انہوں نے بغیر مڑے زہر خند لہجے میں کہا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتی سیڑھیاں اتر گئیں۔ جبکہ زینب سرخ چہرہ لیے واپس مڑ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد مہرین آنٹی اپنے بیڈروم سے برآمد ہوئی تھیں۔ اسے ٹیبل پر سر ٹکائے روتے دیکھ کر ان کی فراخ پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''چوبیس گھنٹے آنسو بہا کر تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو۔ بہت مظلوم ہو تم'' وہ سرد آواز میں بولیں۔

''یہ ڈرامے کسی اور کو دکھانا اور ہاں رونے دھونے کے لیے کسی تنہا کونے میں دفع ہو جایا کرو۔ اس گھر کے درودیوار سے تو پہلے ہی آہوں اور سسکیوں کی آوازیں آتی ہیں۔ مزید رو رو کر نحوست پھیلانے کی ضرورت نہیں اور ہاں کل سے ریان میرے بیڈروم میں سویا کرے گا اور تم ریان کا کوئی بھی کام نہیں کرو گی۔ اس کے لیے میں نے گورنس کا بندوبست کرلیا ہے''

''گورنس کی کیا ضرورت ہے۔ میں خود اپنے بیٹے کی بہت اچھی کیئر کرسکتی ہوں'' زینب اس نئے حکم نامے کو سن کر تڑپ اٹھی تھی۔

''کل سے مس سلینہ آجائیں گی'' مہرین آنٹی رکھائی سے بولیں۔

''آپ مس سلینہ کو منع کردیں''

''تم اپنی حد میں رہو'' انہوں نے غصیلے لہجے میں کہہ کر میگزین اٹھایا۔

''آج آپ میری حدود کا تعین کر ہی دیں'' اس کے بچے کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ ہمیشہ کی طرح لب سیے رکھتی مگر اس پل وہ خود پر قابو نہیں رکھ سکی تھی۔ مہرین آنٹی حیرت کا گویا مجسمہ بنی کئی لمحے اسے گھورتی رہیں۔

''اوہو......اب بولنا بھی آگیا ہے تمہیں'' وہ پھنکاریں۔

''اولاد کی محبت سب کچھ سکھا دیتی ہے۔ بولنا بھی اور اپنے حق کے لیے جھگڑنا بھی'' زینب نے تحمل سے کہا۔

''خود ماں بنی ہو تو ماں کے کرب کو بھی اب ہی سمجھو گی۔ روبی کا درد بھی تب ہی سمجھ میں آئے گا جب اپنے دل پر چوٹ لگے گی''

''میں نے پھپھو کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں۔ میں نے میثال کو مارا ہے؟'' وہ چلا اٹھی تھی۔

''ہاں تم نے ہی میثال کو مارا ہے۔ زہر دیا ہے تم نے اسے قاتلہ ہو تم'' مہرین نے بھڑک کر کہا تھا۔ زینب ساکت سی انہیں دیکھتی رہی۔

''میں قاتلہ ہوں۔ اگر میں نے میثال کو قتل کیا ہے تو پھر تم لوگ مجھے پولیس کے حوالے کیوں نہیں کرتے تاکہ مجھے پھانسی ہوجائے۔ میں مرجاؤں، ختم ہوجاؤں''

وہ بلند آواز میں چلانے لگی تھی۔ مہرین حقارت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتی رہیں۔

''تمہارے لیے جو سزا ہم نے تجویز کی ہے وہ ''پھانسی'' سے بدتر ہے''

مہرین نے سچ کہا تھا جو سزا انہوں نے اس کے لیے تجویز کی تھی وہ پھانسی سے بھی بدترین تھی۔ یہ زندگی جو سلمان انکل اور رحمان انکل نے شاید اس پر ترس کھا کر بطور تحفہ اسے بخشی تھی وہ ہر لحاظ سے بدترین تھی۔

بیٹا نفرتوں کا زہر پلاتا تھا اور ماں بہنیں لفظوں کے تیر چلا چلا کر اس کی روح کو گھائل کرتیں۔

کسی بھی محفل میں کسی بھی فنکشن میں اس کا تعارف کرواتے ہوئے ان کے چہرے اس طرح بگڑ جاتے تھے گویا کڑوا بدبودار سیرپ پی لیا ہو۔ چار سال گزر جانے کے بعد بھی انہوں نے زینب کی حیثیت کو تسلیم نہیں کیا تھا وہ زبردستی ان کے بیٹے کی زندگی میں داخل کی گئی تھی۔ ایک یتیم، بے آسرا لڑکی جس کی پھوپھی از راہ ہمدردی اسے اپنے گھر لے آئی تھی۔ جو مہرین کے اکلوتے بیٹے کی بیوی بنا دی گئی۔

اتنا حسین، اس قدر شاندار بیٹا کہ جس کو اک نظر دیکھنے کے بعد بار بار دیکھنے کی طلب انگڑائیاں لے کر بے چین کرتی تھی اور جس پر نہ صرف پورے خاندان بلکہ یونیورسٹی کی کئی لڑکیاں فدا تھیں اور وہ بس صرف ایک پری وش کی سیاہ دلکش، گہری گہری آنکھوں کا دیوانہ تھا اس کی سیاہ آنکھوں نے گویا زید کے دل کو اپنا اسیر کر رکھا تھا کہ اس کے علاوہ پھر کوئی بھی چہرہ زید کو متاثر نہ کرسکا۔

زید ولا کا چپہ چپہ ان کی بے تحاشا محبت کی گواہی دیتا تھا۔ اس گھر کے درودیوار میثال کی تصویروں سے، ان کے ڈرائنگ روم کا شوکیس زید اور میثال کی جیتی گئی شیلڈز، ٹرافیز، اور

سرٹیفکیٹس سے بھرا پڑا تھا کہ دیکھنے والوں کی نظروں میں مہرین اور روبی کے لیے فخر و انبساط کے جذبات امڈ آتے۔ وہ دونوں بے تحاشا حسین اور ذہین بچوں کی مائیں تھیں۔ ان کی گردنیں خود بخود تن سی جاتیں۔ لوگ تعریفوں کے ڈونگرے برسایا کرتے تھے۔

زید کی زینب کے ساتھ شادی سے نہ صرف مہرین کو شدید قسم کا دھچکا پہنچا تھا بلکہ ان کے پورے خاندان والوں کے لیے بھی یہ خبر کسی بڑے شاک سے کم نہ تھی۔ اسی لیے جب پہلی مرتبہ شادی کے بعد زینب، سحرش آپی کی طرف زید کے ہمراہ گئی تو ان کے ماموں اور ممانی کا رویہ اس کے ساتھ بے حد روکھا پھیکا سا محسوس ہوا تھا اسے ان کی بیٹیوں نے بالکل لفٹ نہیں کرائی تھی۔ سارا وقت وہ زید کے ساتھ ہی باتیں بگھارتی رہیں ممانی کا موڈ بھی سخت آف تھا۔ شاید وہ میشال کے بعد اپنی کسی بیٹی کا نمبر لگ جانے کی خواہش رکھتی تھیں۔ سحرش آپی نے تو اس سے ملنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ البتہ عذیر بھائی کا رویہ کافی اچھا تھا۔

ذلت اور توہین کے احساس سے اس کا رواں رواں سلگ اٹھا تھا وہ سب آپس میں خوش گپیوں میں مصروف تھیں جبکہ وہ الگ تھلگ صوفے پر بیٹھی نم آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

پھر ایسا اکثر ہی ہونے لگا تھا اسے جان بوجھ کر نظر انداز کیا جاتا اور پھر ریان کے بعد ایسا واقعہ پیش آ گیا تھا کہ اس کی رہی سہی اہمیت بھی ختم ہو کر رہ گئی نہ جانے کب کیسے مہوش کے ہاتھ اس کی ڈائری لگ گئی تھی اور پھر ایسا طوفان اٹھا جو سب کچھ ہی اپنے اندھے جھکڑوں میں اڑا کر لے گیا اور وہ سفید چٹیل میدان میں خالی ہاتھ تنہا بیٹھی رہ گئی۔

وہ سمجھتی تھی کہ اپنی خدمت، محبت اور خلوص کے جذبات سے ان لوگوں کے دلوں کو جیت لے گی اس نے مہرین آنٹی کے دل کو موم کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی مگر سوائے ناکامی کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔

وہ سارا دن کولہوں کے بیل کی طرح کاموں میں جتی رہتی اتنے بڑے گھر کی صفائی ستھرائی کے ساتھ ساتھ کھانا پکانا، کپڑے دھونا، استری کرنا صبح سے لے کر شام تک وہ بے حد مصروف رہتی۔ کبھی سحرش یا پھر ان کے ننھیال میں سے کوئی رہنے کے لیے آ جاتا تو اس کے کاموں کی فہرست مزید طویل ہو جاتی۔ پھر نیچے پھپھو کے پورشن میں جا کر ان کے ادھورے کام بھی اسی کو ہی کرنا پڑتے تھے میشال کے بعد پھپھو بے حد بیمار رہنے لگی تھیں اور پھر رحمان انکل کے جانے کے بعد تو ان کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی تھی۔

زید تقریباً روزانہ فون کرتا تھا پھوپھو کی خیریت معلوم کرنے کے لیے زینب کو اس وقت فون پر بلایا جاتا جب اسے پھوپھو کی دوائیوں یا پھر چیک اپ کے متعلق کوئی بات کرنا ہوتی تھی وہ اسے مختلف ہدایات دیتا۔ پھوپھو کے کھانے پینے کی فہرست میں کیا کیا شامل تھا۔ زینب اسے تفصیل سے بتاتی۔ اس دوران کبھی بھی اس نے بھولے سے اس کا حال احوال نہیں پوچھا تھا حتیٰ کہ بیٹے کی خیریت تک معلوم نہیں کی تھی۔

''ممی کی ڈائٹ کا خود خیال رکھا کرو۔ جو وہ پسند کریں وہ ہی کھانا بنایا کرو'' زینب کا ایک پاؤں اوپر ہوتا تھا دوسرا نیچے۔ اوپر وہ روٹیاں پکا کر آتی تو نیچے اسے پھوپھو کے لیے سوپ تیار کرنا ہوتا تھا وہ سوپ بنا کر ہٹتی تو اوپر سے مہوش کے چیخنے چلانے کی آوازیں اس کے اعصاب پر ہتھوڑے کی مانند لگتی تھیں۔

''نیچے آرام فرمانے بیٹھ جاتی ہے سب کچھ مجھے ہی کرنا پڑتا ہے'' مہوش کو ٹیبل پر کھانا لگانا کسی عذاب سے کم نہیں لگتا تھا اگر اس دوران زید کا فون آ جاتا تو مہوش کو اس کی شکایتیں لگانے کا خوب ہی موقع مل جاتا تھا۔

''ممی بے چاری نیچے آوازیں دیتی رہ جاتی ہیں مگر ان محترمہ کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی سارا دن ریان کے بہانے بستر توڑتی رہتی ہے'' کبھی کبھی زینب کا شدت سے دل چاہنے لگتا تھا کہ اس ''فتنی'' کے منہ پر کس کر تھپڑ مارے مگر وہ مٹھیاں بھینچے خود پر کنٹرول کرنے کی کوشش میں ہلکان ہوتی رہتی تھی۔

پھوپھو کی صحت دن بہ دن گرتی جا رہی تھی ان کے سرخ سفید گالوں میں زردیاں کھنڈ کر رہ گئی تھیں۔ انہوں نے بات چیت کرنا بالکل چھوڑ دی تھی۔ بس سارا دن خلاؤں میں نہ جانے کیا تلاش کرتی رہتی تھیں۔ کبھی زیادہ طبیعت خراب ہوتی تو پورے گھر میں چکراتے ہوئے بے تحاشا روتی رہتی تھیں۔ یا پھر اسے کوسنے اور بددعائیں دیتیں۔

''تم کبھی بھی سکھ نہیں پاؤ گی'' انگلی اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کر کے وہ اور زور زور سے رونے لگتی تھیں۔ زینب کی روح تک کانپ جاتی پورے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا آنکھوں سے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگتے تھے اور پھر وہ پھوپھو کے قدموں میں سر رکھے اونچی آواز میں بڑبڑاتی۔

''مجھے ماریں، پیٹ لیں، گالیاں دیں۔ کوسنے دیں مگر اللہ کے واسطے پھوپھو مجھے بددعا نہ دیں'' وہ ان کے پیر دباتے ہوئے روتی رہتی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی رہتی۔

"میرے لیے تو پہلے ہی دُعا کرنے والے ہاتھ نہیں ہیں۔ میرے غم کو محسوس کر کے رونے والا تو پہلے ہی کوئی نہیں ہے پھوپھو! اک آپ ہی تو تھیں میرا آسرا میرا سہارا۔ اب آپ بھی اجنبی بن گئی ہیں" پھپھو خفگی سے پاؤں سمیٹ لیتی تھیں اور پھر اسے باہر نکل جانے کا اشارہ کرتیں۔

ان دنوں سحرش آپی کے دیور کی شادی تھی ان کے بازاروں کے چکر لگ رہے تھے کبھی کبھی مہوش کو بھی وہ ساتھ لے جاتی تھیں اکثر لنچ ٹائم میں سحرش آپی بمعہ نندوں کے آ دھمکتی تھیں پھر ان کے فرمائشی پروگرام شروع ہو جاتے۔ من پسند کھانا کھانے کے بعد آئس کریم اور پھر چائے کا دور چلتا۔ کچھ دیر ریسٹ کیا جاتا تھا پھر شاپنگ پر تبصرے، ہر چیز کو ایک دفعہ پھر کھول کر تنقیدی نگاہوں سے دیکھا جاتا۔ شام کی چائے پینے کے بعد سحرش آپی گھر روزانہ ہوتی تھیں اس دوران زینب کا تھکن سے انگ انگ ٹوٹنے لگتا تھا پھر نیچے آ کر پھوپھو کی بھی دیکھ بھال اسے ہی کرنا پڑتی۔ انہیں کھانا کھلا کر دوائیں دینا انتہائی مشکل امر تھا۔ کبھی کبھی پھوپھو کی طبیعت زیادہ بگڑتی تو وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگتی تھیں کمرے کی ہر چیز ان کے زیر عتاب آ جاتی تھی۔

اسے وہ دن آج بھی یاد تھے جب کبھی وہ اسکول سے واپسی پر بیگ اٹھائے مون لائٹ اسٹریٹ سے گزرتی تو قطار میں بنے انتہائی خوب صورت گھر، بڑے بڑے وسیع لان اور ان میں موجود ہریالی کو دیکھ کر اس کا دل بے اختیار ان حسین گھروں کو اندر سے دیکھنے کے لیے مچلنے لگتا تھا "اتنے خوب صورت گھروں میں رہنے والے خود نہ جانے کیسے ہوں گے۔ یقیناً وہ اپنی زندگی کے ہر پل کو انجوائے کرتے ہوں گے" وہ بے حد حیرانی سے سوچتی تھی۔ مگر اس وقت چودہ کنال پر بنے اس محل نما بنگلے میں موجود "زندگی" کو دیکھ کر اسے دنیا کی ہر شے سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔

وہ بھی اک عام سی لڑکی تھی۔ اس کی خواہشات بھی بالکل عام سی لڑکیوں کی طرح تھیں، پیارا سا گھر، گاڑی، روپیہ پیسہ اور چاہنے والا شوہر۔ اسے خوش قسمتی سے سب کچھ مل گیا تھا سوائے چاہنے والے شوہر کے۔

زید نے پچھلے دو دن سے فون نہیں کیا تھا ایسا تو کبھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ چھوٹی ممی سے بات کیے بغیر سو جائے۔ اسے اپنی ماں سے بھی زیادہ پھوپھو سے محبت تھی شاید اس لیے کہ وہ میشال کی ماں تھیں میشال اس کی محبوبہ، جسے وہ دیوانگی کی حد تک چاہتا تھا اس وقت بھی وہ زید کے فون کے بارے میں مسلسل سوچ رہی تھی جب مہرین آنٹی کے ہمراہ تیس بتیس سال کی کافی

اسمارٹ خاتون اندر داخل ہوئی۔

"یہ سلینہ ہے" مہرین آنٹی نے گویا تعارف کی رسم نبھائی تھی۔ زینب ششدر سی انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"آج سے ریان کی تمام ذمہ داری سلینہ کے سپرد ہے" انہوں نے اک جتانے والی مسکراہٹ لبوں پر سجالی تھی۔

"ریان کہاں ہے میڈم، میں ایک دفعہ ریان بابا سے مل لوں" سلینہ نے ریان کی ماں کو بغور دیکھتے ہوئے مہرین آنٹی سے کہا تھا۔

"ہاں، کیوں نہیں...... یہ اسٹڈی روم کے ساتھ فرسٹ بیڈ روم ریان کا ہی ہے۔ ابھی وہ اپنے کاٹ میں میٹھی نیند کے مزے لے رہا ہے۔ تم بس اسے دیکھ کر آ جاؤ" مہرین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سلینہ ٹک ٹک کرتی ریان کے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔

"آنٹی! میں نے کہا تھا نا کہ ریان کو گورنس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود اپنے بچے کی دیکھ بھال کر سکتی ہوں۔ پھر اس عورت کو بلانے کی کیا ضرورت تھی"

وہ چیخ کر بولی تھی۔ مہرین بے حد اطمینان سے مسکراتی رہیں۔

"میں جو بہتر سمجھتی ہوں وہ ہی کرتی بھی ہوں۔ کسی تیسرے کے مشورے کی مجھے ضرورت محسوس نہیں ہوتی" انہوں نے بڑے آرام کے ساتھ اسے "تیسرا" کہہ کر ریان کی ماں کے عہدے سے بھی معزول کر دیا تھا۔ زینب ان کے انداز پر سلگ اٹھی تھی۔

"آپ میرے بیٹے کو مجھ سے دور نہیں کر سکتیں"

"جب تم میرے بیٹے کو حقیقی مسرتوں سے دور کر سکتی ہو تو میں کیوں نہیں؟" مہرین نے چیلنج کرنے والی نگاہوں سے اسے گھورا تھا۔ زینب اس الزام پر گویا تڑپ اٹھی۔

"میں نے زید سے کہا ہے۔ وہ اپنے ساتھ ساتھ میری زندگی بھی جہنم بنا دے"

"تمہاری بات نہیں زید کی بات کر رہی ہوں میں، صرف اور صرف تمہاری وجہ سے میرا بیٹا نہ صرف اپنا گھر، اپنا شہر بلکہ یہ ملک بھی چھوڑ کر چلا گیا ہے ہماری زندگیوں میں زہر گھولنے والی تم ہو۔ ایسی سبز قدم عورت ہو کہ جب سے اس گھر میں آئی ہو ہماری خوشیوں کو نظر لگا دی ہے تم نے میشال مر گئی۔ سلمان اور رحمان ایکسیڈنٹ میں چل بسے۔ میرا بیٹا در بدر ہو گیا۔ صرف تمہاری وجہ سے وہ اس گھر سے دور چلا گیا ہے باپ کی قسم کا احساس نہ ہوتا تو وہ کب کا تمہیں طلاق دے چکا

ہوتا' زینب سن ہوتے دماغ کے ساتھ ان کا واویلا سنتی رہی۔اس کی ٹانگوں سے گویا جان نکل گی تھی۔

''میں نے میشال کو نہیں مارا''

''تم نے ہی میشال کو مارا ہے۔حاسد عورت' تمہاری وجہ سے ہی روبی آنٹی اس حالت کو پہنچی ہیں''

مہوش بھی شور کی آواز سن کر آ گئی تھی۔

''ہمارے حوصلے اور صبر کی داد دو کہ تمہیں اب تک ''برداشت'' کر رہے ہیں'' سرخی مائل ریشمی بالوں کو جھٹکتے ہوئے مہوش نے تنفر سے کہا۔مہرین آنٹی جا چکی تھیں۔ کچھ دیر بعد مہوش بھی چلی گئی۔جبکہ وہ چکراتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے صوفے پر ڈھے گی تھی۔

☆☆☆

''بی پی بے حد لو ہے۔ویک نیس بھی بہت ہے۔اپنی خوراک کا خود خیال رکھو۔ دوسروں کی طرف دیکھنا چھوڑ دو اور پلیز اگر اپنی اور بچے کی زندگی چاہتی ہو تو ذہنی پریشانیوں سے خود کو آزاد کر دو۔میں نے جو دوائیاں لکھ کر دی ہیں ان کو باقاعدگی سے استعمال کرو''

ڈاکٹر نائلہ نے مخصوص پروفیشنل لب و لہجے میں لیکچر دینے کے بعد ایک پرچہ اس کی طرف بڑھایا۔زینب گہری سانس خارج کرتے ہوئے کھڑی ہو گئی تھی۔پچھلے ڈیڑھ مہینے سے اس کی طبیعت بے حد بوجھل اور سر بھاری بھاری سا محسوس ہوتا تھا اپنے وجود میں ہونے والی تبدیلی کا اندازہ اسے ہو چکا تھا آج ڈاکٹر نائلہ نے تصدیق بھی کر دی تھی۔

وہ بے حد نڈھال سی گھر آئی تو ریان کو بے تحاشا روتے پایا۔بجلی کی سی تیزی سے وہ ریان کے بیڈروم کی طرف بڑھی تھی۔ریان کھلونوں کے بیچ میں بیٹھا ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے رو رہا تھا جبکہ سلینہ زبردستی اس کے منہ میں دودھ کی بوتل ٹھونس کر اسے خاموش کروانے کی کوششوں میں تھی۔ریان اسے دیکھتے ہی خاموش ہو گیا تھا۔

''میرا بچہ، میری جان کیوں رو رہے تھے'' زینب نے اسے گود میں لے کر چوما۔پھر فیڈر منہ سے لگایا تو نہ صرف دودھ پینے لگا تھا بلکہ کچھ دیر بعد سو بھی گیا تھا زینب نے اسے احتیاط سے کاٹ میں لٹایا اور پھر لائٹ آف کر کے باہر آ گئی۔سلینہ مزے سے ٹی وی میں گم ہو چکی تھی زینب اسے ڈانٹنے ڈپٹنے کا ارادہ ترک کر کے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

اسی شام اس کے ماموں اور ممانی گجرات سے آئے تھے اس سے ملنے کے لیے۔

عرصہ دراز بعد اپنوں کے چہرے دیکھ کر اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ممانی تو اس محل نما گھر کے پورچ میں کھڑی تین تین گاڑیوں اور زینب کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر ششدر رہ گئی تھیں۔

''زینب کی پھپھی کا تو بیٹا کوئی نہیں تھا پھر اس کی شادی کس کے ساتھ ہوئی ہے'' ممانی رضیہ نے دھیمی آواز میں شوہر سے پوچھا۔وہ خود قدرے مرعوب سے بیٹھے اردگرد کا جائزہ لے رہے تھے۔

''روبی کے جیٹھ کے بیٹے کے ساتھ سنا تھا رحمان نے زینب کی شادی کر دی ہے''

''زینب کے بخت تو بڑے بلند ہیں'' ممانی ماتھے پر آیا پسینہ صاف کرنے لگیں ''مولا تو بھی کیسے کیسے لوگوں کو نواز دیتا ہے۔نہ ماں نہ باپ نہ گھر بار اور پھر بھی اتنی اچھی جگہ شادی ہو گئی زینب کی'' رضیہ نے ہاتھ مسلتے ہوئے بے چینی سے کہا۔انہیں اپنی جلد بازی پر افسوس ہو رہا تھا نہ وہ زینب کو گیارہ سال پہلے گھر سے نکالتیں نہ روبی کا پتا اس کے ہاتھ میں پکڑاتیں اور نہ ہی زینب اسے خط لکھ کر بلوا لیتی۔

''روبی ہے کہاں؟'' ہر طرف چھائے سکوت کو محسوس کر کے رضیہ دبی آواز میں بولی تھیں۔

''سنا ہے بیٹی کے غم میں بیمار پڑ گئی ہے'' شوکت آہستگی سے بولے۔اسی پل زینب لوازمات سے بھری ٹرالی گھسیٹتے ہوئے آ گئی تھی۔

''تمہاری ساس نندیں کہاں ہیں'' رضیہ نے اشتیاق سے پوچھا تھا اس نے بے دلی کے ساتھ ان کی مصروفیات کے بارے میں بتایا۔

''زید کب آئے گا؟''

''ابھی تین ماہ پہلے ہی گئے ہیں''

''زینب بیٹا! تم سے ایک کام تھا'' رضیہ نے چائے کی خالی پیالی ٹرالی میں رکھی اور شوکت کے اشارے پر مٹھاس بھرے لہجے میں بولیں۔

''جی، ممانی کہیے''

''زینی بیٹا! دراصل ماجد نے باہر جانے کا پروگرام بنایا ہے کاغذات بھی تقریباً تیار ہیں، تھوڑے سے پیسے کم پڑ گئے تھے اگر تم دو لاکھ روپے ادھار دے دو تو ماجد کا کام بن سکتا ہے۔ لندن سیٹ ہو کر سب سے پہلے تمہارا قرض ہی اتارے گا۔انکار مت کرنا بیٹی، ہم بہت ہی آس امید لے کر آئے ہیں۔تمہارے پاس کون سا پیسوں کی کمی ہے۔لاکھ دو لاکھ تو امیر لوگوں کے

ہاتھوں کی میل ہوتے ہیں۔ صبح گئے شام کو اڑ آئے۔

''میری طرف سے معذرت، ممانی اتنی بڑی رقم میرے پاس نہیں ہے۔ ہوتی بھی تو کم از کم آپ کو نہ دیتی۔ ابھی تک میرے جسم پر ان زخموں کے نشان باقی ہیں اور ابھی تک ان زخموں سے خون رستا ہے لاکھ بھلاؤں بھی تو نہیں بھول سکتی میں کہ کس طرح آپ مجھے دو دو دن بھوکا رکھ کر مارتی پیٹتی تھیں''

ممانی کے آنے کا مقصد جان کر اس کے دل میں غصے کی لہر اٹھی تھی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ اتنے عرصے بعد ماموں کو یتیم بھانجی کی محبت کھینچ لائی ہے۔ ماموں اس کے سرخ چہرے پر پھیلے کرب کو دیکھ کر پشیمان سے بولے تھے۔

''زینی! ہم شرمندہ ہیں تم سے بیٹے''

''اگر آپ شرمندہ ہوتے تو کم از کم اس طرف کا رخ نہ کرتے'' وہ رکھائی سے بولتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔

''بہت کروالی بھانجی سے عزت افزائی۔ اب اٹھ بھی چکو'' رضیہ نے بھی غصیلے لہجے میں کہا اور دونوں آگے پیچھے بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

''اوہنہ بھانجی'' زینب کے تن من میں گویا آگ ہی لگ گئی تھی۔ جلتے کلستے اس نے برتن دھوئے، کھانا پکایا اور بیڈ روم میں آگئی رات کو سحرش آپی کے دیور کی مہندی کا فنکشن تھا اور ابھی اس نے مہوش اور مہرین آنٹی کے کپڑے بھی پریس کرنے تھے جبکہ تھکن اور تکلیف کے مارے اس کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا ماموں اور ممانی کی آمد نے اسے بے تحاشا اذیت سے دو چار کر دیا تھا۔ سلگتے ہوئے اس نے پلکیں موندیں تو دو گرم آنسو اس کے رخساروں پر لڑھک آئے۔

☆☆☆

اس نے ماموں کے ڈربا نما مکان میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کی پیدائش سے پہلے ہی اس کا باپ ایک ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہوگیا تھا۔ اماں بے چاری بیوگی کا غم لیے بھائی کی دہلیز پر آبیٹھی تھیں۔

اس نے ہوش سنبھالا تو اماں کو ہر وقت ممانی کی جھڑکیوں، کوسنوں کے زیر عتاب پایا۔ اماں سارا دن کاموں میں جتی رہتی، کھانا پکاتیں، ممانی کے بچوں کو نہلانے دھلانے کی ذمہ داری بھی اماں پر ہی تھی اس کے باوجود ممانی کبھی بھی اماں سے خوش نہیں ہو پائی تھیں۔

شوکت ماموں کے سات بچے تھے اور آٹھواں وجود اس کا تھا جو ممانی کو کسی تکلیف دہ بوجھ سے کم نہ لگتا تھا۔

وہ پانچ سال کی ہوئی تو اماں کو اسے اسکول بھیجنے کا خیال آیا۔ اماں نے دبے دبے لہجے میں ماموں سے ذکر کیا تو گھر میں اک فساد برپا ہوگیا۔ رضیہ ممانی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان ماں بیٹی کو انگلی سے پکڑ کر گھر سے باہر کر دیں یا پھر ان دونوں کی گردنیں مروڑ دیں۔ ان دنوں ممانی کی بہن سرگودھا سے آئی ہوئی تھیں۔ ان تک اس معرکے کی خبر پہنچی تو وہ بھی اس کار خیر میں شریک ہوگئیں۔

''اے آسیہ! تم اس بات پر ہی شکر ادا کیا کرو کہ دو وقت کی روٹی مل جاتی ہے۔ تمہیں کھلائیں پلائیں یا تمہاری چھوکری کی پڑھائیوں پر خرچ کریں۔

تمہارے تو دیدوں کی شرم ہی ختم ہوگئی ہے۔ ذرا بھائی کا خیال نہیں کہ وہ اپنے کنبے کے ساتھ تم دونوں کا پیٹ کتنی مشکل سے بھر رہا ہے''

''دو وقت کی روٹی پیٹ بھر کے مل جاتی ہے اسی بات پہ شکر ادا کرو'' ماجد سے چھوٹی نمرہ نے املی سے لتھڑی چپ چپ کرتی انگلیاں چاٹ کر اس کے بازو میں چٹکی بھری۔ درد کی شدت سے زینب کی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر آئیں۔

''یہ لے ندیدی کھالے املی'' نمرہ نے اسے روتا دیکھ کر خالی ریپر اس کی طرف پھینکا۔ اسی پل اماں کی نظریں اس کے سسکاریاں بھرتے لرزتے کانپتے وجود پر پڑیں۔ اماں برتن دھونا چھوڑ کر ان کی طرف آگئیں۔

ممانی اور ان کی بہن بکتے جھکتے ایک مرتبہ پھر ایئر کولر والے کمرے میں گھس گئی تھیں۔

''تو نے مارا ہے زینب کو'' اماں دبی آواز میں غرائیں''

''نہیں، مارا تو نہیں میں نے بس بازو میں چٹکی بھری ہے'' نمرہ ڈھٹائی سے قہقہہ لگا کر بولی تھی۔ اماں بے بسی کے احساس سے لب بھینچ کر رہ گئیں۔

''اماں! کل ماجد نے بھی مجھے مارا تھا'' ماں کی محبت اور توجہ پا کر زینب نے روتے ہوئے شکایت لگائی تو اماں اسے پچکارتے ہوئے بولیں۔

''ابھی آتا ہے تو ان دونوں کی پھینٹی لگاتی ہوں میں''

''پھپھو! آپ مجھے اور ماجد کو ماریں گی'' سدا کی جھگڑالو نمرہ نے چیخ کر کہا تھا۔

''ہمارا ہی کھاتے ہو اور ہمیں ہی آنکھیں بھی دکھاتے ہو'' نمرہ اب ماں کے الفاظ دہرانے لگی تھی نمرہ اور ماجد بڑے تھے۔ ہر وقت ماں کو پھپھی کے ساتھ جھگڑتے اور طعنے دیتے دیکھ کر وہ دونوں بھی ماں کی زبان بولنے لگے تھے۔ اگر زینب گلی میں کھیلنے کے لیے نکل جاتی تو یہ دونوں بہن بھائی نہ صرف اسے مارتے پیٹتے بلکہ دھمکیاں بھی دیتے کہ گھر جا کر کسی کو بتانا نہیں۔ وہ لاکھ خواہش کے بھی اماں کو کچھ نہیں بتاتی تھی مگر اس وقت نمرہ کی چیخ وپکار سن کر وہ بے حد خوفزدہ ہو کر اماں کی گود میں جا گھسی تھی۔ شور ہنگامے کی آواز نے ایک مرتبہ پھر ممانی کو ٹھنڈے ٹھار کمرے سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ نمرہ کے آنسوے دیکھ کر ممانی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ آسیہ کی گود میں چھپی زینب کی کمر پر دو تین دھموکے جڑ دیئے۔ نمرہ کو ساتھ لپٹایا پچکارا اور کمرے میں لے کر چلی گئیں۔ جاتے جاتے اماں کو نیا حکم نامہ بھی تھما دیا۔

''دوپہر کی ہانڈی روٹی بھی کر لو، بھائی کو دکان پر کھانا بھجوا کر ہماری روٹی اندر بھیج دینا اور ہاں پہلے نمرے کے لیے فالسے کا شربت لے آؤ'' اماں سر ہلاتے ہوئے کچن میں گھس گئی تھیں جبکہ اس کے ہاتھ میں ایک بسکٹ پکڑا کر گویا انہوں نے اسے خاموش رہنے اور مصروف رکھنے کا انتظام کیا تھا اور وہ بسکٹ کو دانتوں سے کترتے ہوئے جامن کے پیڑ کے نیچے رکھی چار پائی پر بیٹھی کھیلنے میں مصروف ہو گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد جامن کی لچکیلی پھل سے لدی شاخوں نے جھوم جھوم کر اسے لوری دے کر سلا دیا تھا۔

شوکت ماموں کی مہربانی سے اماں کی واحد خواہش پوری ہو گئی تھی دوسری صبح وہ اسے ساتھ لیے خوشی خوشی گورنمنٹ اسکول میں چلی گئیں۔ زینب اس بات پر خوش تھی کہ چلو چند گھنٹے ممانی کی خونخوار نظروں سے محفوظ رہ سکے گی۔

وقت اسی رفتار سے گزر رہا تھا آسیہ کی آنکھوں میں زینب کو بستہ اٹھائے اسکول جاتے دیکھ کر چمک بڑھ سی جاتی تھی آسیہ کو اس بات کا قلق تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی کوئی خواہش نہیں پوری کر سکتیں۔

اسکول جاتے ہوئے جب رضیہ اپنے سارے بچوں کو پانچ پانچ روپے جیب خرچ دیتی تو اس لمحے آسیہ کے آنسو دل پر گرنے لگتے تھے رات کی باسی روٹی کھا کر زینب اسکول جاتی تھی اور پھر دن بھر بھوکا پیاسا رہنے کے بعد بھی پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہ ہوتی۔ سب کا بچا کھچا ان دونوں کو ملتا تھا۔

زینب نے ساتویں کا امتحان پاس کیا تو آسیہ ایک دم ہی بیمار پڑ گئیں محلے کے حکیم سے دوا دارو لیتے رہے جب افاقہ نہ ہوا تو ماموں اماں کو سول ہسپتال لے گئے۔ پورے سات مہینے بعد زینب تنہا بیٹھی اپنی ماں کو رو رہی تھی۔ رضیہ ممانی اس لمحے بھی زبان کو لگام نہ دے سکیں۔

''ارے یہ دونوں بلائیں تو میری جان لے کر ہی دم لیں گی۔ پہلے بیماری پر اتنا خرچ ہو گیا اور اب مرنے پر''

اماں کے جانے کے بعد سچ مچ کڑی دھوپ کا گمان ہوا تھا پہلے اماں اس کی ڈھال بن جاتی تھیں اب وہ تنہا ہی ممانی کے رحم و کرم پر تھی۔

محرومیاں، دکھ اور احساس تنہائی لیے وہ بہت جلد شعور کی منزلیں طے کر گئی تھی۔ اماں کے بعد سارے گھر کا کام اس کے نازک کندھوں پر آ پڑا تھا صبح اٹھ کر وہ ناشتا بناتی، برتن دھوتی اور صحن میں جھاڑو لگا کر سب سے آخر میں دو چار نوالے زہر مار کر کے اسکول کے لیے روانہ ہوتی۔

اس نے اس چھت کے نیچے رہنے کے لیے ممانی کی ہر بات مانی تھی ان کی مار جھڑکیاں کوسنے سب برداشت کیے کبھی مڑ کر جواب دینے کی کوشش نہیں کی تھی مگر ان کے لاکھ جھگڑنے پر بھی اس نے اسکول جانا ترک نہیں کیا تھا وہ اپنی ماں کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے دن رات محنت کر رہی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے میٹرک کا امتحان اعزازی نمبروں سے پاس کر لیا اور نمرہ اور ماجد دونوں ہی تیسری مرتبہ فیل ہو گئے ممانی کے سینے پر ایک مرتبہ پھر سانپ لوٹ گئے تھے۔

انہی دنوں زینب کو محسوس ہوا تھا کہ ماجد کے انداز بہت بدلے بدلے سے ہیں۔ آتے جاتے فقرے اچھالنا، گنگنانا۔ گندی نگاہوں سے کئی کئی لمحے ڈھٹائی کے ساتھ تکتے رہنا۔ زینب اس صورتحال سے سخت پریشان تھی۔

اس دن بھی زینب کچن میں آٹا گوندھ رہی تھی جب ماجد جھومتا گنگناتا کچن میں آ گیا تھا زینب کے ہاتھ تیز تیز چلنے لگے وہ جلد از جلد کچن میں سے نکلنا چاہتی تھی ماجد چائے بنا رہا تھا اور ساتھ ساتھ اسے دیکھنے کا شغل بھی جاری تھا چائے بنا کر اس نے مگ لکڑی کے میز پر رکھا اور پھر اس کے قریب گزرتے ہوئے اس نے زینب کی کمر پر چٹکی بھری۔ زینب چیخ کر پلٹی تھی اور پھر بے ساختہ ہی اس کا ہاتھ اٹھ گیا۔ ماجد تو ششدر تھا ہی زینب بھی کم حیران نہیں تھی۔ وہ اپنی ہمت اور جرأت کو سراہے بغیر نہ رہ سکی۔ ماجد آگ بگولا اسے نگاہوں سے بھسم کرتا دفعان ہو گیا تھا۔

زینب خوفزدہ سی ایک مرتبہ پھر آٹا گوندھنے میں مصروف ہو گئی۔

اگلے چند دن بغیر کسی ہنگامے کے گزر گئے تھے۔ ماجد نے یقیناً ممانی کو کچھ نہیں بتایا تھا زینب قدرے پرسکون سی ہو گئی۔ ان دنوں ماجد گھر بھی کم کم آ رہا تھا زیادہ تر اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ گلیوں، بازاروں میں گھومتا رہتا۔ ماموں کے اصرار، غصے کے باوجود وہ ان کی دکان پر نہیں بیٹھتا تھا۔

نمرہ بھی ان دنوں نہ جانے کن ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ صبح ہی صبح تیار ہو کر نہ جانے کون سی ایسی سہیلی تھی جس سے روزانہ ملنے کے لیے وہ جاتی تھی اور پھر واپسی شام سے پہلے نہ ہوتی۔ ممانی نے اپنی اولاد کو خوب ہی چھوٹ دے رکھی تھی کبھی روکا ٹوکا نہیں بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے بچے بگڑ کر رہ گئے تھے ماں، باپ کے سامنے زبان چلاتے۔ آپس میں لڑتے جھگڑتے۔ بدزبانی اور بدتہذیبی انہیں وراثت میں ملی تھی ایک دوسرے کا احترام کرنا انہوں نے سیکھا ہی نہیں تھا بلکہ سکھایا ہی نہیں گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ماجد چھوٹے بہن بھائیوں کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا تھا۔ جواباً بچے بھی اسے گالیاں دیتے۔ صبح سے لے کر رات گئے تک اک تکلیف دہ شور اس گھر میں سے سنائی دیتا تھا یہاں تک کہ پڑوسی بھی تنگ تھے ان لوگوں کے جاہلانہ پن سے۔

ممانی کو ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ کون ان کے بارے میں کس انداز سے سوچتا ہے محلے میں ممانی کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ ممانی کی لگائی بجھائی والی عادت جھگڑالو فطرت کی وجہ سے ہر کوئی ان سے دور دور بھاگتا۔

ممانی میکے گئی تھیں گڈو کو ساتھ لے کر ایسے ٹور زان کے مہینے میں کوئی دس مرتبہ تو ضرور ہی لگتے تھے گھومنا پھرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا ممانی چونکہ میکے گئی تھی لہٰذا ہر کوئی آزاد تھا۔

توقیر اور حسن بیٹ اٹھائے کرکٹ کھیلنے چلے گئے تھے۔ سونیا اور نادیہ اپنی سہیلی کے گھر گڑیا کی شادی کرنے چلی گئیں۔ ماجد رات بھر سے گھر آیا ہی نہیں تھا۔ ماموں صبح صبح دکان پر چلے گئے تھے بس وہ اور نمرہ ہی گھر میں موجود تھیں نمرہ ڈیک لگائے گانے سننے میں مصروف تھی جبکہ زینب معمول کے کاموں میں جتی ہوئی تھی ڈیک کی تیز آواز کے باوجود زینب کو محسوس ہوا تھا کہ نمرہ کسی کے ساتھ باتیں کر رہی ہے۔ پہلے وہ وہم سمجھ کر جھٹلاتی رہی تھی مگر پھر کچھ سوچ کر وہ دبے قدم اٹھاتی نمرہ کے کمرے تک آئی دروازے سے کان لگایا تو نمرہ کے بولنے کی واضح آواز

آئی۔ فون تو ان کے گھر تھا نہیں۔ زینب نے کچھ تجسس سے مجبور ہو کر دروازے کی جھری میں سے جھانکا تو اس کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھیل گئیں۔ نمرہ موبائل کان سے لگائے ہونٹوں پر مسکان لیے کسی اور ہی جہاں میں گم تھی۔ زینب انہی قدموں پر واپس لوٹ آئی۔

ان دنوں موبائل فون نئے نئے چلے تھے ہر کوئی انہیں افورڈ نہیں کر سکتا تھا اور یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ ماموں نمرہ کو موبائل لے کر دیتے۔ اس کی چھٹی حس جس بات کی طرف اشارہ کر رہی تھی دل و دماغ قبول کرنے سے انکاری تھے وہ خود صاف شفاف سوچوں کی مالک سادہ طبیعت کی لڑکی تھی اور ہر ایک کو اپنے جیسا ہی سمجھتی بھی تھی کچن میں آ کر اس سے کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہیں ہو پایا تھا۔

''کیا مجھے ممانی کو بتانا چاہیے؟'' وہ گہری سوچوں میں گم سبزی کاٹ رہی تھی جب نمرہ ٹک ٹک کرتی باورچی خانے میں چلی آئی۔

''سنو! ابھی کچھ دیر تک میری سہیلی آ رہی ہے میں اسے بیٹھک میں بٹھاؤں گی۔ تم ذرا چائے وغیرہ بنا دینا'' نمرہ کا انداز بھرپور لجاجت لیے ہوئے تھا ایسا تو کبھی ہوتا نہیں تھا کہ نمرہ لب و لہجے میں نرمی بھر کر اس سے مخاطب ہو اس گھر کے تمام افراد اسے نوکروں کا درجہ دیتے تھے۔ ملازمہ سمجھ کر ہی مخاطب بھی کرتے تھے۔ زینب اس کے انداز دیکھ کر کھٹک گئی۔

''تم سہیلی کو بڑے کمرے میں بٹھا لینا۔ وہ صاف ستھرا بھی ہے اور ٹھنڈا بھی ہے۔ ایئر کولر بھی لگا ہوا ہے۔ جبکہ بیٹھک کا تو پنکھا بھی مر مر کر ہی چلتا ہے''

''بات تو تمہاری درست ہے مگر......'' نمرہ نے لاشعوری طور پر اس کی بات سے اتفاق کر لیا تھا۔ اب تو زینب مزید پریشان ہو اٹھی تھی۔ نہ جانے نمرہ نے کسے گھر بلایا تھا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد نمرہ کی مہمان آ گئی تھی۔ نمرہ نے اسے بیٹھک میں ہی بٹھایا تھا پہلے وہ خود ہی کولڈ ڈرنک لے کر چلی گئی تھی۔ اب زینب چائے بنا کر نمرہ کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ نمرہ اسے اپنی سہیلی سے ملوانا نہیں چاہتی تھی اور زینب کو بھی اس سے ملنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اسی لیے وہ چائے بنا کر الگنی پر سے کپڑے اتارنے کے لیے چھت پر چلی آئی۔

لوہے کی ریلنگ پر سے نیچے جھانکتے ہوئے اس کی نظریں لش لش کرتی سرخ آلٹو پر پڑیں۔ وہ بے حد حیران ہوتی نیچے آئی تو چائے جوں کی توں پڑی تھی۔ کچھ سوچ کر زینب بیرونی دروازے تک آئی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد بیٹھک میں سے ایک درمیانی عمر کا مرد گلی میں کھلنے

والے دروازے سے نکلا تھا۔زینب حیران پریشان سی الٹے قدموں واپس مڑی اور برآمدے میں رکھے تخت پر بیٹھ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد نمرہ ہنستی مسکراتی بیٹھک سے نمودار ہوئی اور اسے تخت پر بیٹھا دیکھ کر قدرے ٹھٹکی اور پھر اسی لاپرواہی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگی تھی۔

''نمرہ! یہ آدمی کون تھا؟'' زینب نے سرد لہجے میں پوچھا تھا۔نمرہ کی پیشانی پر سلوٹ نمودار ہوگئی۔

''تم کیوں پوچھ رہی ہو''

''ایسے ہی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے'' زینب مسکرائی۔

''وہ جو بھی تھا تمہیں اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے۔اپنے کام سے کام رکھا کرو'' نمرہ نے غصے سے کہا تھا۔

''میں ممانی کو بتادوں گی''

''شوق سے بتانا''

''نمرہ! تمہیں اسے گھر نہیں بلانا چاہئے تھا'' نمرہ کے لہجے میں چھپی بغاوت کو محسوس کر کے زینب نرمی سے بولی۔

''تم اپنی زبان بند رکھو...... مجھے نصیحتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے''

''تمہیں ماموں کی عزت کا احساس نہیں ہے''

''نہیں......'' نمرہ بے نیازی سے بولی تھی اور پھر تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

ممانی تین دن بعد آئی تھیں۔زینب نے کچھ ڈرتے ڈرتے مبہم انداز میں انہیں بتانے کی کوشش کی تو ممانی نے اسے جھڑک کر خاموش کروادیا۔

اسی طرح بہت سے دن گزر گئے نمرہ اب سب کے سامنے بن سنور کر پرس جھلاتی نکل جایا کرتی تھی اس کے کپڑے بہترین سے بہترین سلنے لگے تھے اسٹائلش جوتے، قیمتی جیولری اور پرس میں ڈھیروں پیسے۔

ممانی جانتے بوجھتے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھیں ماموں سدا کے لاپرواہ اس گھر میں ان کی بیوہ بہن اور یتیم بھانجی کے ساتھ کیڑے مکوڑوں سے بھی بدتر سلوک ہوتا تھا وہ تب بھی بیوی کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات نہیں کر سکتے تھے اب تو پھر ممانی کا ہی مکمل راج تھا۔ماموں کی حیثیت

فالتو پرانے سامان سے زیادہ نہیں تھی۔

پھر ایک دن عجیب واقع ہوگیا۔نمرہ صبح کی گئی رات تین بجے تک نہ لوٹی۔پہلی مرتبہ ممانی کے چہرے پر فکر اور پریشانی کے سائے لہرائے۔رات بھر وہ جاگتی رہیں اور بار بار گھڑی کی طرف دیکھتیں۔صبح سات بجے کے قریب نمرہ صاحبہ تشریف لے آئی تھیں۔آتے ہی ممانی کے تفتیشی انداز کو دیکھ کر اس کا پارہ چڑھ گیا۔

''نہ ساری زندگی آپ خود خوش رہی ہیں نہ ہمیں رہنے دیجیے گا'' وہ چیخ چیخ کر بول رہی تھی۔

''چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے ترس ترس کر زندگی گزار دی ہے۔کیا دیا ہے آپ نے ہمیں نہ اچھا کھلا سکی ہیں نہ اچھا پہنا سکی ہیں'' زینب ششدر سی اس کے منہ سے نکلنے والے شعلے جیسے لفظوں کو سنتی رہی۔

''یہ چوزوں کے ڈربے جتنا گھر، جہاں سانس لینا بھی دشوار ہے۔ابا کی معمولی سی دکان، یہ غربت...... تنگ آ چکی ہوں میں اس زندگی سے اگر کوئی روزن، کوئی دریچہ کھلا ہے، تھوڑی سی تازہ ہوا آ رہی ہے تو کیوں نہیں آپ لوگ ہمیں کھل کر سانس لینے دیتے'' نمرہ نے پاؤں سے سینڈل اتار کر سامنے والی دیوار پر دے ماری۔جیولری نوچ کھسوٹ کر اتاری اور خود تخت پر ڈھے کر لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی۔

''بہت کر لی بکواس اب خاموش ہو جا'' ممانی نے غصیلے لہجے میں کہا تھا۔

''کیوں خاموش ہو جاؤں۔ہم آپ کی رعایا نہیں اولاد ہیں۔ایک زینب کافی ہے آپ کے ہر حکم پر سر جھکانے والی۔مجھ سے ایسی امید مت رکھیے گا'' نمرہ نے دوبدو جواب دیا۔

''نمرہ! میں تیری زبان کاٹ دوں گی'' ممانی بلبلا اٹھی تھیں۔نمرہ نے تنفر سے سر جھٹکا۔

''آپ سوائے چیخنے چلانے کے گالیاں، کوسنے دینے کے کچھ نہیں کر سکتیں۔

''آ جائے تیرا باپ، بتاتی ہوں اسے تیرے سارے کرتوت'' رضیہ بل کھا کر بولی تھیں۔نمرہ کی کتر کتر چلتی زبان اور سرکش لب و لہجے نے انہیں آگ بگولہ کر دیا تھا۔

''وہ کیا کر لیں گے مجھے گولی سے اڑائیں گے اونہہ...... میرے باپ جیسے کمزور مرد کچھ نہیں کر سکتے سوائے بیویوں کے سامنے منمنانے کے''

''ابھی نسرین آپا کو بلا کر تیری بات پکی کرواتی ہوں'' دو دن کے اندر اندر تجھے اس

جہنم سے رخصت کرتی ہوں میں'' اب کے رضیہ نے آواز نرم کرلی تھی۔

''آپ اتنا تردد نہ کریں امی، یہ کام میں خود کر چکی ہوں'' نمرہ نے گویا رضیہ ممانی کے ساتھ ساتھ زینب کے سر پر بھی دھماکہ کیا تھا۔

''کیا بک رہی ہے تو نمرہ؟'' ممانی صدمے سے نڈھال آواز میں بولی تھیں۔

''وہ ہی جو نہ صرف آپ سن چکی ہیں بلکہ سمجھ بھی چکی ہیں۔ میں نے جمال کے ساتھ شادی کرلی ہے''

نمرہ نے چبا چبا کر کہا تھا ممانی سینہ کوبی کرنے لگیں''

''تیرے سر پر خاک پڑے، منہ میں کیڑے پڑیں، یہ کیا ظلم کر بیٹھی ہے خاندان والوں کو کیا منہ دکھاؤں گی میں۔ لوگ باتیں کریں گے۔ انگلیاں اٹھائیں گے ہم پر، میں کس کس کی زبان روکوں گی''

''مجھے نفرت ہے آپ کی ان جاہلانہ حرکتوں سے

نمرہ زہر خند ہوئی تھی ماں کے واویلا کرنے رونے پیٹنے سے اسے سخت چڑ تھی۔

''جا، دفع ہو جا میری نظروں کے سامنے سے''

''چلی جاؤں گی اتنی جلدی بھی کیا ہے'' نمرہ کی ڈھٹائی عروج پر تھی۔ رضیہ بیگم کی بیٹی تھی اتنی آسانی سے کیسے جھکتی۔

''تو کیا کھڑی تماشا دیکھ رہی ہے'' بیٹی پر بس نہ چلا تو ممانی کچن کے دروازے میں کھڑی زینب پر الٹ پڑتیں۔ وہ سرعت سے پیچھے ہٹ گئی۔

دو دن مزید خاموشی کے ساتھ سرک گئے اس دن زینب بڑے کمرے کی صفائی کر رہی تھی جب ممانی کی سرگوشیاں سن کر ٹھٹک گئی۔

''تو اس خبیث سے طلاق لے لے نمرہ، کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ بات ابھی تک کھلی نہیں ہے میں نسرین آپا سے بات کرتی ہوں''

''میں جمال سے طلاق نہیں لوں گی'' نمرہ مضبوط لہجے میں بولی تھی۔

''تو نہیں جانتی بیٹا کہ جمال کتنا بدمعاش آدمی ہے۔ چھ سال دوبئی میں رہ کر پیسہ کمایا ہے اس نے اب اسی پیسے کے بل بوتے پر اکڑتا پھرتا ہے نہ جانے کن کن لوگوں کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا ہے کون سا دھندا کرتا ہے اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے''

رضیہ ممانی نے نمرہ کو پچکارتے ہوئے کہا تھا۔

''مجھے اس کے کام دھندوں سے کیا غرض ہے۔ اتنی بڑی کوٹھی ہے جمال کی نوکر چاکر، گاڑیاں، روپیہ پیسہ، میں اتنی احمق نہیں ہوں کہ ہاتھ آئی آسائشات بھری زندگی کو ٹھوکر ماردوں''

''تم بہت پچھتاؤ گی نمرہ'' رضیہ ممانی نے دونوں ہاتھ مسلتے ہوئے کہا تھا ان کے چہرے پر تفکر کے سائے پھیل چکے تھے۔ زینب سے مزید کچھ نہ سنا گیا۔ اس رات ممانی بہت پریشان رہی تھیں۔ بار بار اٹھ کر صحن میں ٹہلتیں۔ اگلی صبح چادر لے کر نہ جانے کہاں نکل گئی تھیں۔

ممانی کے جانے کے بعد نمرہ بھی چلی گئی۔

زینب گھر میں تنہا تھی۔ ان دنوں عجیب سی بے قراری دل کو گھیرے ہوئے تھی۔ پتا گرتا تو وہ چونک سی اٹھتی۔ وہ جامن کے گھنے درخت کے نیچے پڑی چھلنگا سی چار پائی پر لیٹی گہری سوچوں میں گم تھی جب اچانک دروازہ بجنے کی آواز آئی۔ اس نے ہڑبڑا کر پیروں میں سلیپر اڑسے اور دروازے تک آئی۔ دوسری طرف ماجد کھڑا تھا۔

اتنے دنوں بعد اس کی گھر واپسی، وہ بھی اس وقت جب کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ زینب کو اندیشوں میں مبتلا کر گیا۔ وہ دروازہ کھولنا نہیں چاہتی تھی مگر یہ گھر ماجد کا تھا۔ اس نے مجبوراً کنڈی گرادی اور خود تیزی سے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ گھر پر چھائے سناٹے کو ماجد نے چند لمحوں میں ہی محسوس کرلیا تھا اسی لیے زیرلب مسکراتا، انتقام کی چمک آنکھوں میں لیے باورچی خانے کی طرف آ گیا۔

''شہزادی! کن غیر ضروری کاموں میں مصروف ہو۔ تمہارا عاشق صادق اتنے دنوں بعد گھر آیا ہے کوئی چائے پانی تو پوچھو، کوئی روٹی شوٹی کا بندوبست کرو''

اس کے گھٹیا لب و لہجے میں چھپی ہوس نے زینب کے دل کو ہلا کر رکھ دیا تھا اس نے تیزی سے کھانے کی ٹرے اس کی طرف بڑھا دی جسے ماجد نے تھاما نہیں تھا۔ وہ ایک ٹک اس کے معصوم چہرے، صاف شفاف براؤن آنکھوں اور گلابی گالوں کو دیکھتا رہا۔ زینب اس کے قریب سے سمٹ کر گزرنے لگی تھی جب ماجد نے اس کا گداز بازو تھام لیا۔

''چھوڑو...... مجھے'' زینب نے چلا کر کہا تھا۔

''بڑی اکڑ ہے تم میں اس دن تھپڑ کیوں مارا تھا۔ بتاؤ ذرا'' ماجد نے جھٹکا دے کر اسے اپنے قریب کرنے کی کوشش کی تھی۔ زینب نے پوری قوت سے اپنا بازو اس کے ہاتھ سے چھڑوایا۔

"تمہیں اس تھپڑ کا مزہ چکھاتا ہوں" وہ زینب کو گھسیٹتا ہوا بڑے کمرے کی طرف لے آیا۔

"ماجد بھائی! چھوڑ دو مجھے۔ میں تم سے معافی مانگ لیتی ہوں۔ اللہ کے لیے ماجد بھائی مجھے چھوڑ دو" خوف ودہشت سے زینب کی آنکھیں پھٹ رہی تھیں۔ وہ بمشکل لرزیدہ آواز میں بولی تھی۔ ماجد خطرناک ارادوں سے اس کی طرف بڑھا تھا۔ زینب نے دائیں بائیں نظریں دوڑائیں مگر کوئی بھی ایسی چیز دکھائی نہ دی تھی۔ جسے اٹھا کر وہ اس شیطان کے سر پر دے مارتی۔

اسی پل اتنی زور سے دروازہ کھٹکھٹایا گیا کہ ماجد نے ہڑبڑا کر باہر کی طرف دوڑ لگادی تھی۔ زینب گرتی پڑتی باہر آئی تو ماجد نہ جانے کیا کیا ممانی کے کانوں میں پھونک رہا تھا تھوڑی ہی دیر بعد ممانی نے چھڑی اٹھا کر اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ لاتوں سے ہاتھوں سے چھڑی سے مار مار کر جب وہ نڈھال ہوگئی تھیں تب ہی انہوں نے اسے چھوڑا۔

"میں اس بدذات کو اک پل کے لیے بھی گھر میں نہ رکھوں" انہوں نے چلا چلا کر کہا اور پھر نہ جانے کہاں سے اس کی اکلوتی پھپھی کا اتا پتا ڈھونڈ لائیں اور دو دن کے اندر اندر اسے یہاں سے چلے جانے کا حکم سنا دیا۔ ممانی نے نمرہ کا سارا غصہ اس پر اتار ڈالا تھا اور وہ اتنی آزردہ، اتنی غمگین تھی کہ بغیر سوچے سمجھے اس نے پھپھو کو خط لکھ ڈالا تھا اور صرف دو دن بعد اس کی اکلوتی پھپھو، روبی اپنی بیٹی کے ہمراہ لمبی سی گاڑی میں اسے لینے کے لیے آگئی تھیں۔

شوکت ماموں کا چھوٹا سا مکان ان کے وجود سے پھوٹتی روشنیوں سے گویا جگمگا اٹھا تھا۔

اور جب وہ بے حد مایوس، پریشان اور ٹوٹی بکھری سی زید ولا میں داخل ہوئی تو سب سے پہلے اس کی نگاہ زید سلمان پر پڑی تھی، اس کا دل اک پل کے لیے دھڑکنا بھول گیا تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں اس نے "محبت" کی تھی اس کا دل پہلی نظر کی محبت کا شکار ہو گیا تھا اور جب وہ سرخ پتھروں کی روش پر چل رہی تھی۔ تب پہلی مرتبہ زینب شفیق نے ان پندرہ سالوں میں بہت ہی شدت کے ساتھ کسی چیز کی طلب کی تھی اس نے اللہ سے زید سلمان کا ساتھ مانگا تھا۔

☆☆☆

ریان کے رونے کی آواز سن کر وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔ بکھرے بال کیچر میں سمیٹ کر وہ سرعت سے بیڈروم کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ اپنی گزشتہ زندگی کو سوچتے سوچتے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی گھڑی پر نگاہ اٹھی تو اس نے سر پر ہاتھ مار کر مہرین آنٹی کے بیڈروم کی طرف رخ کیا۔

مہوش کے کپڑے پریس کر کے ہینگ کیے صد شکر کہ وہ دونوں ابھی تک گھر نہیں آئی تھی اپنے کپڑے نکالنے کا ارادہ ترک کر کے وہ نیچے آگئی تھی پھوپھو کے کمرے میں جھانکا مگر وہ کہیں بھی دکھائی نہ دی تھیں زینب تیز قدموں سے چلتی ہوئی لان میں آگئی پھولوں کے کنج کے پاس نرم وملائم گھاس پر بیٹھی وہ نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔

"پھوپھو! کیا کر رہی ہیں۔ اٹھیں آپ کی دوائی کا وقت ہو گیا"

"میں یہ پھول چن رہی ہوں میثال کے لیے" انہوں نے مصروف سے انداز میں جواب دیا تھا۔

"کیا کریں گی ان پھولوں کا آپ، شاخوں پر کتنے اچھے لگ رہے تھے آپ نے سارے ہی توڑ لیے ہیں"

زینب ان کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی انہوں نے گردن گھما کر قدرے ناراضی بھرے انداز میں اسے گھورا۔

"میثال کے لیے گجرا بناؤں گی اسے گجرے بہت پسند ہیں" زینب نے دل میں اٹھتی ٹیسیں دباتے ہوئے پھولوں کی طرف دیکھا وہ دوپٹے میں پھولوں کی پتیاں توڑ توڑ کر رکھ رہی تھیں پھر انہوں نے پاس رکھے دھاگے اور سوئی کو اٹھا لیا وہ گجرے بنانے کا پورا انتظام کیے بیٹھی تھیں۔

پھوپھو! ادھر لائیں میں گجرا بناتی ہوں آپ کے ہاتھ میں سوئی چبھ جائے گی۔ زینب نے سوئی، دھاگا تھامنا چاہا تھا انہوں نے سب چیزیں فوراً ہی اپنی گود میں چھپائیں۔

"نہیں، تم جاؤ میں خود گجرا بناؤں گی اپنی بیٹی کے لیے"

"اچھا، ٹھیک ہے پہلے آپ دوا کھا لیں پھر ہم دونوں مل کر گجرے بنائیں گے"

"ہاں! تم ایسا کرو ادھر ہی دوا لے آؤ" زینب بے دلی سے اٹھ کر اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی پھر ان کے لیے دوا اور دودھ کا گلاس لے آئی بہت ہی مشکل سے انہیں بہلا پھسلا کر اندر لانے میں کامیاب ہوئی تھی۔ پھپھو کو سلانے کے بعد اس نے بیڈروم میں بکھری تمام چیزیں سمیٹیں۔ ان کی دوائیاں ترتیب سے رکھیں اور پھر دروازہ آہستگی [illegible] کے اوپر آگئی کچھ ہی دیر بعد مہوش اور مہرین آنٹی بھی آگئی [illegible]۔

زینب لباس بدل کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ لپ اسٹک اٹھاتے ہوئے ایک لمحے کو اس کا ہاتھ کپکپا گیا تھا۔ آج وہ پورے تین ساڑھے تین سال بعد اہتمام کے ساتھ تیار

ہو رہی تھی۔ اس کے دل میں ڈھیروں آزردگی نے پنجے گاڑھ لیے۔ دل چاہ رہا تھا کہ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی تمام چیزیں توڑ پھوڑ ڈالے۔ اس نے لپ اسٹک بے دلی سے واپس رکھ دی اور ہیئر برش اٹھا کر بال سنوارے۔ پرس لیا اور باہر آ گئی کچھ ہی دیر بعد مہرین آنٹی نفیس سی ساڑھی زیب تن کیے لاؤنج میں آئیں تو اسے اتنے سادہ حلیے میں بیٹھا دیکھ کر انہیں کافی حیرت ہوئی۔

’’تم نہیں جاؤ گی‘‘

’’جانے کے لیے ہی تو تیار بیٹھی ہوں‘‘ اس نے کچھ چونک کر ساس کی طرف دیکھا تھا۔

’’اس حلیے میں جاؤ گی تم‘‘ مہرین آنٹی کو گویا شاک پہنچا تھا پھر قدرے روکھے لہجے میں بولیں۔

’’جا کر کوئی اور ڈریس پہنو اور میک اپ وغیرہ بھی کر کے آؤ‘‘

’’میں ان کپڑوں میں زیادہ ایزی رہوں گی ریان بھی تو ساتھ جائے گا اسے بھی کام والے کپڑوں سے الجھن ہو گی اور مجھے بھی‘‘ زینب نے گویا بات ختم کر دی تھی مہرین آنٹی کو اس کا یوں بولنا بہت ناگوار گزرا تھا۔ تاہم بغیر کچھ کہے مہوش کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

سحرش آپی کی سسرال پہنچے تو سب سے پہلے سامنا ان کی ساس صاحبہ سے ہو گیا تھا انہوں نے کافی تنقیدی نظروں سے زینب کا جائزہ لیا اور پھر مہوش کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

زینب بھی اتنے سالوں میں ان لوگوں کے رویوں کو جان چکی تھی لہٰذا لاپرواہی سے ادھر ادھر دیکھتی رہی۔

ریان اس گیدرنگ کو دیکھ کر کافی خوش ہو رہا تھا اس نے پورے فنکشن کے دوران زینب کو ذرہ برابر بھی تنگ نہیں کیا تھا کھانا کھانے کے بعد مہندی کی رسومات شروع ہوئیں تو زینب ریان کا پیمپر بدلنے کے لیے اندرونی حصے کی طرف آ گئی ڈائپر چینج کر کے جوں ہی باتھ روم سے باہر نکلی سحرش آپی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

’’تمہیں اس حلیے میں آنے کی ضرورت ہی کیا تھی‘‘

’’کیا ہوا ہے میرے حلیے کو‘‘ زینب کی بھی بھنویں تن سی گئی تھیں۔ ان لوگوں کی بے جا پابندیاں، روک ٹوک اور ظاہری زیبائش کے لیے اتنا کانشس ہونا زینب کو پسند نہیں تھا۔

’’میرے خیال میں تمہاری وارڈ روب اسٹائلش کپڑوں سے بھری پڑی ہے۔ کوئی ساڑھی ہی پہن آئیں‘‘ سحرش آپی نے نخوت سے کہا۔

’’ساڑھی پہن کر ریان کو کیسے سنبھالتی میں‘‘ زینب نے تیکھے لہجے میں کہتے ہوئے باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے۔

’’ریان کی گورنس کہاں مر گئی ہے‘‘

’’آج وہ چھٹی پر تھی‘‘ زینب نے تحمل سے کہا۔

’’ہمارے طور طریقے اتنی آسانی سے کہاں آئیں گے تمہیں‘‘ سحری آپی بلند آواز میں اسے سنانے کی غرض سے بولی تھیں۔ زینب سنی ان سنی کرتی لان میں چلی آئی۔ پورے فنکشن کے دوران زینب کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اسے مسلسل گھور رہا ہے۔ ایک تو سحرش آپی کی باتیں دوسرے یہ بے نام سی بے چینی نے اسے چند پل میں ہی ہر شے سے اکتاہٹ کا شکار کر دیا تھا۔

اگلے دن بارات کا فنکشن اٹینڈ کرنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس نے اپنا انکار ساس تک پہنچا دیا تھا مگر وہ ہی ہوا جس کا اسے خوف تھا۔ فوراً ہی طلبی ہو گئی۔ پھر جب وہ مہرین آنٹی کی گھنٹہ بھر تقریر سن کر ان کے بیڈ روم سے باہر نکلی تو بے بسی کے احساس سے آنکھیں بھیگ سی گئی تھیں۔

مہرین آنٹی نے خود اس کے لیے کپڑے سلیکٹ کیے تھے زینب بے دلی سے تیار ہوتی رہی۔ دلہن والوں کی طرف نو بجے تک پہنچنا تھا بارات کا انتظام ہال میں تھا وہ لوگ تقریباً ساڑھے آٹھ بجے ہی گھر سے نکل پڑے تھے۔ اس کی ساس وقت کی بہت پابندی کرتی تھیں آج ریان اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اسی لیے خواتین کی ڈریسنگ، میک اپ جیولری دیکھنے کے علاوہ وہ سجی سجائی دلہن کو بغور دیکھ رہی تھی۔

’’میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں‘‘ شائستہ سی کھنکتی آواز سن کر زینب نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ لڑکی اس کے برابر رکھی کرسی کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

’’کیوں نہیں‘‘ زینب نے قدرے سنبھل کر کہا تھا۔

’’اس پورے ہال میں سوائے آپ کے ہر کوئی بول رہا ہے۔ ویسے آپ اتنا خاموش کیوں رہتی ہیں۔ کل بھی آپ مہندی کے فنکشن میں گم صم سی بیٹھی رہی تھیں گویا آپ جسمانی طور پر فنکشن میں شریک تھیں اور دل اور ذہن نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہے تھے میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا‘‘ وہ کافی باتونی لڑکی تھی زینب نے کافی حیرانی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ یقیناً یہ لڑکی کل رات سے ہی اس کے چہرے کا مطالعہ کر رہی تھی۔

''نام پوچھ سکتی ہوں آپ کا؟''

''زینب'' وہ دھیمے لہجے میں بولی تھی۔

''میرا نام علینہ ہے'' وہ خود ہی بتانے لگی تھی۔

''میری شادی کو سال بھر کا عرصہ ہو گیا ہے۔ آج کل میرے میاں کی لاہور میں ہی پوسٹنگ ہے۔ یعنی کہ ہم آپ کے مہمان ہیں۔ یہ بتاؤ کہ بیٹا کہاں ہے تمہارا'' علینہ انتہائی بے تکلفی سے بول رہی تھی۔ زینب دلچسپی سے اس کے خوب صورت چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔

''گھر چھوڑ کے آئی ہوں اسے''

''کیوں؟ کل اس نے تمہیں تنگ تو نہیں کیا تھا آج بھی لے آتی۔ کتنے غور سے سجی سجائی آنٹیوں کو دیکھ رہا تھا''

''لگتا ہے تم نے مجھے اور میرے بیٹے کو بہت ہی غور سے دیکھا'' زینب نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں......'' علینہ بھی مسکرائی اور پھر کہنے لگی۔ ''اس پورے ہال میں مجھے صرف تم ہی اچھی لگی ہو اس لیے تو تمہارے پاس بیٹھی باتیں بگھار رہی ہوں دراصل یار میرا دل نمود و نمائش سے بہت گھبراتا ہے اور تم میں سادگی کے سارے لوازمات پائے جاتے ہیں''

علینہ کے ساتھ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ اٹھتے وقت اس نے زینب کو اپنا کارڈ دیا تھا جسے زینب نے کافی خوش دلی کے ساتھ لے کر پرس میں محفوظ کر لیا۔

انشاء اللہ دوبارہ بھی ملیں گے اپنے بیٹے کو میرا پیار دینا۔ بہت ہی خوبصورت بچہ ہے تمہارا ویسے وہ تم پر نہیں ہے یقیناً باپ جیسا ہوگا۔ یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں خوبصورت نہیں کہہ رہی تم بہت پیاری لڑکی ہو ایک بچے کی ماں ہرگز نہیں لگتیں۔ بس یہ جو تمہاری ساحر آنکھوں میں سوز اور چہرے پر پھیلا کرب ہے نا اس نے مجھے اچھا بھلا پریشان کر دیا تھا آئندہ کی ملاقاتوں میں میں تمہیں بہت ہی فریش دیکھنا چاہوں گی۔ اللہ کرے تم حقیقی خوشیوں کو پالو''

وہ جس طرح آئی تھی اسی طرح چلی بھی گئی جبکہ زینب ششدر سی اس کی پشت کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ ''کیا میرے چہرے پر لکھی تحریر اتنی واضح ہے کہ ہر کوئی پڑھ لے؟'' زینب نے بے اختیار اردگرد کے مناظر پر نگاہیں دوڑائیں اور پھر بے اختیار نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں کسی کی بینائی اتنی تیز نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے اندر کے ''غم'' کو پڑھ سکے چہرے پڑھنے کا فن ہر کسی کو نہیں آتا۔ اس کا علم بھی اللہ نے خاص لوگوں کو دے رکھا ہے جو مسیحائی

کرنے کا فن جانتے ہیں جو اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے اگرچہ چند لمحوں کے لیے ہی سہی تکلیف دہ سوچوں سے مقابل کو چھٹکارا دلا کر اندر کی گھٹن باہر نکال کر تازہ ہوا، کچھ روشنی اور ٹھنڈک سی بھر دیتے ہیں اور علینہ بھی شاید انہیں لوگوں میں سے ہے''

گھر آ کر بھی وہ علینہ کے متعلق ہی سوچتی رہی یہاں تک کہ نیند کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی تھی۔

☆☆☆

''تم پریگننٹ ہو......'' مہرین کو ابھی ابھی ڈاکٹر نائلہ نے بتایا تھا وہ غصے سے بھنائی ہوئی اس کے بیڈروم میں پہنچیں۔

''جی......'' زینب نے یوں سر جھکا لیا تھا گویا اس سے گناہ کبیرہ سرزد ہو گیا ہو۔

''بتایا تو نہیں تم نے'' دل ہی دل میں گھنی میسنی کا خطاب دے کر بظاہر وہ ٹھنڈے لہجے میں بولی تھیں۔ زینب خاموش رہی۔

''کتنا ٹائم گزر چکا ہے''

''پانچواں مہینہ شروع ہے'' مہرین اپنی کوتاہ بینی کو خوب کوس رہی تھیں۔ اک سلگتی نگاہ اس پر ڈال کر بولیں۔

''بیٹا ہونا چاہئے''

''جی......'' زینب نے آنکھیں پھاڑ کر ان کے بے نیازانہ انداز کو ملاحظہ کیا اور پھر بے بسی سے بولی تھی۔

''میرے اختیار میں کیا ہے بھلا''

''بہر حال مجھے زید کا دوسرا بیٹا چاہئے۔ دھیان سے سن لو میری بات اور ہاں زید کو تو نہیں بتایا ہوگا تم نے''

مہرین نے نخوت سے کہا۔

''نہیں......'' وہ مختصر بولی تھی۔

''پریگنینسی پریڈ کے دوران تمہیں نیچے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ روبی کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی ہے عالم جنون میں کہیں تمہیں نقصان ہی نہ پہنچا دے''

کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اصل سے زیادہ سود پیارا ہوتا ہے۔ اپنی نسل کی بقا کتنی

عزیز تھی انہیں پھر انہوں نے زینب کے سامنے ہی فون کر کے زید کو بتایا تھا نہ جانے اس کا ردعمل کیا تھا زینب اگلے بیس دن تک مسلسل اس کے فون کا انتظار کرتی رہی تھی مگر دوسری طرف گھمبیر خاموشی تھی کبھی کبھی زینب کا دم الجھنے لگتا تھا جی چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں دور بھاگ جائے۔ کسی ایسی جگہ جہاں تلخ یادیں نہ ہوں۔ غم نہ ہوں، فکر و پریشانی کے خوفناک سائے نہ ہوں۔

☆☆☆

سحرش آپی کے بیٹے حنان نے قرآن پاک ختم کیا تھا ان کا ارادہ تھا کہ ساتھ ہی آئمہ (بیٹی) کا عقیقہ بھی کر دیا جائے کارڈ وغیرہ چھپ چکے تھے اب انہیں تقسیم کرنے کا مسئلہ تھا یہ کام آپی نے مہوش کے ذمے لگا دیا تھا وہ یونیورسٹی سے آ کر سحرش آپی کی طرف چلی جاتی تھی کبھی کبھی مہرین آنٹی بھی سحرش آپی کا ہاتھ بٹانے کی غرض سے چلی جاتیں۔

مہرین اور سحرش کے بے انتہا اصرار پر بھی زید پاکستان نہیں آیا تھا اور اس کے نہ آنے کی ساری ذمے داری زینب کے سر تھوپ دی گئی تھی۔ سحرش آپی تو دل کا غبار نکال کر اپنے گھر جا چکی تھیں۔ البتہ اسے نئے عذاب سے دوچار کر گئیں۔ اتنی تذلیل اور توہین کے بعد اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں اس نے فون سیٹ گھسیٹ کر گود میں رکھا اور پھر زید کا نمبر ملانے لگی۔ بیل مسلسل جا رہی تھی مگر فون اٹھانے والا شاید نمبر دیکھ کر جان بوجھ کر اگنور کر رہا تھا وہ سارا دن وقفے وقفے سے فون کھڑکاتی رہی۔ رات کے تقریباً ایک بجے دوسری طرف سے رسپانس دیا گیا تھا۔

''کیا تکلیف ہے'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا تھا زینب نے اذیت کے عالم میں اپنے لب چبا ڈالے۔

''آپ پاکستان کیوں نہیں آ رہے ہے زید! میں کس قدر پریشان ہوں۔ آنٹی کی، آپی کی سب کی باتیں مجھے سننا پڑتی ہیں۔ آپ کو ذرہ برابر بھی احساس نہیں ہے لوگ کس طرح پیٹھ پیچھے باتیں کرتے ہیں اس وقت زمین میں گڑ جانے کو دل کرتا ہے جب لوگوں کے منہ سے یہ الفاظ سنتی ہوں کہ زینب کا شوہر صرف اس کی وجہ سے گھر نہیں آتا۔ کیوں مجھے ذلیل و خوار کر رہے ہیں مجھ سے اتنی رسوائیاں برداشت نہیں ہوتیں۔ لوگ یوں میری طرف دیکھتے ہیں گویا میں ترس کھانے کے لائق ہوں آپ کو رحم کیوں نہیں آتا مجھ پر آخر میرا جرم کیا ہے۔''

ریسیور مضبوطی سے تھامے وہ بے تحاشا رو دی تھی دوسری طرف زید نے بڑے تحمل

کے ساتھ اس کی تقریر سنی تھی پھر پھنکارتے ہوئے بولا۔

''کچھ اور بھی کہنا ہے تو کہہ لو۔ پھر آج کے بعد فون کرنے کی جرأت مت کرنا''

''میں آپ کو فون کروں گی اور بار بار کروں گی'' زینب کے دل میں گویا آگ ہی لگ گئی تھی وہ اپنی انا، عزت نفس کا گلا گھونٹ کر بار بار اس کے سامنے جھک رہی تھی مگر اس خود پسند، مغرور انسان پر مطلق اثر نہیں ہوتا تھا۔

''زبان کو لگام ڈال رکھو ورنہ کاٹ دوں گا'' دو چار مزید جلی کٹی سنا کر زید نے فون کھٹاک سے بند کر دیا تھا جبکہ زینب کا رواں رواں سلگ اٹھا۔ وہ ساری رات روتی تڑپتی رہی تھی۔

دوسری صبح سحرش آپی کی طرف جانا تھا اس کی طبیعت بے حد خراب تھی اس کے باوجود وہ بمشکل تیار ہو کر ان کے گھر پہنچی تو فنکشن تقریباً اختتام کو پہنچنے والا تھا سحرش کا موڈ سخت خراب تھا جبکہ مہرین کی پیشانی پر بھی بل پڑے نظر آ رہے تھے اپنی طبیعت کی خرابی کے پیش نظر وہ جلد ہی گھر بھی آ گئی لاؤنج میں داخل ہونے سے پہلے ہی نذیراں لپکتی ہوئی اس کے قریب آئی۔

''بی بی! بڑی بیگم نہ جانے کہاں نکل گئی ہیں''

''کیا بکواس کر رہی ہو'' زینب نے چیخ کر کہا تھا۔ اس کے قدموں کے نیچے سے زمین کھسک گئی تھی۔

''جی بی بی صاحب! میری ذرا آنکھ لگ گئی تھی جب میں اٹھی تو بڑی بیگم گھر میں نہیں تھیں''

نذیراں نے منمنا کر کہا۔

''چوکیدار کہاں دفع تھا''

''وہ جی سگریٹ پینے گھڑی دو گھڑی کے لیے مارکیٹ چلا گیا تھا۔ اب وہ بڑی بیگم کو ڈھونڈنے کے لیے ہی نکلا ہے''

نذیراں آہستہ آواز میں بولی تھی زینب کی تو جان نکلی جا رہی تھی۔ ادھر سے ادھر چکراتے ہوئے وہ مسلسل نذیراں پر گرج رہی تھی۔

''وہ تمہارا صاحب! اسے پتا چل گیا نا تو آ کر ہماری بوٹیاں نوچ ڈالے گا۔ چلو آؤ تم میرے ساتھ آس پاس کے گھروں میں دیکھتے ہیں'' زینب لرزیدہ آواز میں کہتے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔ نذیراں نے بھی اس کی پیروی کی۔

آس پاس کی تمام گلیاں، چلڈرن پارک اور قریب قریب کی تمام مارکیٹس چھان

ماری تھیں مگر پھپھو کا کہیں نشان تک نہ تھا۔

"گھر میں تو سب جگہ دیکھا تھا نا تم نے" زینب نے کنپٹیاں دباتے ہوئے نذیراں سے پوچھا۔

"جی بی بی! اوپر والا پورشن نیچے والا سارا پورشن دیکھنے کے بعد انیکسی تک دیکھ ڈالی تھی"

سیل فون پرس میں سے نکال کر اس نے مہرین کو فون کرنے کا سوچا اور پھر خود ہی نفی میں سر ہلاتے ہوئے سیل فون ایک مرتبہ پھر پرس میں آف کر کے رکھ دیا تھکی ہاری نڈھال جب وہ گھر آئی تو گیٹ کے دائیں جانب گول دائرے کی شکل میں لگائی گئی پھولوں کی کیاریوں کے پاس سبز رنگ کا دوپٹہ اسے نظر آیا۔ اس نے تھوڑا سا آگے ہو کر پھولوں کی باڑ کے اوپر سے جھانکا تو پھپھو کو سرسبز و شاداب نرم و ملائم گھاس کے اوپر چت لیٹا پایا۔ وہ سرعت سے ان کی طرف بڑھی تھی۔

"پھپھو آپ یہاں ہیں" زینب چیخ کر بولی تھی۔ اس کی تیز آواز سن کر روبی نے آنکھیں کھول لیں اور پھر خفگی سے اسے دیکھا۔

"کیوں چلا رہی ہو...... نیند خراب کر کے رکھ دی ہے تم نے میری"

"پھپھو جانی آپ ادھر کیوں لیٹی ہیں۔ چلیں اٹھیں اپنے کمرے میں چل کر سو جائیں"

زینب نے ہاتھ بڑھا کر انہیں اٹھانا چاہا تھا۔

"نہیں، میں ادھر ہی سو جاؤں گی۔ تم جاؤ" روبی نے معصومیت سے کہا۔

"پھپھو! پلیز اٹھ جائیں نا۔ کوئی کیڑا وغیرہ کاٹ لے گا" وہ جھنجلا کر بولی تھی۔

"اگر آپ ادھر ہی لیٹی رہیں گی تو میثال آپ سے ناراض ہو جائے گی" ان کے گالوں پر سے گھاس کے تنکے ہٹاتے ہوئے اس نے انہیں دھمکایا تھا اس کے دھمکانے کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اٹھ کر اس کے ہمراہ اپنے بیڈروم میں آ گئی تھیں۔

زینب نے پہلے انہیں نہلایا پھر لباس بدلوایا، کنگھی کی، پرفیوم اسپرے کیا اور پھر بیڈ شیٹ بدل کر انہیں لٹانے سے پہلے میڈیسنز دیں۔ جب روبی کے سو جانے کا اسے یقین ہو گیا تھا تب ہی وہ ان کے پاس سے اٹھی تھی۔

☆☆☆

وقت اسی طرح دبے پاؤں گزر رہا تھا اب تو کام کا اتنا بوجھ بھی محسوس نہیں ہوتا تھا ریان کی مکمل ذمہ داری سلینہ اور مہرین آنٹی کے سپرد تھی سلینہ رات کو گھر چلی جاتی تھی اور ریان کو

مہرین آنٹی اپنے پاس سلا لیتیں۔ وہ تو ریان کو اٹھانے پیار کرنے کے لیے ترس کر رہ گئی تھی اور ریان بھی اب اس سے کھنچا کھنچا سا رہنے لگا تھا پہلے کی طرح اس کی طرف دیکھ کر لپکنے کی کوشش نہیں کرتا تھا بلکہ جب وہ ریان کو اٹھاتی تو وہ بے حد بے زاری کے عالم میں ہاتھ پاؤں مارنے لگتا تھا یا پھر بری طرح گھبرا کر رو پڑتا۔

کبھی کبھی اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان اجنبی لوگوں کی بھیڑ میں ریان بھی کہیں کھو رہا ہے۔ اس سے دور جا رہا ہے وہ بالکل خالی دل اور خالی ہاتھ کھڑی رہ گئی ہے۔

پچھلے کچھ دنوں سے ریان کی طبیعت بے حد خراب تھی۔ وہ بے انتہا چڑچڑا اور بدمزاج ہو رہا تھا مہرین اسے ہسپتال لے گئی تھی۔ پھر وہیں سے ہی اسے فون کر کے بتایا تھا کہ ریان کو ڈاکٹرز نے ایڈمنٹ کر لیا ہے۔

زینب کو تو گویا زمان و مکان بھول گئے تھے۔ وہ اسی پل ڈرائیور کے ہمراہ ہاسپٹل پہنچی تھی۔ مہرین بھی کافی پریشان نظر آ رہی تھیں ریان کو شدید بخار نے گھیر رکھا تھا وہ نیم غنودگی میں کراہ رہا تھا۔ زینب بے اختیار اس کی طرف بڑھی۔ اس کی گرم پیشانی پر اپنے لب رکھ کر وہ بے ساختہ رو دی تھی۔

پورے سات گھنٹوں بعد ریان کی طبیعت کچھ سنبھلی تھی اور مہرین اور زینب کی گویا جان میں جان آئی۔ تین دن مزید ہاسپٹل رہنے کے بعد ڈاکٹرز نے ریان کو ڈسچارج کر دیا تھا۔

گھر آنے سے پہلے مہرین نے ریان کے سر پر سے مٹھی بھر روپے خیرات کیے اور کھانا پکوا کر یتیم خانے بجھوایا۔

انہیں دنوں میں مہوش کو دیکھنے کچھ لوگ آ گئے تھے رشتہ بے حد اچھا تھا مہرین کو ان کا گھر بار اور خصوصاً لڑکا بے حد پسند آ گیا تھا وہ اپنے تئیں سب کچھ طے کر چکی تھیں جبکہ مہوش کے انکار نے نہ صرف مہرین بلکہ زینب کو بھی حد درجہ متوحش کر دیا تھا مہرین نے فون کر کے سحرش کو بھی بلوایا تھا مگر مہوش کی ناں ہاں میں نہیں بدلی تھی۔ سحرش کے سمجھانے پر مہرین نے کچھ عرصے کے لیے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

☆☆☆

"بے مروت لڑکی! اگر میں حنا (سحرش کی نند) سے فون نمبر لے کر تمہیں فون نہ کرتی تو تم نے تو مجھے کبھی یاد ہی نہیں کرنا تھا بھلا اس طرح بھی کوئی کرتا ہے۔ کہاں گم ہو گئی تھیں تم" حلیم

پکاتے ہوئے فون کی بیل نے زینب کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا وہ آنچ دھیمی کر کے فون اسٹینڈ کی طرف آئی۔ دوسری طرف علینہ کی چہکتی آواز نے گویا کانوں میں رس گھول دیا تھا اک سرشاری کی لہر من میں اتر گئی تھی۔

''تم بھولنے والی چیز نہیں ہو علینہ'' زینب نے بھی بے تکلفی سے اسے چھیڑا تھا جواباً اس نے نفیس سا قہقہہ لگایا۔

''کیا کررہی تھیں تم اس وقت''

''حلیم پکارہی ہوں، کھانا چاہتی ہو تو فوراً آجاؤ'' زینب نے مسکرا کر کہا تھا دل بے اختیار ہی اس سے ملنے کے لیے مچلنے لگا تھا۔

''اچھا تو جناب کوکنگ وغیرہ سے بھی دلچسپی رکھتی ہیں''

''جی بالکل، کبھی ہمارے غریب خانے کو رونق بخشیے گا۔ ایسی ایسی مزے دار ڈشز بنا کر خادمہ پیش کرے گی جن کا''

''جن کا ابھی ''زبیدہ آپا'' کو بھی علم نہیں ہے'' علینہ نے اس کا جملہ اچک کر اپنے من پسند معنی پہنا کر قہقہہ لگایا تھا۔ زینب بھی بے اختیار مسکرادی۔

''تمہاری کیا مصروفیات ہیں''

''اجی ہم فارغ بندے ہیں کبھی کوئی مریض محبت، مریض غم، مریض فکرو پریشانی آکر ہمیں مصروف کردیتا ہے'' علینہ نے بے نیازی سے کہا۔

''میں سمجھی نہیں ہوں'' وہ کچھ حیران ہوئی تھی۔

''بھئی ماہر نفسیات ہوں''

''تم...... سائیکاٹرسٹ ہو''

''کیوں شکل سے درزن یا دھوبن لگتی ہوں'' زینب کی حیرانی میں ڈوبی آواز کے معانی ومطالب سمجھ کر علینہ نے مصنوعی آزردگی سے کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ اتنی چھوٹی سی تو ہو تم''

''خیر اتنی بھی چھوٹی نہیں ہوں۔ تم سے تو کم از کم اڑھائی تین سال بڑی ہی ہوں گی میں'' علینہ نے صاف گوئی سے کہا تھا۔

''علینہ! میں کسی دن تمہارے کلینک کا چکر لگاؤں گی'' زینب کچھ سوچ کر دھیمی آواز

میں بولی تھی۔

''نہ نہ کلینک میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم میرے گھر آنا کلینک میں تو مریض آتے ہیں'' علینہ سے بے ساختہ کہا۔

''کیا پتا میں بھی مریض ہی ہوں''

''ہیں یہ میرے کان کیا سن رہے ہیں۔ فضول بولنا منع ہے'' علینہ نے اسے گھرکا۔

''ٹھیک ہی سن رہے ہیں'' وہ آہستگی سے بولی تھی۔

''اچھا یہ بتاؤ مریض غم ہو یا مریض محبت''

''مریض محبت'' اس نے گہری سانس کھینچتے ہوئے بے بسی سے کہا۔

''حادثہ کب رونما ہوا ہے''

''بہت سال پہلے......'' زینب کے لہجے میں ٹوٹے کانچ کی کرچیاں چیخ رہی تھیں۔

''وہ کون خوش نصیب ہے جس پر اتنی معصوم اور حسین لڑکی فدا ہے'' علینہ نے جان بوجھ کر سرسری سا انداز اختیار کیا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے پہلی نظر میں ہی یہ کھوئی کھوئی سی اداس آنکھوں والی لڑکی بھا گئی تھی۔ اور بے ساختہ ہی اس کے دل نے خواہش کی تھی کہ ان گہری براؤن آنکھوں کی اداسیاں کہیں نوچ کر پھینک دے۔ یہ براؤن سے کانچ مسکراتے ہوئے نہ جانے کیسے لگتے ہوں گے۔

''میرا شوہر'' وہ شاید آنسو پینے کی کوشش کررہی تھی۔ علینہ نے گہرا طویل سانس کھینچا۔

''کہاں ہوتے ہیں موصوف''

''ملک سے باہر ہیں'' زینب یہ بوجھ، اذیتیں اٹھائے اٹھائے گویا تھک چکی تھی اسی لیے ذرا سی ہمدردی پاتے ہی موم کی طرح پگھل گئی۔

''کب سے......''

''علینہ! میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گی میں اس بھار کو اٹھائے بہت تھک چکی ہوں۔ میرے اندر بے پنا گھٹن ہے'' زینب نے تھکن سے چور لہجے میں کہا تھا۔

''اوکے...... میں تمہارا انتظار کروں گی'' اس نے نرم آواز میں آہستگی سے کہتے ہوئے فون رکھ دیا تھا زینب بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

موسم کے تیور انتہائی خطرناک تھے مگر پھپھو کا چیک اپ کروانا بھی لازمی تھا۔ وہ جوں ہی ڈاکٹر وجاہت بدر کے کلینک سے نکلی تو موٹی موٹی بوندیں آسمان سے برس برس کر دھرتی کی پیاس بجھانے لگی تھیں۔

"پھپھو کا بازو مضبوطی سے تھام کر وہ پارکنگ ایریا میں کھڑی سفید کرولا تک آئی۔
پھوپھو کو گاڑی میں بٹھا کر اس نے قریبی اسٹور سے دوائیاں خریدی تھیں۔

پھوپھو کی حالت میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا یشال کی اچانک موت نے ایک دم ہی ان کے ذہن اور دل پر اثر کیا تھا۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ وہ ابھی تک صدمے کے زیر اثر ہیں جوں ہی انہوں نے یشال کی موت کی تلخ حقیقت کو قبول کرلیا تو ممکن تھا کہ وہ بالکل تندرست ہوجاتیں۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے غیر معمولی سی ہلچل کو محسوس کرلیا تھا۔ پھوپھو کو ان کے بیڈروم میں چھوڑ کر جب وہ اوپر آئی تو زید کے اونچا اونچا بولنے اور مہوش کے قہقہوں کی آواز نے گویا اس کے قدموں کو زنجیر کرلیا تھا۔

وہ ہمیشہ کی طرح بغیر بتائے بالکل اچانک ہی آ گیا تھا۔ زینب لرزیدہ قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

زید کی آمد سے اس گھر کے در و دیوار گویا جھوم سے اٹھتے تھے۔ اگرچہ نہ تو وہ پہلے کی طرح بولتا تھا نہ ہی کبھی اس کی ہنسی کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ بے حد سنجیدہ ہوگیا تھا۔ زید کی ماں کو اس کی بہنوں اور کزنز کو اس سے بس ایک ہی شکوہ تھا کہ زید بہت بدل گیا ہے۔ وہ کبھی مسکراتا تک نہیں اگر زبردستی مسکراہٹ لبوں پر سجائے بھی تو اس کی آنکھیں ساتھ نہیں دیتیں۔ وہ محفلوں کی جان تھا اب شور اور ہنگاموں سے دور کیوں بھاگنے لگا ہے۔ اس کے تو بے شمار دوست تھے اب وہ بالکل تنہا ہے۔

اس نے دوستوں سے تمام تعلق رابطے توڑ لیے ہیں اس کا ہنسنے کو دل نہیں کرتا وہ کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتا۔ اسے تنہائیاں اچھی لگنے لگی ہیں۔ اس کا جی ہر شے سے اچاٹ ہوگیا ہے۔ اس اتنے بڑے "زید ولا" میں صرف ایک کمرا ایسا ہے جس میں اس کا چین، سکون بند ہے وہ جب بھی پردیس سے آتا ہے سب سے پہلے اسی کمرے میں موجود یشال کی تصویروں کے درشن کرتا ہے اسے پاکستان میں صرف دو چیزوں کی کشش کھینچ کر لاتی ہے ایک یشال کی "یاد" جو ہمیشہ سے اس کے ساتھ ہے اس کے باوجود جب بھی اس کا دل بے قرار ہوتا ہے وہ یشال سے

ملنے کے لیے آجاتا ہے اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ ایئر پورٹ سے سیدھا وہ کہاں جاتا ہے اور دوسری یشال کی ماں سے اسے شاید اپنی ماں سے بھی زیادہ اس عورت سے محبت ہے وہ جتنے دن پاکستان میں رہتا ہے تمام وقت چھوٹی ممی کے ساتھ گزارتا ہے۔

پھر وہ دونوں یشال کو "یاد" کر کے روتے ہیں۔ اس دوران زید سلمان بھول جاتا ہے کہ اس نے اللہ اور رسول ﷺ کو گواہ بنا کر ایک عورت سے بندھن باندھا تھا وہ عورت اس کی بیوی ہے اس کے بچے کی ماں بھی ہے۔ اس سے محبت بھی کرتی ہے اس کی اطاعت بھی کرتی ہے۔ زید کی غیر موجودگی میں ان تمام ذمے داریوں کو احسن طریقے سے نبھاتی ہے جو اس پر فرض ہیں مگر اس سب کے باوجود یہ عورت اپنے شوہر کے دل تک رسائی نہیں حاصل کرسکی۔ صرف اس لیے کہ اس کے شوہر کے دل میں کوئی اور پورے کروفر کے ساتھ موجود ہے وہ تمام عمر بھی اس کے دل کی دہلیز پر سر پٹختی رہے تو پھر بھی کوئی روزن، کوئی دریچہ نہیں کھول پائے گی۔

☆☆☆

یہ ہم تسلیم کرتے ہیں
تمہیں فرصت نہیں ملتی
ہمارے واسطے تم کو
کوئی ساعت نہیں ملتی
ہماری سوچ کے محور
کبھی اک پل تو سوچو تم
تمہیں ہم یاد کرتے ہیں
اور اتنا یاد کرتے ہیں
کہ خود کو بھول جاتے ہیں

آج اس نے پورے چار سال بعد ڈائری کو کھولا تھا اس ڈائری میں اس کی زیست کا گویا پورا افسانہ درج تھا اس کے آنسو، غم، محرومیاں اور بین کرتی روتی، کرلاتی محبت۔

ڈائری لکھنا اس نے یہاں آ کر شروع کیا تھا۔ یہ ڈائری اسے یشال نے انٹر میں ٹاپ کرنے پر دی تھی۔ اس ڈائری میں گویا یشال کی خوشبو بند تھی۔ وہ ریزہ ریزہ ہوتے دل کے ساتھ اس کا صفحہ صفحہ پڑھتی چلی گئی۔

ڈائری کے پہلے صفحے پر سنہری حروف سے لکھا یہ شعر بے ساختہ رلا گیا تھا یشال نے نہ جانے کس ترنگ میں اسے یہ دعا دی تھی۔

فضل عمر کا سایہ تم پر رہے ہمیشہ
ہر دن چڑھے مبارک، ہر شب بخیر گزرے

کمرے کی ہر شے گویا اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ وہ پچھلے گیارہ گھنٹے سے اس کمرے میں بند تھی نارسائیوں کے کرب نے دل کو زخم زخم کر دیا تھا ساری رات ایک ہی پوزیشن پر بیٹھے رہنے کی وجہ سے کمر اکڑ کر تختہ ہو گئی تھی چڑیوں کی چہچہانے کی آواز نے اسے چونکایا تھا وہ بمشکل اٹھ کر گلاس ونڈو کے چہرے پر سے دبیز کرٹن ہٹانے لگی۔

نیچے زندگی رواں دواں تھی۔ مالی پودوں کی کاٹ چھانٹ کرنے کے بعد انہیں غسل دے رہا تھا۔ مہوش کی گاڑی پورچ میں نہیں تھی یقیناً وہ یونیورسٹی جا چکی تھی ہر کوئی اپنی ذات میں مگن و مصروف تھا۔ زندگی اپنے ڈھب پر رواں دواں تھا ہر گزرتی صبح کچھ تلخ یادیں، اذیتیں، دامن میں ڈال کر اندھیروں میں گم ہو جاتی تھی۔

وہ بھی جنوری کی انتہائی سرد شام تھی رات بھر ہونے والی بارش کی وجہ سے ٹھنڈ میں بے انتہا اضافہ ہو گیا تھا۔

زید کو آئے ہوئے آج ساتواں دن تھا پچھلے تین سالوں میں یہ اس کا پہلا طویل قیام تھا۔ نہ جانے کن کاموں میں وہ مصروف تھا صبح کا گیا رات بہت دیر سے لوٹتا۔ وہ اس کے انتظار میں آدھی آدھی رات تک جاگتی رہتی تھی زید کے آنے کے بعد اسے کھانا اور دودھ دے کر ہی وہ سوتی تھی ان دنوں مہرین آنٹی بھی طنز و طعنوں کے نشتر چبھونے سے گریز کر رہی تھیں۔ یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کی خبر دے رہی تھی۔ وہ جتنا سوچتی اتنا ہی الجھتی۔ زید کا رویہ بھی ناقابل فہم تھا۔ کبھی دھوپ کبھی چھاؤں، وہ اس کے التفات پر خوش بھی نہیں ہو پاتی تھی کہ ایک مرتبہ پھر وہ اپنے اردگرد بے حسی کی دبیز چادر لپیٹ لیتا۔

زید کے جانے میں دو دن رہ گئے تھے لنچ ٹائم میں وہ سحرش آپی کی طرف چلا گیا تھا البتہ رات کا کھانا اس نے سب کے ساتھ کھایا تھا پھر وہ دونوں ماں بیٹا اٹھ کر اسٹڈی روم کی طرف چلے گئے تھے زینب عجیب الجھن کا شکار تھی وہ اس دبیز خاموشی کی وجہ تلاشتی چائے بنا رہی تھی جب مہوش نے کچن میں جھانک کر کہا۔

''ریان کے کپڑے کہاں ہیں۔ جو مما آج بازار سے لائی ہیں''

''کپڑے گیلے کر دیے ہیں ریان نے کیا؟'' زینب نے برنر بند کر کے پلٹ کر مہوش سے پوچھا تھا اس نے نفی میں سر ہلایا اور پھر بے زاری سے بولی۔

''اب بتا بھی دو۔ کہاں رکھے ہیں تمام شاپرز تم نے''

''وہ شاپرز تو آنٹی اپنے کمرے میں لے گئی تھیں'' زینب نے سوچتے ہوئے جواب دیا تھا۔ مہوش فوراً ہی پلٹ گئی تھی اس نے چائے کپوں میں ڈال کر اسٹڈی روم میں بھجوائی اور اپنا کپ لے کر کمرے میں آ گئی تھی کچھ ہی دیر بعد مہوش ایک مرتبہ پھر اس کے بیڈروم میں داخل ہو کر بولی۔

''تم سونے لگی ہو؟''

''ہاں......'' زینب اس کے عجیب و غریب رویے اور سوال پر حیرت زدہ سی اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

''زید کی پیکنگ کرنی ہے مجھے اس کا سوٹ کیس اور بیگ دو'' مہوش نے سرد سی آواز میں کہا تھا زینب نے اٹھ کر اسے مطلوبہ چیزیں تھما دیں۔ اس کے جانے کے بعد وہ بے دم سی بیڈ پر ڈھے گئی تھی۔

اگلی صبح سلینہ نہیں آئی تھی جس دن سلینہ چھٹی پر ہوتی تھی وہ سارا دن ہی زینب کا سرشار گزرتا۔ مہرین آنٹی کی روک ٹوک کے باوجود وہ اپنے بیٹے سے جی بھر کر پیار کرتی۔ اس وقت بھی اس نے بڑی خوشگوار مسکان لبوں پر سجا کر ریان کے کمرے میں جھانکا تھا اور اسے نہ پا کر وہ مہرین کے بیڈروم کی طرف آ گئی۔ ناک کرنے کے بعد اس نے بے دھڑک دروازہ کھول کر مہرین کے بیڈ کے ساتھ رکھے کاٹ کی طرف دیکھا تھا اور پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کاٹ کے پاس آئی۔ ملگجے سے اندھیرے میں اسے خالی کاٹ نظر آ گیا تھا۔ زینب کا دل دھک سے رہ گیا کھٹکے کی آواز سن کر مہرین کی نیند بھی ٹوٹ گئی تھی۔ انہوں نے سوئچ بورڈ پر ہاتھ مار کر کئی بٹن آن کیے۔ پورا کمرہ روشنیوں میں نہا گیا تھا۔

''آنٹی، ریان کہاں ہے؟'' اس نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ مہرین کی نیند بھری آنکھوں میں دیکھا تھا۔

''زید کے پاس'' مہرین نے نہ جانے کیوں نگاہیں چرا لی تھیں۔

''اور زید کہاں ہیں؟'' اس نے خوفزدہ نظروں سے مہرین کے رنگ بدلتے چہرے کی

طرف دیکھا۔

''عمان'' انہوں نے گویا زینب کے سر دھماکہ کیا تھا وہ پھٹی پھٹی نظروں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

''کیا کہہ رہی ہیں آپ......'' وہ بے یقینی کے عالم میں بولی تھی۔ مہرین اس کی زرد رنگت، نم آنکھوں اور لرزتے وجود کو دیکھتے ہوئے سپاٹ انداز میں بولیں۔

''زید اپنے بیٹے کو ساتھ لے گیا ہے۔ اسے تم پر اعتبار نہیں ہے۔ کیا پتا کہ تم ریان کو بھی مار دو''

''آپ نے کیوں جانے دیا ہے میرے ریان کو'' زینب نے چلا کر کہا۔ اس کا تنفس بے حد تیز چل رہا تھا۔ وہ عالم وحشت میں آگے بڑھی پھر اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ابھی یقیناً جہاز نے اس سرزمین کو الوداع نہیں کہا تھا وہ پلٹ کر دوڑتی ہوئی لاؤنج میں آئی۔ مہرین بھی اس کے پیچھے لپکی تھیں۔

''میں تمہیں نہیں جانے دوں گی ریان'' وہ بلند آواز میں رو رہی تھی اور اندھا دھند سیڑھیاں اتر رہی تھی اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ پاؤں ننگے اور دوپٹہ گلے میں جھول رہا تھا۔ مہرین اس کی دیوانگی کو دیکھ کر گھبرا اٹھی تھیں۔ مہوش کو آواز دے کر جگایا اور پھر جوں ہی انہوں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا زینب کی بلند و بالا چیخ سنائی دی تھی۔

وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ نیچے آئیں۔ اسی پل روبی نے بھی لاؤنج میں قدم رکھا تھا۔ زینب کو اکیس سیڑھیوں سے گرتا دیکھ کر وہ دم بخود رہ گئی تھیں۔ ان کے دماغ میں اک ٹیس سی اٹھی تھی وہ بے اختیار زینب کی طرف لپکیں۔

''زینب، زینب آنکھیں کھولوں زینی'' انہوں نے اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔ فرش پر پھیلتا خون، زینب کا بے ہوش وجود اور اس کی مدھم ہوتی سانسیں۔ ان کی نگاہیں ایک اور منظر دیکھ رہی تھیں۔ ییشال کی ناک اور منہ سے بہتا خون اس کا سرد وجود اور ساکن سانسیں۔

''نہیں......نہیں، زینی تو نہیں مر سکتی'' وہ چیختے ہوئے پیچھے ہٹی تھیں اور پھر بے اختیار رونے لگیں۔ مہرین نے نذیراں اور مہوش کی مدد سے اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالا۔ روبی بھی ان کے ہمراہ تھیں۔

ڈاکٹر نائلہ نے اس کی نازک حالت کے پیش نظر فوراً ہی ٹریٹمنٹ دینے کے بعد

آپریشن کر ڈالا تھا۔

باہر ٹھنڈے فرش پر بیٹھی روبی رو رو کر اور گڑگڑا کر رب تعالیٰ سے اس کی زندگی کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد ان کے کانوں نے چند آوازیں سنی تھیں۔ ان کے بہتے آنسو ایک دم ہی تھم گئے۔ انہوں نے سر اٹھا کر اس مہربان نرس کی طرف دیکھا تھا جس نے ایک بچہ مہرین کی گود میں ڈال دیا تھا اور دوسرا ان کی۔ وہ خوشی اور غم کی ملی جلی کیفیات کا شکار گلابی کمبل میں لپٹے وجود کو دیکھتی رہیں۔ یہاں تک کہ ان کی آنکھوں سے ایک مرتبہ پھر تشکر کے آنسو بہہ نکلے۔

اس نے ڈاکٹر نائلہ کے شاندار ہسپتال کے پرائیویٹ روم میں پورے سترہ گھنٹے بعد آنکھیں کھولی تھیں۔

''ریان'' اس کے لبوں سے سسکاری نما آہ نکلی تھی۔ پھر اس نے اپنے دائیں پہلو میں سوئی بچی پر نگاہ ڈالی تھی۔ کچھ تحیر کے عالم میں اس نے بچی کو بار بار دیکھا۔ وہ ہو بہو ییشال کی تصویر تھی۔

''آپ کا بیٹا کاٹ میں سو رہا ہے'' نرس نہ جانے کیا سمجھی تھی۔ خوشدلی سے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ زینب نے ایک مرتبہ پھر بچی کے چہرے پر نگاہیں جما دی تھیں۔ اس کے ہونٹ، ناک چہرے کی بناوٹ، وہ گویا دوسری ییشال تھی۔

زینب کے دل کی حالت عجیب سی ہو گئی۔ مہرین اور روبی بھی کچھ اس قسم کی کیفیات کا شکار تھیں۔ بچی کی ییشال سے اس حد تک مشابہت نے ان سب کو حیرت میں مبتلا کر دیا تھا جبکہ بیٹے کی شکل ریان سے ملتی جلتی تھی۔

تین دن کی مشعل کو گود میں لے کر وہ بے اختیار رو دی تھی۔ بھولے بسرے سے کچھ مناظر ذہن کی اسکرین پر کسی فلم کی طرح چلنے لگے تھے اس نے تھک ہار کر سر تکیے پر پٹخا اور زیر لب بڑبڑائی۔

''زید سلمان! اگر تم چند گھنٹے مزید رک جاتے تو پھر شاید کبھی بھی کہیں بھی جانے کے قابل نہ رہتے ییشال نہ سہی مشعل نے تمہارے قدموں کو زنجیر کر لینا تھا۔ نہ جانے ''مشعل'' کی صورت میں میرا امتحان ہے یا تمہارا۔ یہ بالکل ''ییشال'' کی جیتی جاگتی تصویر ہے اور یہ تو طے ہے کہ تم ییشال کو کبھی بھی بھلا نہیں سکتے'' اس نے بیٹی کی پیشانی کو چوما اور اس کے ننھے سے وجود کو سینے میں بھینچ لیا۔

''یا اللہ! کیا میں ساری زندگی ادھوری محبتوں کے ساتھ گزاروں گی۔ میرا دل تو پہلے ہی صحرا ہے کیا ممتا بھی پیاسی رہے گی۔ میں ریان کی صورت دیکھنے کے لیے ترستی رہوں گی'' وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

''تم بہت ہی انصاف پسند ہو زید سلمان! بہت اچھی سزا تجویز کی ہے تم نے میرے لیے۔ یشال کی ماں اس کی یاد میں تڑپتی ہے روتی ہے۔ اب ریان کی ماں ریان کی یاد میں تڑپے گی۔ روئے گی، کرلائے گی'' وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر سوچیں پھن پھیلائے اسے نگلنے کو بے تاب تھیں۔

☆☆☆

''میں آخری مرتبہ کہہ رہی ہوں تم کہیں بھی نہیں جاؤ گے'' یشال نے تحکم سے کہا تھا۔

''تمہارے حکم کا ہی تو غلام ہوں میں'' زید نے منہ بنایا۔

''اس میں کوئی شک نہیں ہے'' یشال اترائی تھی۔

''بہت خوش فہمیاں پال رکھی ہیں تم نے'' اس نے یشال کو چڑانے کی کوشش کی تھی اور وہ بری طرح چڑ بھی گئی۔

''جو مرضی کہہ لو، میں تمہیں جانے نہیں دوں گی''

''جب میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ نہ جاؤ گجرات۔ پھر کیوں گئی تھیں تم اس فضول سی کزن کو لینے۔ چھوٹی ممی اکیلی چلی جاتیں'' زید نے خفگی سے ناراضی کی اصل وجہ بتائی تھی یشال کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''او...... تو جناب کو اس بات کا غصہ ہے''

''مزید اور بھی وجوہات ہیں غصے کی'' زید نے لہجے میں ڈھیروں ناراضی سمو کر کہا تھا۔

''وہ کیا......'' یشال کو کچھ حیرت ہوئی۔

''یہ کہ جب سے وہ محترمہ تشریف لائی ہیں تم دکھائی ہی نہیں دیتیں سارا وقت وہ ہونق سی لڑکی تمہارے ساتھ چپکی رہتی ہے''

''میری کزن کو تم ہونق کہہ رہے ہو اور یہ سارا وقت زینب کے ساتھ رہنے کی کیا بات ہوئی۔

یونیورسٹی میں آٹھ نو گھنٹے میرا دماغ کون چاٹتا ہے اب گھر آ کر بھی اسے ٹائم نہ دوں

آخر ایک ہی تو میرے ماموں کی بیٹی ہے اور اتنی سوئٹ نیچر کی ہے اتنی مٹھاس بھری ہے اس کے''

''بس بس، اسے شیرے میں ہی ڈبو رہنے دو اور میری بات سنو۔ ماہم، قاسم وغیرہ بھی جا رہے ہیں سوات اب اگر عین ٹائم پہ انہیں جواب دیا تو اچھی خاصی لڑائی ہو جائے گی ماہم کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔ کس قدر جھگڑالو لڑکی ہے'' زید نے اس کی بات کاٹ کر بلند آواز میں کہا تھا۔

''میں نہیں جاؤں گی' اور تم بھی نہیں جاؤ گے'' یشال ٹھنکی۔

''تم یقیناً زینب کی وجہ سے کہہ رہی ہو نا'' زید معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا تھا اسی لیے اس کا موڈ بھی آف ہو گیا۔

''ہاں......'' یشال نے فوراً ہی اعتراف جرم کر لیا۔

''نجانے کہاں سے یہ عذاب نازل ہو گیا ہے'' زید نے غصیلے لہجے میں کہا تھا یشال کو بھی غصہ آ گیا۔

''تم کیوں میری معصوم سی کزن کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو''

''ایک تم معصوم ہو اور دوسری یہ معصومیت کی ماری آ گئی ہے'' زید پھنکارتا ہوا کھڑا ہو گیا تھا۔

''رکو تو، کہاں جا رہے ہو۔ اچھا سوری بابا چلتے ہیں، اب خوش'' یشال کہاں اسے خفا دیکھ سکتی تھی۔ فوراً ہی اس کے پیچھے لپکی۔

لاؤنج سے ملحقہ بیڈروم میں موجود زینب نے ان دونوں کی ہر بات لفظ بہ لفظ سنی تھی۔

زید کے منہ سے اتنے توہین آمیز الفاظ سن کر زینب کا اہانت کے احساس سے برا حال ہو گیا تھا اگرچہ یشال برابر اس کی وکالت کر رہی تھی مگر زید نے جس انداز میں اس کے متعلق گفتگو کی تھی اس کے دل میں تکلیف اور غصے کی لہریں سی اٹھنے لگیں۔ اگر ماجد یا گڈو وغیرہ میں سے کوئی اس کے ساتھ اس انداز میں گفتگو کرتے یا پھر اس کی تذلیل و توہین کرتے تو اسے اتنا شدید صدمہ نہیں پہنچتا اس کے نازک دل کو زیادہ ٹھیس اس لیے پہنچی تھی کہ وہ اس بے انتہا مغرور اور نک چڑھے شخص کو دل میں بسا چکی تھی اور جس سے آپ محبت کرتے ہیں اس سے پہلی توقع یہی ہوتی ہے کہ وہ بھی نہ صرف بدلے میں ویسی ہی محبت دے بلکہ عزت و تکریم بھی کرے۔

اسے پھپھو کے گھر آئے تقریباً بیس پچیس دن ہو گئے تھے یشال نے اس کا تعارف اپنی تمام کزنز سے کروایا تھا۔

زینب کو میشال کی تائی امی اور ان کی دونوں بیٹیاں کچھ خاص پسند نہیں آئی تھیں۔ بالکل اپنے بھائی جیسی مغرور و خود پسند۔ سب سے بڑا مسئلہ تو یہ تھا کہ ان لوگوں سے دن میں کئی کئی مرتبہ سامنا ہوتا تھا اس کا۔

سلمان انکل اور رحمان انکل دونوں ہی بے حد اچھی طبیعتوں کے مالک نفیس مزاج کے نرم دل انسان تھے۔

''ارے رحمان! یہ سنہری سنہری سی چڑیا تمہارے گھر کہاں سے آئی ہے'' سلمان انکل معمول کے مطابق نیچے ناشتہ کرنے کے لیے آئے تو کچن میں آملیٹ کا آمیزہ بناتی زینب کو دیکھ کر انہوں نے چھوٹے بھائی سے قدرے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

''اس سنہری چڑیا کا نام زینب ہے اور یہ روبی کی بھتیجی ہے'' رحمان نے اخبار سے نظریں ہٹا کر بے حد خوش دلی سے جواب دیا تھا سلمان نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر پیار کیا حال احوال پوچھا تو زینب کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔

''یہ تو بہت ہی اچھا کیا ہے تم نے روبی کہ زینب بیٹی کو لے آئی ہو۔ ہماری میشال کا دل بھی بہل جائے گا'' سلمان نے نہایت شفقت سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ سے آملیٹ کی پلیٹ تھام لی۔

''میشال کا دل بہلانے کے لیے ہم جو ہیں کسی اور کی کیا ضرورت ہے'' زید ابھی ابھی ڈائننگ ہال میں داخل ہوا تھا ڈیڈی کے برابر رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے میشال کے کان میں سرگوشی کی تھی آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ پاس بیٹھی زینب نے بھی زید کی سرگوشی با آسانی سن لی۔

''اور بیٹے! کیا مصروفیات ہیں۔ پڑھائی شڑھائی کر رہی ہیں''

''بھائی جان! زینب نے میٹرک میں اے گریڈ لیا ہے۔ مجھے امید ہے اسے بہت ہی اچھے کالج میں ایڈمیشن مل جائے'' زینب کی بجائے روبی نے بڑے فخر سے بتایا تھا۔

''ہاں کیوں نہیں'' رحمان اور سلمان نے اسے ستائش بھری نگاہوں سے دیکھا تھا وہ ایک دم ہی جھینپ کر سر جھکا گئی۔

''میشال! تم زینی کا ایڈمیشن فارم لے آنا'' روبی نے میشال کے سامنے دودھ کا گلاس رکھتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا جبکہ اس کے برابر بیٹھے زید کے چہرے پر ناگواری پھیلتی چلی گئی تھی۔

''اب اٹھ بھی چکو۔ پہلے ہی زینب نامہ سنتے اتنی [illegible] دئی ہے''

''ہاں.....'' تم چلو میں بس آ رہی ہوں [illegible] ہوئے ترش انداز نے میشال کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اسے ڈائننگ ہال سے باہر دھکیلتے [illegible] بولی۔ سلمان اور رحمان ان سے پہلے ہی اٹھ چکے تھے پھپھو ناشتا کرنے کے بعد کچن سمیٹ رہی تھیں۔ زینب بھی آنسو پیتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

وہ چونکہ سارا دن فارغ ہوتی تھی اسی لیے پھپھو کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹا دیتی۔ صبح ناشتا بنانے کی ذمہ داری اس نے خود بخود اپنے سر لے لی تھی۔ سلمان اور زید دونوں ہی نیچے ناشتا کرتے تھے۔ مہرین آنٹی کافی دیر سے اٹھتی تھیں جبکہ مہوش بے حد موڈی تھی۔ اپنی مرضی سے اٹھتی ناشتا کرتی اور کالج چلی جاتی تھی۔ ڈیڑھ دو ہفتے بعد اس کا بھی ایڈمیشن ہو گیا تھا۔

اس کے پک اینڈ ڈراپ کا مسئلہ تھا جو کہ میشال نے چٹکیوں میں حل کر دیا۔

''ممی! زینی کا پک اینڈ ڈراپ ہمارے ذمے ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں''

''تم ایک مرتبہ زید سے پوچھ لو'' روبی، زید کی شدت پسندی سے واقف تھیں۔ اسی لیے دھیمی آواز میں بولیں۔

''وہ میری بات ہرگز نہیں ٹالے گا'' میشال کے لہجے میں محبتوں کا مان بول رہا تھا۔ زینب نے بہت ہی رشک بھری نگاہوں سے اس کے گندمی چہرے پر پھیلتے رنگوں کو دیکھا۔

میشال نے نہ جانے کس طرح زید کو منایا تھا۔ اب وہ صبح صبح ان کے ساتھ ہی کالج جانے لگی تھی وہ دونوں اس طرح باتوں میں مگن ہو جاتے تھے گویا ان کے ساتھ کوئی تیرا وجود ہے ہی نہیں اور اس پل زینب اندر ہی اندر سلگتی رہتی۔

ان کے کزنز انہیں ''لیلیٰ مجنوں'' کے نام [illegible] چھیڑتے تھے ایک ساتھ ہی کھانا کھاتے، ایک ساتھ ہی پڑھتے۔ جہاں بھی جانا [illegible] دونوں اکٹھے ہی جاتے تھے۔ زید اور میشال کی سالگرہ کا دن بھی ایک ہی تھا اپنی سالگرہ کو وہ بڑے ہی اہتمام کے ساتھ مناتے تھے۔

''اس دفعہ اگر تم نے مجھے ٹوئٹی یا پھر باربی گفٹ کی نا تو پھر مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا''

زینب کو آتا دیکھ کر میشال نے بیک ڈور کھول کر زید کو دھمکایا تھا۔

''اب میں تمہیں ٹوئٹی اور باربی نہیں دوں گا۔ اس دفعہ تو میں نے تمہارے لیے بہت

ہی نائس چیز خرید لی ہے'' زید نے اس کے تجسس کو ہوا دی تھی۔

''کیا......؟'' یشال نے سیاہ جگر جگر کرتی آنکھیں زید کے چہرے پر جمادی تھیں۔ انہیں آنکھوں کے ''سحر'' نے تو اسے دیوانہ بنایا تھا۔

''کل تک صبر کرو''

''پلیز زید! بتا دو نا...... مجھے رات بھر نیند نہیں آئے گی'' یشال نے اپنا گداز ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر لجاجت بھرے انداز میں کہا تھا۔

''اچھا ہے...... پوری رات مجھے سوچتی رہنا'' زید نے بے نیازی سے کہا تھا اور پھر دوسری شام زید کے انتہائی خوبصورت پیکنگ میں لپٹے گفٹ کو کھول کر اس نے دیکھا اور پھر ہنستی چلی گئی۔

''چاکلیٹس، کینڈیز اور انتہائی نفیس بریسلیٹ'' اس نے بریسلیٹ ہاتھ میں پکڑ کر بغور دیکھا اور پھر بولی۔

''تم زنانہ قسم کی شاپنگ بھی کرنے لگے ہو''

''قسم سے کل پہلی مرتبہ جیولری کی شاپ اندر سے دیکھی تھی'' زید نے کیک پیس مہوش کے منہ میں زبردستی ٹھونستے ہوئے کہا تھا زینب قدرے الگ تھلگ سے کونے میں بیٹھی انہیں خوش گپیاں کرتے دیکھ رہی تھی وہ دونوں ساتھ بیٹھے تھے نہ جانے کیوں یہ منظر زینب کی آنکھوں میں چبھنے لگا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ جادو کی کوئی ایسی چھڑی ہو جس سے تمام منظر وہ پل بھر میں بدل دے۔ یشال کی جگہ وہ بیٹھے۔ زید یشال سے نہیں اس سے باتیں کرے۔

''کاش یشال زید کی آنکھوں سے دور چلی جائے''

اس نے بے اختیار سوچا تھا اور پھر خود کو ڈپٹنے لگی۔

''یہ میں کیا فضول سوچ رہی ہوں'' ایسی فضول سوچیں اس کے دل و دماغ میں گھس چکی تھیں۔

یونیورسٹی میں یہ ان کا آخری سال تھا فائنل پیپرز کے بعد یشال تو ان دنوں کوکنگ کا کورس کرنے لگی تھی جبکہ زید مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا اور یہ تو اسے بہت بعد میں پتا چلا کہ فارن سروسز میں جانے کی خواہش زید کی نہیں یشال کی تھی اور زید نے کب یشال کی کسی بھی خواہش کو رد کیا تھا۔

وہ دن اتوار کا تھا۔ زید اور یشال دونوں ہی گھر پر موجود تھے یشال اپنی زیر نگرانی لان کی کاٹ چھانٹ کروا رہی تھی پھولوں اور خوشبوؤں سے اسے عشق تھا اسی لیے تو ان کا وسیع و عریض لان ملکی و غیر ملکی پھولوں کے خوشنما پودوں سے بھرا ہوا تھا۔ زید پودوں کو پانی دے رہا تھا اور کبھی کبھی وہ پائپ کا رخ یشال کی طرف بھی کر دیتا تھا جواباً یشال کی چیخ نما آوازیں سنائی دیتیں۔ اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے زینب یہ تمام منظر دیکھ رہی تھی اس کا دل بے حد بوجھل اور افسردہ تھا۔

رات کو زید نے اسے معمولی بات پر جھڑک دیا تھا وہ اسی طرح اس کی تذلیل کر کے رکھ دیتا تھا وہ پوری رات روتی رہی تھی اک پل کے لیے بھی اس کی آنکھ نہیں لگ سکی تھی۔ رات کے آخری پہر اس نے بے حد غصے کے عالم میں تلملا کر نہ صرف زید بلکہ یشال کو بھی بددعائیں دے ڈالی تھیں۔ یشال کی وجہ سے ہی وہ بار بار اسے ٹیز کرنے کی کوشش کرتا تھا کیا میں یشال سے حسد کرنے لگی ہوں؟ اس وقت لان میں موجود سبز کپڑوں میں ملبوس بے حد نازک سی یشال کو دیکھ کر اس نے بے اختیار سوچا تھا یشال کی کھنکتی آواز اسے یہاں تک سنائی دے رہی تھی۔

''زید! تم مجھے کچھ سبزیوں کے بیج لا کر دینا لان کے پچھلے حصے میں ہم سبزیاں لگائیں گے۔ پھر جب وہ اگ آئیں گی تو پھر میں تمہیں تازہ سبزیوں کا پلاؤ بنا کر کھلاؤں گی ان میں سے کچھ سبزیوں کو''

''بس...... بس ابھی مجھے بیج تو لانے دو۔ پھر ڈھیروں سبزیاں اگا لینا۔ پھر صبح صبح انہیں بیلوں سے توڑ کر کچھ کچن میں رکھ لینا اور کچھ مجھے دینا'' زید نے بے ساختہ اسے ٹوک کر کہا تھا۔ یشال نے حیرانی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''تم کیا کرو گے؟''

بھئی میں سبزی منڈی جا کر بیچ آیا کروں گا یا پھر ریڑھی لگا کر آوازیں کسوں گا، گاجریں لو، مٹر لو''

''تم بھی نا زید'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی اسی پل زینب نے کھڑکی بند کر کے پردے برابر کر دیئے تھے وہ ایک مرتبہ پھر رو رہی تھی۔

☆☆☆

زید نے مقابلے کا امتحان اعزازی نمبروں سے پاس کر لیا تھا ڈیڑھ ہفتے بعد اس نے

آفس جوائن کرنا تھا۔ میشال، زید کے لیے ڈھیروں شاپنگ کر کے لائی تھی۔

''ڈیسنٹ حلیے میں آفس جایا کرنا۔ اب تم ایک ذمہ دار پوسٹ پر کام کرو گے۔ مجھے شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہئے''

''او کے...... میڈم'' زید نے سر تسلیم خم کیا تھا۔

''تمہارے تمام کپڑے میں نے پریس کر کے ہینگ کر دیے ہیں۔ جوتے شوز ریک میں موجود ہیں۔ موزے رومال اور ٹائیاں الگ سے رکھی ہیں۔ خبردار جو تم نے ذرا بھی اودھم مچایا'' وہ بولے جا رہی تھی اور زید اسے ایک ٹک دیکھے جا رہے تھا۔

''پھر تم نے کیا سوچا ہے؟''

''کیا'' میشال نے اس مصروف سے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پھر ٹھٹک کر فوراً ہی پلکیں جھکا گئی۔ زید کی آنکھوں میں شوق کا ایک جہان آباد تھا۔

''شادی کے بارے میں'' وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

''تمہیں پتا ہے میرا جواب کیا ہوگا'' میشال آہستگی سے کہتے ہوئے رخ موڑ گئی تھی۔

''اب کے میں انکار نہیں سنوں گا''

''پلیز زید کوئی اور بات کرو'' اس نے بھرائی آواز میں کہہ کر زید کو بے چین کر دیا تھا۔

''میرے صبر اور ضبط کو مت آزماؤ''

''ایسا نہیں ہو سکتا''

''کیوں'' زید کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئی تھیں۔

''تم وجہ جانتے ہو'' وہ بے اختیار رو پڑی''

''میں اس وجہ کو تسلیم نہیں کرتا'' زید نے بے قراری سے اس کے دونوں بازو تھام کر نرمی سے کہا تھا اس کے آنسو زید کو بے پناہ تکلیف سے دوچار کر گئے تھے۔

''تمہیں ایک صحت مند لائف پارٹنر کی ضرورت ہے زید''

''مجھے صرف اور صرف تمہاری ضرورت ہے تمہاری چاہ ہے، سنا تم نے'' وہ غصے سے بولا تھا۔

''میری زندگی کا کیا بھروسہ، نہ جانے کب سانسوں کی ڈوری ٹوٹ جائے'' میشال نے آزردگی سے کہا۔

''اور میری زندگی کی کیا گارنٹی ہے''

''زید! تم فضول ضد کر رہے ہو''

''میری محبت کو یوں بے مول مت کرو میشال!'' زید نے لب کچلتے ہوئے بے بسی سے کہا تھا اور پھر مضبوط لب و لہجے میں بولا۔

''ابھی تو میں لاہور جا رہا ہوں۔ دو دن بعد آ کر بات کروں گا۔ تم خود کو ذہنی طور پر تیار کر لو''

میشال اس کے جانے کے بعد پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی اسے کسی بھی قسم کا احساس کمتری نہیں تھا مگر اس پل اسے خود پر ترس آ رہا تھا اس بیماری نے اسے کتنا بے بس کر دیا تھا روتے روتے ایک دم ہی اس کا سانس حلق میں اٹک گیا تھا۔ سینے میں شدید ترین درد کی لہر اٹھی تھی۔ وہ سرعت سے باہر بھاگی۔ روبی اس کے زرد چہرے کو دیکھ کر فوراً گاڑی کی چابی لے کر اسے نذیراں کی مدد سے تھامے گاڑی تک لائیں۔ کچھ ہی دیر بعد گاڑی گیٹ سے باہر تھی۔

زینب بھی ان کے پیچھے ہی دوڑی تھی۔ مگر اس کے پہنچنے تک وہ جا چکی تھیں۔ اس نے نذیراں سے پوچھا تو وہ پریشانی سے بولی۔

''میشال بی بی کو دمہ کی بیماری ہے۔ ہم تو بچپن سے ہی ان کی یہ حالت دیکھ رہے ہیں''

رات کو پھپھو اور میشال کی واپسی ہوئی تھی اس وقت وہ بالکل تندرست اور ہشاش بشاش تھی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ دوپہر کو وہ اتنی شدید تکلیف سے گزر رہی تھی اسے اب پتا چلا تھا کہ کیوں سلمان انکل سے لے کر مہوش تک اس گھر کا ہر چھوٹا بڑا میشال کو خوش رکھنے کی کوشش میں رہتا ہے۔ وہ سب کی بے حد لاڈلی اور چہیتی تھی۔ مہرین آنٹی جیسی مغرور خاتون بھی میشال کے آگے پیچھے پھرتی تھیں اور پھپھو کا تو بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ سارا دن میشال کو اپنے سامنے بٹھائے رکھتیں۔

زینب نے انٹر کے بعد پڑھائی کو خیر باد کہہ دیا تھا ایک دم ہی اس کا ہر چیز سے دل اچاٹ ہو گیا تھا میشال اسی وجہ سے ہی اس سے ناراض تھی۔ سلمان انکل کو پتا چلا تو وہ بھی بے حد حیران ہوئے۔

''زینب بیٹے! کیا بات ہے آپ کالج کیوں نہیں جا رہی ہو'' وہ معمول کے مطابق سلمان کو کافی دینے کے لیے آئی تو انہوں نے اسے اپنے پاس بٹھا کر نرمی سے پوچھا تھا۔

''پڑھنے کو دل ہی نہیں کرتا'' وہ آہستگی سے بڑبڑائی تھی۔ انکل نے شاید سنا نہیں تھا۔ وہ کافی دیر اسے تعلیم کی افادیت پر لیکچر دیتے رہے تھے زینب آنسو پیتی خاموشی سے سنتی رہی۔ کیا بتاتی کہ آپ کے بیٹے کے عشق نے مجھے کسی قابل نہیں چھوڑا۔

''جب کتاب کھول کر پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں تو سامنے تمہارا چہرا آجاتا ہے۔ میں کیا کروں بہت بے بس ہوں میں'' اپنے کمرے میں آکر وہ زید کے تصور سے مخاطب ہوئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد میشال نے اس کے کمرے میں جھانکا اور پھر اسے جاگتا پا کر اندر چلی آئی تھی۔

''کیا بات ہے گڑیا! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا''

''میں ٹھیک ہوں'' اس نے سپاٹ انداز میں کہا۔

''اچھا پھر یہ کپڑے دیکھو۔ میں تمہارے لیے لائی ہوں۔ زید کی جیب خالی کروادی ہے میں نے اور مہوش نے آج'' میشال اپنی دھن میں مگن زینب کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ نہیں سکی تھی۔

''تم نہ لاتیں میرے لیے کپڑے۔ پہلے ہی پھپھو نے اتنے ڈھیر سارے بنوا کر دیے ہیں'' میشال اگرچہ اس سے بڑی تھی مگر وہ اسے نام سے ہی مخاطب کرلی تھی۔ اس وقت بھی بہترین اسٹائلش کپڑوں کو دیکھ کر بے دلی سے بولی تھی۔

''یہ دیکھو......'' اس نے بلیک کلر کا کڑھائی والا سوٹ زینب کے سامنے پھیلایا۔

''یہ کلر تمہارے گورے، سنہری رنگ پر بہت ہی سوٹ کرتا ہے'' میشال نے سادگی اور معصومیت سے کہا۔

''اچھے ہیں سارے کپڑے''

''میرا خیال ہے کہ تمہیں نیند آرہی ہے'' میشال نے اس کے گال پر چٹکی بھری۔

''ہاں''

''اوکے...... میں چلتی ہوں۔ تم اب سو جاؤ'' میشال کے جانے کے بعد وہ بے خیالی میں کتنی ہی دیر ان کپڑوں کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ پھر اس نے تمام کپڑے شاپر میں ٹھونسے اور کچھ سوچ کر زید کے بیڈروم میں آگئی۔ زید کمرے میں موجود نہیں تھا۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ زینب صوفے پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ تولیے سے بال رگڑتا اپنے ہی دھیان میں مگن گنگناتا ہوا باہر نکلا اور زینب کو اپنے کمرے میں موجود پا کر

حیران ہی تو رہ گیا تھا۔ زینب اسے دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی تھی۔

''مجھے اس خیرات کی ضرورت نہیں ہے'' اس نے شاپر زید کے بیڈ پر رکھتے ہوئے رکھائی سے کہا تھا۔

''کون سی خیرات'' زید نے تعجب سے پوچھا۔

''یہی جو میشال نے آپ کے پیسوں سے خریدی ہے'' وہ تلخی سے بولی تھی۔ زید کی آنکھوں میں ناگواری در آئی۔

''یہ سب کچھ میشال نے ہی خریدا ہے بہتر یہی ہے کہ اسے واپس کرو اور ہاں آئندہ میرے کمرے میں آنے کی جرأت مت کرنا۔ جاؤ یہاں سے'' اسے اپنی جگہ گم سم کھڑا پا کر وہ دھاڑا تھا۔ زینب منہ پر ہاتھ رکھے الٹے قدموں واپس مڑی تھی جبکہ زید غصیلے تیوروں سے اس کی پشت کو گھورتا رہا اور پھر تولیہ صوفے پر پٹخ کر باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

''ہم اپنی بیٹی کو لینے کب آئیں'' مہرین اور سلمان نے بڑی چاہت سے میشال کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

''تایا ابو! آپ اتنے پیار سے کہہ رہے ہیں۔ میں ابھی چلتی ہوں آپ کے ساتھ۔ چار سیڑھیاں ہی تو چڑھنی ہیں'' ان کی بات کا مطلب سمجھے بغیر میشال نے سادگی سے کہا تھا۔ رحمان اور روبی کے ساتھ مہرین نے بھی قہقہہ لگایا تھا۔

''نہ جی...... ہم تو آپ کو خوب ہی دھوم دھام سے اوپر لے کر جائیں گے'' سلمان نے اسے چھیڑا تھا وہ جھینپ کر اٹھ گئی تھی۔

دونوں طرف زور و شور سے شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ان دنوں گھر میں خوب ہی رونق لگی تھی۔ زید اور میشال کے کزنز روزانہ ہی شام کو آجاتے تھے مہوش نے اوپر ڈھولکی منگوا کر گیتوں کی پریکٹس شروع کردی تھی۔ سحرش آپی بھی دن میں تین تین چکر لگاتیں نیچے جہیز کی تیاریاں ہو رہی تھیں اوپر بری کی۔ ہر کوئی مصروف اور مسرور تھا۔

اک سناٹا تھا تو صرف زینب کے اندر۔ وہ خالی خالی نظروں سے ہر شے کو بغور دیکھتی تھی اس کے اندر گویا صف ماتم بچھ گئی تھی۔ رات کی تاریکی میں اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگتا رہتا تھا اور دن بھر لبوں پر مسکان سجائے وہ ادھر ادھر دوڑتی۔

شادی میں صرف بائیس دن رہ گئے تھے مہرین اور روبی دونوں صبح سویرے ہی جیولر کی دکان پر چلی گئی تھیں۔ مرد حضرات دفتروں میں جبکہ وہ اور عیشال گھر پر ہی تھیں۔ وہ کچن میں بریانی کے لیے چکن دھونے میں مصروف تھی جب اسے عیشال کے کراہنے کی ہلکی سی آواز آئی۔ زینب نے توجہ نہیں دی تھی۔ ٹونٹی بند کر کے اس نے گیلے ہاتھ صاف کیے اور پھر پیاز کاٹنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد اسے ایک مرتبہ پھر عیشال کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ یقیناً زینب کو ہی بلا رہی تھی۔ اس نے پیاز اور چھری پلیٹ میں رکھی اور پھر تیزی سے عیشال کے کمرے میں آئی۔ اس کا شک درست تھا۔ عیشال بیڈ پر لیٹی ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔

''عیشال کیا ہوا؟'' زینب نے اس کے گرم ہاتھ کو تھاما۔ پچھلے چار پانچ دن سے اسے بخار بھی تھا۔

''زین......مم، میرا سانس'' وہ اٹک اٹک کر بمشکل بولی تھی۔ زینب اس کی بگڑتی حالت دیکھ کر گھبرا اٹھی۔

''عیشال......تم پانی پیو گی'' اس کے ہاتھ پاؤں مڑ گئے تھے جبکہ ہونٹ نیلے پڑ رہے تھے۔ زینب نے گھبراتے ہوئے سائیڈ ٹیبل سے گلاس اٹھایا اور واش روم سے پانی بھر لائی۔

''پانی پیو عیشال'' زینب نے اس کا سر گود میں رکھا اور گلاس لبوں سے لگا دیا۔ دو گھونٹ بھرتے ہی عیشال کو شدید ترین کھانسی آ گئی تھی اس کے چہرے پر مزید تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔

''ان......ہیلر......لاؤ'' عیشال نے بمشکل کہا تھا زینب نے کپکپاتے ہاتھوں سے تمام درازیں کھول کر ان ہیلر ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر اسے ان ہیلر کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ دکھائی دیتا بھی کیسے اس کی آنکھوں پر تو پٹی بند چکی تھی۔

''عیشال! ان ہیلر کہاں رکھا ہے؟'' وہ بوکھلا کر ایک مرتبہ پھر اس کی اوپر جھکی تھی۔

''ادھر......دیکھو'' اس نے دوائیوں کی میز کی طرف اشارہ کیا تھا۔ زینب بھاگتے ہوئے ٹیبل تک آئی مگر ان ہیلر وہاں بھی نہیں تھا۔

''بلیک......بوتل اٹھا لاؤ وہ رکھی ہے'' عیشال کی سانسیں بالکل معدوم ہو رہی تھیں۔ نہ جانے اس نے کون سی دوائی کی بوتل کی طرف اشارہ کیا تھا۔ زینب مطلوبہ بوتل اٹھا لائی اور پھر اس نے بغیر سوچے سمجھے بوتل عیشال کے منہ سے لگا دی۔ عیشال کو ایک مرتبہ پھر شدید قسم کا اچھو لگ گیا تھا۔ اس نے بوتل پر چپکے لیبل کو پڑھنے کے باوجود دوائی عیشال کو پلا دی۔

''ممی......زید کو بلاؤ''

زینب تقریباً دوڑتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی تھی۔ اس نے زید کے کمرے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ پھر کچھ سوچ کر واپس مڑ آئی۔

''میں اس کے کمرے میں نہیں جاؤں گی کبھی نہیں''

نفی میں سر ہلاتے وہ ایک مرتبہ پھر عیشال کے پاس آ گئی تھی۔ سامنے والی دیوار پر لکھا ڈاکٹر حشمت کا نمبر زیر لب دہرا کر اس نے ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگی۔ فون کرنے کے بعد وہ ایک مرتب پھر عیشال کے قریب آ گئی تھی مگر اس کی ناک سے بہتے خون اور بند آنکھوں نے اسے وحشت زدہ سا کر دیا تھا وہ عیشال کو جھنجوڑتے ہوئے مسلسل چیخ رہی تھی جب حواس باختہ سی مہرین نے کمرے میں قدم رکھا۔

''کیا ہوا ہے عیشال کو''

''پپ......پتا نہیں'' وہ اتنی خوفزدہ تھی کہ اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا تھا۔ مہرین مسلسل عیشال کو جھنجوڑ رہی تھی کچھ دیر بعد روبی بھی آ گئی تھیں پھر فوراً ہی سلمان اور رحمان کو فون کر کے بلایا گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد عیشال کو ہسپتال لے گئے مگر ٹھیک پینتیس منٹ بعد ان کی واپسی ہو گئی۔

عیشال مر گئی۔ کسی زہریلی دوا نے اس کے معدے پر شدید انفیکشن کر دیا تھا وہ ابھی تک عیشال کے کمرے میں ساکت سی بیٹھی تھی۔ باہر سے رونے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد دروازہ دھاڑ سے کھلا اور تیز قدموں سے چلتی مہرین اس کے قریب آئیں۔

''تو نے مار دیا ہے ہماری عیشال کو'' انہوں نے اس کے رخساروں پر تھپڑوں کی برسات کر دی تھی۔

''بے غیرت، ذلیل وہ تجھ سے ان ہیلر مانگ رہی تھی۔ تو نے اسے وہ بھی نہ دیا۔ اس کی تڑپ کا تماشا دیکھتی رہی تھی''

''مم......مجھے ملا ہی نہیں'' وہ روتے ہوئے بلند آواز میں بولی تھی۔ مہرین اسے مار مار کا نڈھال ہو گئیں اسی پل روتی دھوتی مہوش ماں کے لیے پانی لے آئی تھی اس نے پانی کا گلاس ماں کے لبوں سے لگایا تو اس کی نظر بیڈ کے قریب کارپیٹ پر پڑے ان کے ہیلر پر جم کر رہ گئی تھیں مہرین نے بھی اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تھا اور ایک مرتبہ پھر ان پر جنون سوار ہو گیا۔

''اس نے مارا ہے۔ عیشال کو یہ قاتلہ ہے'' وہ چلا چلا کر کہہ رہی تھیں۔

"مہرین! ہوش کرو یہ کیا پاگل پن ہے" سلمان رحمت کا فرشتہ بن کر آئے تھے۔ انہوں نے بمشکل ہی زینب کو مہرین کے چنگل سے چھڑوایا۔ کچھ دیر بعد صدمے سے نڈھال وحشت زدہ آنکھیں لیے زید بھی آ گیا تھا۔

"زید! اس نے مارا ہے میشال کو یہ قاتلہ ہے۔ یہ قاتلہ ہے" زمین پر گرنے سے پہلے اس نے چند الفاظ مزید سنے تھے۔

☆☆☆

اسے مرے ہوئے دس دن ہو گئے تھے مگر اس گھر سے اول روز کی طرح ہی چیخوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں ابھی تک یقین نہیں آتا تھا کہ وہ پھولوں جیسی کومل لڑکی مر گئی ہے۔ جس کی ٹھیک بارہ دن بعد شادی تھی اس گھر کے در و دیوار سے وحشت چھلکتی تھی وہ مہرین اور روبی سے خوفزدہ کمرے میں دبکی رہتی اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اگر مزید چند دن اس ماحول میں رہی تو ضرور مر جائے گی۔ اسی لیے اس نے یہاں سے ہمیشہ کے لیے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جس دن وہ یہاں سے جانے والی تھی اسی صبح رحمان انکل نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ سلمان بھی ان کے قریب صوبے پر کسی گہری سوچوں میں گم بیٹھے تھے۔

"بھائی جان! آپ زینب بیٹی سے بات کریں۔ میں ابھی آتا ہوں" رحمان نے بھرائی آواز میں کہا تھا اور پھر خود تیز قدموں سے چلتے ہوئے باہر نکل گئے۔

"انکل! اللہ کی قسم میں نے میشال کو نہیں مارا میں تو" رحمان کے جاتے ہی وہ ان کے قدموں میں بیٹھ کر بے تحاشا رو دی تھی۔ وہ خوفزدہ تھی اور اپنے خوف کو سب پر ظاہر کرنا چاہتی تھی

"جانتا ہوں میں بیٹا! تم پلیز خاموش ہو جاؤ" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"سب لوگ یہی کہتے ہیں" وہ لفظوں سے کھیل رہی تھی حالانکہ اسے لفظوں سے کھیلنا نہیں آتا تھا۔

"جو کہتا ہے اسے کہنے دو۔ لوگوں کی زبانیں روکی نہیں جا سکتیں۔ تم بتاؤ تمہارا دل کیا کہتا ہے؟"

"کک..... کیا مطلب؟" اس نے خوفزدہ نظروں سے سلمان انکل کی طرف دیکھا تھا۔

"زید سے محبت کرتی ہو" سلمان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ بے ساختہ نگاہیں جھکا گئی تھی۔ "میرے دل کی آواز ان تک کیسے پہنچی" زینب نے حیرانی سے سوچا۔

"میں کیا پوچھ رہا ہوں؟"

"جی" وہ لرزیدہ آواز میں بولی تھی انہوں نے طویل سانس کھینچ کر سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا تھا۔

"اگر اس سے محبت کرتی ہو تو اسی محبت سے اسے سمیٹ لو۔ وہ بہت بکھر گیا ہے۔ ٹوٹ گیا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ میشال کی جدائی اسے "دیوانہ" نہ بنا دے۔ میں اپنا اکلوتا بیٹا کھونا نہیں چاہتا ہوں۔ اس بڑھاپے میں مزید کوئی صدمہ برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں" زینب نے حیرانی سے ان کے چہرے پر پھیلے کرب کو دیکھا تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ زید کی اور تمہاری شادی کر دی جائے تم جانتی ہو کہ زید، میشال سے کس قدر محبت کرتا ہے اگر کسی اور لڑکی سے اس کی شادی کی تو یقیناً وہ یہ سب برداشت نہیں کر پائے گی۔ کوئی بھی بیوی شوہر کی محبت میں شراکت گوارا نہیں کرتی۔ مگر تمہارا معاملہ دوسرا ہے۔ تم زید کے مزاج سے واقف ہو۔ اس سے محبت بھی کرتی ہو مجھے امید ہے کہ تم دونوں اچھی زندگی گزارو گے۔ یادوں کے عکس دھندلے پڑے تو وہ خود بخود تمہاری طرف متوجہ ہو جائے گا بس کچھ وقت درکار ہے دیکھ لینا ایک دن وہ تمہیں ویسی ہی محبت دے گا جس کی آرزو ہر بیوی کو ہوتی ہے"

"یہ سب کیسے ہو سکتا ہے" اس نے گھبرا کر کہا حالانکہ دل تو خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔

"کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا بس تم ذہنی طور پر خود کو تیار کر لو۔ رحمان کی بھی یہی خواہش ہے" وہ پرسوچ انداز میں بولے تھے اور پھر طویل جھڑپوں، بحث و مباحثے کے بعد نتیجہ حسب منشا تھا رحمان اور سلمان کو بیک وقت دو دو محاذوں پر لڑنا پڑ رہا تھا۔

دو ماہ بعد بے حد سادگی سے زید اور اس کا نکاح ہو گیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسے زید کے دل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے بڑا طویل انتظار کرنا ہے اور وہ بڑی خوش اسلوبی سے اس وقت کا انتظار کر رہی تھی مگر نہ جانے کب کیسے اور کس طرح مہوش کے ہاتھ اس کی ڈائری لگ گئی تھی جسے اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ زید کے حوالے کر دیا تھا۔

اس ڈائری میں میشال سے نفرتوں کی داستان درج تھی اسے زید کے ساتھ ساتھ عزیز از جان پھپھو کی نفرتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا پھر میشال کی وفات کے دو سال بعد روڈ ایکسیڈنٹ میں سلمان انکل اور رحمان انکل جاں بحق ہو گئے۔ روبی پھپھو کو یکے بعد دیگرے پہنچنے والے

صدمات نے ادھ موا کر دیا تھا اور......

☆☆☆

"میم...... بے بی رو رہا ہے۔ اسے فیڈ کروائیں" وہ پچھلے دو گھنٹوں سے ایک ہی پوزیشن پر بیٹھی اپنی گزشتہ زندگی کو سوچے جا رہے تھی جب نرس نے ننھے اعیان کو اس کی گود میں دے کر چونکا دیا تھا۔ تب طویل سانس خارج کرتے ہوئے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

چھ دن بعد اسے ڈسچارج کر دیا گیا تھا گھر آ کر ایک مرتبہ پھر روٹین لائف شروع ہو گئی تھی گھر کے کام کاج، بچوں کی مصروفیت اب اسے سوچنے کا بھی وقت نہیں ملتا تھا۔

پھپھو اگرچہ مکمل صحت یاب نہیں ہوئی تھیں اس کے باوجود وہ سارا دن مشعل کے ساتھ مصروف رہتیں۔ مشعل اور اعیان کی قلقاریوں نے ان کے غمزدہ دل کو اچھا خاصا بہلا دیا تھا کبھی کبھی ان کی طبیعت خراب ہو جاتی تھی پہلے کی طرح دورہ پڑتا تو پھر گھنٹوں ہی وہ ہوش خرد سے بے گانہ رہتی تھیں۔

وقت اپنی چال روانی سے چل رہا تھا ان دنوں ایک مرتبہ پھر مہوش کے رشتے کے لیے کچھ لوگ آئے تھے اس دفعہ مہوش نے انکار نہیں کیا تھا۔ عون اس کا کلاس فیلو تھا مہرین بیٹی کی آنکھوں کے رنگ دیکھ کر خاموش رہ گئی تھیں۔ زید سے مشورے کے بعد انہوں نے ہاں کر دی دو ماہ بعد شادی کی تاریخ رکھی گئی تھی سحرش اور مہرین آنٹی منگنی کی چھوٹی سی رسم کرنے لڑکے والوں کے گھر گئیں تو واپسی پر ان دونوں کے موڈ کچھ آف تھے۔

"مہوش کا تو لگتا ہے دماغ چل گیا ہے" سحرش کی بڑبڑاہٹیں عروج پر تھیں انہوں نے کانوں میں سے ایئر رنگز اتار کر ٹیبل پر پٹخے، پرس صوفے پر اچھالا اور خود کارپٹ پر ڈھے گئیں۔

"سات مرلے کے مکان میں تین تین فیملیز آباد ہیں اوپر سے ڈھیروں کے حساب سے بچے نندیں دیور ساس، سسر، کیسے رہوگی اس چڑیا گھر میں"

"عون کو آفس کی طرف گھر ملا ہے" مہوش نے لاپرواہی سے کہا تھا۔

"میں کہتی ہوں مہوش ایک مرتبہ پھر سوچ لو" مہرین نے بھی خاموشی کو توڑتے ہوئے فکرمندی سے کہا تھا۔

"محبت اندھی ہوتی ہے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ان دو "دیوانوں" نے تو ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا" سحرش کا اشارہ زید اور مہوش کی طرف تھا اس نے

بڑی بہن کی طرف دیکھ کر بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپی! محبت اندھی ہی ہوتی ہے"

"تمہاری محبت کا دم بھرنے والا کل کو نظریں پھیر گیا تو پھر ہم سے کچھ نہ کہنا" سحرش بھنا اٹھی تھیں۔

"جو مرضی کہہ لیں شادی تو میں نے عون سے ہی کرنی ہے کل جو ہوگا دیکھا جائے گا" مہوش کا اطمینان قابل دید تھا۔

"اس فضول تکرار کو چھوڑو۔ پہلے ہی دن کم ہیں۔ ابھی جہیز کی تیاری بھی کرنا ہے" مہرین انہیں آپس میں الجھتا دیکھ کر بےزاری سے بولی تھیں۔

"مما! فضول چیزیں خریدنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ مجھے چیک دے دیجیے گا"

"ایسی بے حیا دلہن نہیں دیکھی اب تک" سحرش نے تلملا کر کہا تھا۔

"ایک تو میں آپ کو خرید و فروخت کے جھنجھٹ سے بچا رہی ہوں اوپر سے باتیں بھی سننا پڑ رہی ہیں"

مہوش نے مصنوعی خفگی سے کہتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

"مشعل کے رونے کی آواز آ رہی ہے نیچے سے۔ یہ زینب کہاں ہے؟"

"کسی کونے میں بیٹھی سوگ منا رہی ہوگی اپنی ناکام محبت کا" مہوش نے پاؤں جھلاتے ہوئے مزے سے کہا تھا۔

"بک بک نہ کرو اور جا کر شانزے کو لہنگے کا ڈیزائن، کلر وغیرہ نوٹ کروا دو۔ شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں" سحرش نے تیکھے لہجے میں کہہ کر شولڈر بیگ اٹھایا اور تیز تیز قدم اٹھاتی سیڑھیاں اتر گئیں۔

"شادی کے کارڈ وغیرہ چھپ گئے تھے زینب نے چپکے سے ایک کارڈ اٹھا کر اس پر علینہ کا نام لکھا اور پوسٹ کر دیا۔

زید بہن کی شادی پر بھی نہیں آیا تھا۔ اسے جوزیان سے ملنے کی تھوڑی بہت امید تھی وہ بھی ختم ہوتی دکھائی دینے لگی تھی۔

علینہ مہندی کے فنکشن میں نہیں آئی تھی۔ اتنے ڈھیر سارے مہمانوں میں زینب کو صرف اسی کا ہی انتظار تھا۔

بارات والے روز وہ مایوس سی اعیان کو گود میں اٹھائے تھپک تھپک کر سلا رہی تھی جب علینہ نے اس کے قریب آ کر اسے چونکا دیا۔

"بے وفا خاتون! کل کیوں نہیں آئیں تم" زینب نے خفگی سے اس سے گلے ملتے ہوئے کہا تھا۔

"دھیرج...... دھیرج ابھی بتاتی ہوں پہلے یہ بتاؤ کہ یہ کون سے صاحب کو اٹھا رکھا ہے"

"یہ اعیان صاحب ہیں" وہ ہولے سے مسکرائی۔

"کب تشریف آوری ہوئی ہے ان کی، تم نے بتایا ہی نہیں" علینہ نے خفگی سے کہا۔

"ان کی بہن محترمہ بھی ہیں"

"کیا ٹوئنز بچے ہوئے ہیں۔ پھر ڈبل ڈبل مبارک ہو" علینہ نے اعیان کو گود میں لے کر بے اختیار پیار کیا تھا اس پل اس کے چہرے پر عجیب سی محرومی کرب بن کر پھیل گئی تھی۔

"علینہ! میں دو دن بعد تمہارے گھر آؤں گی" اس نے علینہ کے بالکل قریب، کان کے پاس جھکتے ہوئے کہا تھا اور پھر تیزی سے مہرین کی طرف بڑھ گئی تھی جو کہ اسٹیج پر کھڑی اسے آوازیں دے رہی تھیں۔

☆☆☆

ولیمے سے اگلے دن تمام مہمان اپنے اپنے گھروں کو سدھار گئے تھے زینب بچوں کو نذیراں کے حوالے کر کے صبح صبح ہی علینہ کی طرف آ گئی تھی۔ اس کا چھوٹا سا مگر بے حد خوبصورت گھر سرسبز بیلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ملازمہ کی ہمراہی میں وہ ڈرائنگ روم تک آئی تھی کچھ ہی دیر بعد علینہ میٹھی سی مسکان لبوں پر سجائے آ گئی۔

"یہ آج سورج کہاں سے نکلا ہے؟ اتنے معزز لوگ ہمارے گھر آئے ہیں۔ اکیلی کیوں آئی ہو۔ ریان کو بھی لے آتیں"

"ریان ہوتا تو لے آتی ناں" زینب کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"کیا مطلب"

"زید، ریان کو لے کر چلا گیا ہے"

"کیوں"

"یہ پڑھ لو، سارے جواب مل جائیں گے پھر مجھ بتانا کہ میرا کتنا گناہ ہے میں کس حد

تک مجرم ہوں سب کہتے ہیں میں میثال سے جلتی تھی اس سے حسد کرتی تھی یہ سچ ہے کہ میں میثال سے جلنے لگی تھی۔ میں نے اسے بددعائیں بھی دی ہیں مجھے لگتا ہے کہ میری بددعا اس کی خوشیوں کو کھا گئی ہے میں چاہتی تھی کہ میثال کہیں دور چلی جائے اس جگہ جہاں زید اسے دیکھ نہ پائے وہ زید کی نظروں سے اوجھل ہو جائے میں نے یہ خواہش تو کبھی نہیں کی تھی کہ وہ مر جائے" زینب نے بے تحاشا روتے ہوئے پنک جلد والی ڈائری اس کی طرف بڑھا دی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو زینب، رکو تو سہی" علینہ اسے باہر کی طرف تیزی سے نکلتے دیکھ کر بے اختیار اس کے پیچھے لپکی تھی مگر اس کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ بیرونی دروازہ عبور کر گئی۔ علینہ حیران پریشان سی واپس پلٹ گئی تھی۔

دوسرے دن بہت ہی ڈرتے ڈرتے اس نے علینہ کا نمبر ڈائل کیا تھا اسے یقین تھا کہ علینہ اب کبھی اس سے بات نہیں کرے گی وہ بھی اس سے نفرت کرنے والے لوگوں میں شامل ہو جائے گی۔

"مجھے علینہ سے بات کرنی ہے" اس نے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کر کے آہستگی سے کہا تھا۔

"ہوں...... بولو کیا کہنا ہے"

"تم علینہ ہی ہو نا" زینب نے بے یقینی سے دو مرتبہ استفسار کیا تھا۔

"ہاں......"

"تمہیں مجھ سے نفرت محسوس نہیں ہو رہی علینہ! کیا تم مجھ سے بات کرنا پسند کرو گی"

"میں تم سے نفرت کیوں کروں گی اور جو لوگ تم سے نفرت کرتے ہیں وہ سب پاگل ہیں اور تمہیں بھی پاگل کر دینا چاہتے ہیں" علینہ اس کے سسکنے پر چیخ کر بولی تھی۔

"پتا ہے علینہ! پہلے مجھے زید کی محبت کی طلب تھی میں نے ہر دعا میں صرف اور صرف زید کو مانگا تھا اس کی محبت کی بھیک اللہ سے مانگی تھی مگر اب" وہ لب کچلتے ہوئے اک پل کو رکی۔

"اب میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ مجھ سے میرا شعور چھین لے۔ میرے ہوش حواس کھو جائیں میں اس آگہی کے کرب سے آزاد ہو جاؤں۔ میں ضمیر کی عدالت سے بری ہو جاؤں۔ مجھے لگتا ہے کہ میرا دل سلگ سلگ کر راکھ ہو گیا ہے میثال مری ہے تو اس کی میت پر رونے والے بہت تھے میں مروں گی تو مجھ پر رونے والا کوئی نہیں ہوگا"

''خود کو ماضی کی قید سے آزاد کر دو زینب' کوئی شخص طاقت نہیں رکھ سکتا کہ ایک سانس بھی کسی دوسرے شخص کی کم یا زیادہ کر دے' علینہ نے بے حد تحمل سے کہا تھا۔

''میں ایسا نہیں کر سکتی، یشال مجھے ایسا نہیں کرنے دیتی'' وہ ٹوٹے لہجے میں چیخ کر بولی تھی۔

''اس بات کو ذہن سے نکال دو کہ تم نے یشال کو مارا ہے''

''کیسے بھولوں جبکہ میں نے'' کچھ کہتے کہتے وہ اک لمحے کے لیے رک گئی تھی۔ اس کی سانسیں دھونکنی کی مانند چل رہی تھیں۔ علینہ نے اک طویل سانس کھینچا۔

''اگر تم کارپٹ پر گرے ان ہیلر کو اٹھا کر یشال کو دے دیتیں تو وہ نہ مرتی۔ یہی بات تمہیں سکون لینے نہیں دیتی نا۔ تو زینب، اگر تم ان ہیلر اسے دے بھی دیتیں تو اس نے پھر بھی مرنا تھا۔ اس کی سانسیں پوری ہو چکی تھیں وہ اتنی ہی عمر لکھوا کر آئی تھی''

''میں خود کو کیسے معاف کروں میں یشال کی مجرم ہوں'' اس نے گویا اعتراف جرم کر لیا تھا۔

''تم سے گناہ سرزد ہو گیا تھا پھر تم اس پر شرمندہ تھیں۔ مجرم وہ ہوتا ہے جو گناہ کر کے پشیمان نہ ہو' علینہ بہت آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے سے اس کے دل اور ضمیر کا بوجھ کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس نے پہلی مرتبہ جب زینب کو دیکھا تھا تو وہ اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی اس کی آنکھیں اس کے چہرے کے تاثرات اسے نارمل عورت ظاہر نہیں کر رہے تھے سپاٹ چہرہ اور کھوئی کھوئی بے رنگ آنکھیں۔ پہلی نظر میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس لڑکی کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ماہر نفسیات تھی۔ بہت سے ایسے چہرے اس کی نظروں کے سامنے سے روزانہ گزرتے تھے مگر اس لڑکی میں نہ جانے کون سی کشش تھی کہ وہ بے اختیار اس کی طرف کھنچتی چلی گئی۔

زینب سے ملنے کے بعد تو اس کے اندر، اسے جان لینے کی بے چینی بڑھ گئی تھی اسے صرف چند لمحوں میں ہی اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ لڑکی اپنے دل کے نہاں خانوں میں کوئی راز چھپائے بیٹھی ہے ایسا تکلیف دہ راز جو اسے مکمل خوش ہونے سے روکتا ہے اس کے لبوں کو حقیقی مسکان سے آشنا نہیں ہونے دیتا۔

زینب، علینہ سے کھل کر بات کرنے کے بعد پرسکون ہو گئی تھی۔ ایسا سکون اور

اطمینان جو سب کو نظر آنے لگا تھا مہرین بھی اس کے مطمئن انداز کو دیکھ کر حیران تھیں اس کی وحشت زدہ آنکھوں میں اطمینان کے رنگ چھلکنے لگے تھے مہرین، سحرش کچھ بھی کہتیں۔ اس نے پروا کرنا چھوڑ دی تھی خود کو بچوں کی معصوم قلقاریوں میں گم کر لیا تھا اس نے مگر، کبھی کبھی دل میں اک ٹیس سی اٹھتی تھی ریان کی صورت نظروں کے سامنے پھرتی تو وہ بے قرار سی ہو اٹھتی تھی۔

اس دن مشعل کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی موسم بدلا تو دونوں بچوں کو ہی بخار، زکام نے گھیر لیا اعیان تو اب قدرے بہتر تھا البتہ مشعل ابھی بالکل صحت یاب نہیں ہوئی تھی۔

چائلڈ اسپیشلسٹ ڈاکٹر قمر سے مشعل کا چیک اپ کروا کر وہ جوں ہی ہسپتال کے احاطے سے نکلی تو نگاہ اک جانے پہچانے چہرے پر پڑی تھی زینب کے قدم زنجیر پا ہو گئے وہ تقریباً بھاگتے ہوئے اس تک پہنچی تھی سنگی بینچ پر بیٹھی نمرہ ارد گرد کے تمام مناظر سے بے خبر نہ جانے کن سوچوں میں الجھی ہوئی تھی کہ زینب کو دیکھ کر بھی نہ چونکی۔

''نمرہ تم یہاں'' اس نے کپکپاتی آواز میں بے قراری سے نمرہ کو جھنجوڑا، نمرہ نے ٹھٹک کر زینب کی طرف دیکھا تھا اور پھر سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''یہ تمہارے چہرے کو کیا ہوا ہے؟'' اس کے دائیں جھلسے رخسار پر جوں ہی اس کی نگاہ پڑی تو زینب نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

''جل گئی تھی'' نمرہ نے سرد آواز میں کہہ کر نگاہیں اس کے چہرے پر جما دی تھیں۔

''کک...... کیسے؟''

''تم بتاؤ، کیسی گزر رہی ہے پہن اوڑھ تو اچھا رکھا ہے۔ لگتا ہے خوب ہی ٹھاٹ باٹ ہیں لوگ بھی قسمت کے خوب دھنی ہیں۔ مٹی پکڑیں تو وہ بھی سونا بن جاتی ہے ہمارا سونا بھی لوہے کے برابر ہے'' زینب کے سوال کو نظر انداز کر کے اس نے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔

''گھر والے بھی ادھر آ گئے ہیں''

''کون سے گھر والے، او...... اچھا تم امی، ابو کے بارے میں پوچھ رہی ہو۔ وہ مر کھپ گئے ہیں۔ ماجد باہر چلا گیا تھا اور باقیوں کا مجھے نہیں پتا'' نمرہ نے کٹیلے لہجے میں کہتے ہوئے قہقہہ لگایا ''چھوڑو اس ذکر کو یہ بتاؤ تم کیسی ہو یہ بیٹی ہے تمہاری'' اس نے کھینچ کر مشعل کو زبردستی اپنے ساتھ لپٹایا تھا۔

''نمرہ! تم یہاں کس کے پاس ہوتی ہو؟'' زینب نے روتی ہوئی مشعل کو گود میں لے

کرتھکا تو وہ خاموش ہوگئی وہ ایک مرتبہ پھر خوفزدہ نظروں سے نمرہ کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

''تنہا'' اس نے بار بار چہرے پر بیٹھی مکھی کو اڑایا۔

''جمال کہاں ہوتا ہے''

''دبئی چلا گیا ہے مجھے طلاق دے کر اس نے وہاں شادی کر لی ہے'' وہ ایک مرتبہ پھر مسکرائی۔

''تم کیسے جل گئی ہو'' زینب اپنی حیرانی پر بمشکل قابو پاتے ہوئے بولی تھی۔

''اسی خبیث نے جلا دیا تھا'' نمبرہ نے نفرت سے کہا۔

''کس جگہ رہتی ہو'' اس نے بے حد ہمدردی سے اس کے ہاتھ کو نرمی سے تھاما تھا۔

''ڈیفنس میں، کوٹھی ہے میری، گاڑی ہے، نوکر چاکر ہیں، بینک میں بڑا پیسہ جمع ہے۔ مجھے کسی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ تم جاؤ اب چلی جاؤ'' نمرہ نے چیخ کر کہا تھا اور پھر تیز قدموں سے چلتی ہوئی ہسپتال کی شاندار عمارت کی طرف بڑھ گئی جبکہ زینب کی ٹانگوں میں گویا جان ہی باقی نہیں رہی تھی۔

''یا اللہ! خواب دیکھنے کی اتنی کڑی سزا ملتی ہے کیا'' پارکنگ کی طرف سست قدموں سے بڑھتے ہوئے وہ بے اختیار رو دی تھی۔ خوابوں اور اندھی خواہشوں کی طلب مین بڑا فرق ہوتا ہے اور یہ دو عورتیں اس فرق سے ناواقف تھیں۔

☆☆☆

پھپھو کو معمول کے مطابق دورہ پڑا تھا اور اسی دورے کی حالت میں ان کی روح اور سانس کا رشتہ ٹوٹ گیا۔

زید کا نیا ایڈریس ان کے پاس نہیں تھا اسی لیے پھپھو کے مرنے کی اطلاع اسے نہیں دی جا سکی تھی۔ پھپھو کی وفات کے بعد وہ دونوں ہی اتنے بڑے گھر میں تنہا رہ گئی تھیں۔ مہرین آنٹی بھی اب خاموش خاموش رہنے لگی تھیں اگر اعیان اور مشعل کی آوازیں ''زید ولا'' میں نہ گونجتیں تو یہ گھر قبرستان سے کم نہیں لگتا تھا۔

بچے دونوں اسکول جانے لگے تھے بچوں کو اسکول بھیج کر وہ خود کو مصروف رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی کام چھیڑ لیتی تھی کبھی کبھی مہرین آنٹی بھی تنہائی سے گھبرا کر اس کے پاس آ بیٹھتیں ہفتے میں ایک دو مرتبہ سحرش آپی اور مہوش بھی چکر لگا لیتی تھیں۔

علینہ کے چلے جانے کے بعد زینب ایک مرتبہ پھر اپنے خول میں سمٹ گئی تھی جانے سے پہلے علینہ آخری مرتبہ اس سے ملنے کے لیے آئی تھی اس دن نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں بے حد سرخ اور سوجی سوجی سی تھیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کئی گھنٹوں سے لگاتار روتی رہی ہے زینب نے پہلے پہل یہی سمجھا تھا کہ شاید اس کی طبیعت خراب ہے۔ اس کے پوچھنے پر وہ گویا پھٹ پڑی تھی۔

''تم سمجھتی ہو کہ اس پوری دنیا میں سوائے تمہارے کوئی بھی غمزدہ نہیں ہے۔ باقی سب خوش ہیں، مطمئن ہیں۔ تو یہ سب جھوٹ ہے کچھ لوگ غموں کے اشتہار لگا کر سب کو بتا دیتے ہیں کچھ چہرے اندر کی کیفیات بتا دیتے ہیں مگر بعض لوگ میرے جیسے بھی ہوتے ہیں جو ہر درد، ہر دکھ پر تنہائی میں بیٹھ کر روتے ہیں، محفلوں میں دیکھ کر انہیں کوئی جان ہی نہیں سکتا کہ دل پر کیسے کیسے گھاؤ لگے ہیں۔

تم اس بات پر روتی ہو کہ تمہارا شوہر تم سے محبت نہیں کرتا اور میں اس پر نوحہ کناں ہوں کہ میرا شوہر مجھ سے بہت محبت کرتا ہے مگر وہ مجھے اولاد کی خوشی نہیں دیتا چار مرتبہ اپنے ہاتھوں سے اپنے بچوں کا قتل کر چکی ہوں۔ تم خوش نصیب ہو کہ تم تین بچوں کی ماں ہو تمہارے پاس جینے کا زندہ رہنے کا ایک مقصد ہے تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے کے لیے تمہاری اولاد موجود ہے مگر میں نقشم کی اس کھوکھلی محبت کے سہارے کب تک جیوں گی۔ میرے سامنے منزل تو ہے مگر راستہ اندھیرے میں ڈوبا ہے جبکہ تمہارے پاس تو دو ننھے منے جگنو ہیں ان کی ہمراہی میں بہت آسانی کے ساتھ سفر تمام کر لو گی اور میں تو بالکل تنہا ہوں نہ کوئی جگنو ہے نہ دیا ہے اور نہ ہی کوئی روشنی''

علینہ تو چلی گئی تھی البتہ اس کے لیے آگاہی کے کئی در وا کر گئی اس کے میاں کی پوسٹنگ کوئٹہ ہوگئی تھی پانچ چھ سال تک ان کا ایک دوسرے کیساتھ رابطہ رہا تھا۔ اس کے بعد علینہ کے خط آنا بند ہو گئے تھے زینب بھی اعیان اور مشعل میں ایسا کھوئی تھی کہ وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہو سکا تھا وہ پیچھے مڑ کر دیکھتی تو حیران ہی رہ جاتی کہ اس نے اتنا طویل سفر طے کر لیا تھا سحرش آپی کے بیٹے حنان نے یونی ورسٹی میں ٹاپ کیا تھا اس کے اعزاز میں سحرش آپی نے بڑے پیمانے پر فنکشن ارینج کیا انہوں نے تقریباً تمام ہی دور نزدیک کے رشتے داروں کو انوائٹ کیا تھا۔

صبح صبح حنان کو دیکھ کر زینب حیران ہی تو رہ گئی تھی وہ بہت کم ان کے گھر آتا تھا وہ بھی گھڑی دو گھڑی کے لیے نانوں کو سلام کیا، زینب سے پیار لیا اور یہ جا وہ جا۔ اس وقت وہ

مہرین سے ملنے کے بعد لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا تھا اور بڑے ہی مگن انداز میں ٹی وی کے ریموٹ سے کھیلنے لگا۔

رات کو بچوں نے قیمے والے پراٹھے کھانے کی فرمائش کی تھی زینب اس وقت ان کا فرمائشی ناشتا بنا رہی تھی پہلے قیمہ ابال کر کوٹا اور پھر آٹا گوندھ کر فریج میں رکھا ساتھ ساتھ وہ کن انکھیوں سے حنان کو بھی دیکھے جا رہی تھی دو خستہ سے پراٹھے بنا کر وہ لاؤنج میں چلی آئی تھی۔

''حنان! ناشتا کرلو''

''نہیں مامی، موڈ نہیں ہے'' وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا ایک دم ہی چونک کر بولا۔

زینب سر ہلاتے ہوئے اٹھ گئی تھی اور پھر اس کے لیے مینگو شیک بنا لائی۔

''اچھا یہ تو پی لو نا'' اس نے زبردستی حنان کے ہاتھ میں گلاس تھمایا تھا کچھ ہی دیر بعد مشعل اور اعیان آنکھیں مسلتے آگے پیچھے آگئے تھے مشعل شدید غصے میں تھی یقیناً اعیان نے اسے زبردستی جگایا تھا۔

''مما! اس کمینے کو سمجھالیں۔ آئندہ اس نے مجھے کچی نیند سے اٹھایا تو پھر مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ میں اسے گنجا کر دوں گی'' وہ ماں کے پہلو سے چپکی ٹھنک کر بولی تھی۔ حنان دلچسپی سے اسے بسورتے ہوئے دیکھتا رہا۔

''بارہ گھنٹے سونے کے بعد بھی تمہاری نیند ابھی کچی ہی ہے'' اعیان نے آنکھیں پھیلا کر حیرت سے کہا۔

''اتنا تھوڑا سا تو میں سوتی ہوں'' مشعل ایک مرتبہ پھر بسوری۔

''سنا ہے زیادہ سونے والا بندہ جلدی بوڑھا ہو جاتا ہے'' حنان نے بھی گفتگو میں حصہ لیا تھا۔

''ہیں...... سچ مچ'' وہ بے حد حیرانی سے بولی۔

''بالکل سو فیصد سچ'' اعیان اور حنان نے بیک زبان کہا۔

''اف، مجھے تو بوڑھے لوگوں سے سخت وحشت ہوتی ہے۔ میں تو اللہ جی سے کہوں گی مجھے جوانی میں ہی اٹھالیں''

''مشعل'' زینب نے غصے کے عالم میں کچن میں سے جھانکا ''کیا فضول بول رہی ہو''

''مما! دیکھیں نا، حنان بھائی کیا کہہ رہے ہیں اب مجھے اتنی ڈھیر ساری نیند آتی ہے تو

کیا میں جلدی بوڑھی ہو جاؤں گی'' اس نے خوفزدہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا تھا اعیان اور حنان قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

''پتا ہے حنان بھائی! یہ مشعل کی بچی کلاس روم میں بھی اونگھتی رہتی ہے اور بریک ٹائم میں تو باقاعدہ سو بھی جاتی ہے اور اس کے سونے کا میں اتنا فائدہ اٹھاتا ہوں کہ نہ صرف لنچ باکس بلکہ اس کی پاکٹ منی بھی ہضم کر جاتا ہوں۔ کالج میں اسے سارے ''نیندیا بی بی'' کہتے ہیں'' وہ حنان کے کان میں کھسر پھسر کر رہا تھا جب زینب ٹرالی گھسیٹتی آ گئی۔

''مشعل! اٹھو دادو کو ناشتا دے آؤ''

''جی مما'' وہ سعادت مندی سے کہتے ہوئے اٹھ گئی تھی۔

''مامی! ان دونوں کے تو اب ایگزامز ہو گئے ہیں کیا انہیں ساتھ لے جاؤں'' مشعل کے جاتے ہی حنان نے زینب کی طرف رخ کیا تھا۔

''کہاں'' برتن سمیٹتے ہوئے وہ مصروف سے انداز میں بولی تھی۔

''ہمارے گھر''

''سنڈے کو تو ویسے بھی آپ کی طرف جانا ہی ہے اور آج فرائی ڈے ہے، ٹھیک ہے آپ ان دونوں سے پوچھ لو۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے'' زینب نے خوش دلی سے کہا تھا۔

سحرش آپی تو ہمیشہ ہی بچوں کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اصرار کرتی تھیں مگر کچھ بچوں کی پڑھائی اور کچھ مہرین آنٹی تنہائی کے خوف سے بچوں کو جانے نہیں دیتی تھیں صبح حنان ان دونوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا اور شام کو سحرش آپی انہیں لینے کے لیے آ گئیں۔ بچوں کے بغیر ویسے بھی گھر کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا اسی لیے زینب اور مہرین آنٹی دونوں ہی تیار ہو گئیں۔

آپی کا گھر تو ان کے سسرالی عزیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ بھانت بھانت کے لوگوں کو دیکھ کر آنٹی جلد ہی گھبرا گئی تھیں اسی لیے انہوں نے خواتین کے جرمٹ میں قہقہے بکھیرتی آپی کو کافی ناراضی سے دیکھ کر آواز دی تھی۔

''تم نے تو یہاں میلا لگا رکھا ہے سحرش۔ اگر مجھے پتا ہوتا تو کبھی نہ آتی۔ بھلا دو دن پہلے اتنے لوگوں کو گھر بلانے کی کیا ضرورت تھی''

''زیادہ تر مہمان ممانی کے میکے والوں میں سے ہیں اور ان کا میکہ کراچی میں آباد ہے اسی لیے انہوں نے پہلے ہی سب کو بلوایا ہے اب اگر میں منع کرتی تو خواہ مخواہ بدمزگی ہو جاتی اور

ویسے بھی مما! میں اور عذیر اس فنکشن کے اختتام پر ایک اعلان کرنے والے ہیں اب ذرا خاموشی سے میری بات سنیے گا" سحرش نے ماں کو تفصیلاً جواب دیتے ہوئے ان کے کان کے قریب جھک کر کچھ کہا تھا ان کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات اُمڈ آئے۔

"مگر تم پہلے زینب سے تو بات کرلو"

"آپ زینب کے کان میں چپکے سے بات ڈال دیجیے گا اسی لیے تو میں نے یہ سارا اہتمام کیا ہے خواہ مخواہ سب کی نظریں حنان پر لگی ہیں جب میری بھتیجی موجود ہے تو پھر میں ادھر ادھر کیوں دیکھوں اور پھر یہ حنان کی بھی فرمائش ہے"

پھر جب مہرین آنٹی نے زینب سے ذکر کیا تو وہ کچھ پل کے لیے تو بول ہی نہیں سکی تھی کم از کم اس کے بھی تاثرات مہرین جیسے ہی تھے اور حیرت اس کی آنکھوں سے چھلک رہی تھی

"تو کیا مشعل اتنی بڑی ہوگئی ہے" اس نے ممتا کے جذبے سے مغلوب ہو کر سوچا۔

اتوار کی شام برقی قمقموں سے جگمگاتے لان میں حنان نے لرزتی کانپتی، شرمائی شرمائی مشعل کی نازک سی انگلی میں انگوٹھی ڈال کر حاضرین کو رشک و حسد کے جذبات میں مبتلا کردیا تھا ڈیڑھ مہینے بعد حنان کو ہائیر اسٹڈیز کے لیے باہر جانا تھا اسی لیے گھریلو تقریب میں سحرش آپی کی خواہش پر ان دونوں کا نکاح کردیا گیا تھا اس نازک وقت میں اسے زید کی بے انتہا یاد آئی تھی اس رات ایک مرتبہ پھر اس کا تکیہ آنسوں سے بھیگتا رہا تھا۔

☆☆☆

"شام کو تیار رہنا میں تمہیں لینے کے لیے آؤں گا۔ ڈنر اکٹھے کریں گے اور کچھ دل کی باتیں بھی" نکاح کے بعد یہ حنان کی تیسری فون کال تھی اس کی فرمائش پر مشعل سوچ میں پڑ گئی۔

"مما سے پوچھ کر بتاؤں گی"

"کیا مطلب، مامی سے اجازت لینے کی کیا تک بنتی ہے۔ بس تم سرسری سا انہیں بتا دینا" حنان نے خفگی سے کہا۔

"حنان! یوں اچھا نہیں لگتا" وہ پریشانی کے عالم میں انگلیاں مروڑتے ہوئے بولی تھی۔ دوسری طرف حنان تپ اٹھا۔

"کیا اچھا نہیں لگتا، تم میری منکوحہ ہو۔ میں تمہارے ساتھ کچھ پل، کچھ خوشگوار لمحے گزارنا چاہتا ہوں تاکہ پردیس میں ہر وقت تمہارا تصور میرے ہمراہ ہو"

"مما نہیں مانیں گی۔ وہ تو کہہ رہی تھیں کہ فون پر بات کرنا بھی مناسب نہیں" مشعل نے بے چینی سے کہا۔

"مامی، نہ جانے کس زمانے کی باتیں کرتی ہے۔ مناسب نامناسب کے چکروں میں پڑ کر میں اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہتا تم ہاں یا ناں میں جواب دو" حنان تلخ لہجے میں بولا تھا۔ مشعل کی گویا جان پر بن آئی۔

"ٹھیک ہے، سات بجے مجھے پک کرلیجیے گا" حنان کی ناراضی نے اسے گھبراہٹ میں مبتلا کردیا تھا اور چار دن بعد تو وہ ویسے بھی چلا جاتا۔ اسی وجہ سے اس نے حنان کی تو خفگی دور کردی تھی مگر اپنی بے چینی ماں سے کسی طور چھپا نہ پائی۔

"مما! اگر میں یوں حنان کے ساتھ ہوٹلنگ کرتی پھروں تو پھپھو کو یہ بات پسند نہیں آئے گی پتا ہے علیزہ آنٹی کی بیٹی اپنے منگیتر کیساتھ روزانہ ہی کہیں نہ کہیں گھومنے پھرنے نکل جاتی تھی اور پھپھو سو باتیں کرتی تھیں اس کے متعلق۔ انہیں شادی سے پہلے میل ملاپ پسند نہیں ہے" انیس سالہ مشعل کے منہ سے اتنی سنجیدہ اور سمجھدارانہ گفتگو سن کر زینب کو بے اختیار اس پر ٹوٹ کے پیار آگیا تھا۔ زینب نے من و عن مشعل کے خدشات و خوف کا ذکر سحرش سے کیا تو وہ کتنی ہی دیر ہنستی رہی تھیں۔

"میری بھتیجی کی اس معصومیت نے ہی تو حنان کو دیوانہ بنا دیا ہے مجھے تو یہی خدشہ ہے کہ کہیں امریکہ جانے سے پہلے حنان رخصتی ہی نہ کروالے" اسپیکر چونکہ آن تھا لہٰذا کتابوں میں سر دیے بظاہر مصروف سی بیٹھی مشعل نے پھپھو کی تمام گفتگو سن لی تھی۔ اس کے چہرے پر شرم و حیا کی لالی نے اک انوکھا حسن پیدا کردیا تھا کہ زینب کو اپنی ہی نظر لگ جانے کا دھڑکا لگ گیا۔

"رخصتی کی تو آپ دو سال بات ہی نہ کیجیے گا۔ جب تک مشعل بی اے نہیں کرلیتی"

"ہاں...... بالکل" سحرش نے فوراً تائید کی تھی۔

"اچھا...... تم کل مشعل کو لے کر ضرور آنا۔ اب میں مہوش کو فون کر کے میلاد کی دعوت دے دوں" دو چار مزید باتیں کر کے انہوں نے فون رکھ دیا تھا جبکہ وہ بھی کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔ گزرتے وقت کے ساتھ انہوں نے خود ہی زینب سے تعلقات درست کرلیے تھے۔

دوسرے دن سہ پہر کے وقت سحرش آپی کی طرف محفل میلاد میں شرکت کے لیے جاتے ہوئے اسے اچانک مہرین آنٹی کی دوائیاں خریدنے کا خیال آگیا تھا۔ قریبی میڈیکل

اسٹور سے دوائیاں لے کر جب وہ لوگ آپی کے گھر پہنچے تو کافی ساری خواتین پہلے سے ہی موجود تھیں۔ قرآن خوانی کے بعد نعت خوانی اور پھر درود شریف کا ورد کیا گیا تھا اس کے بعد کھانے پینے کا سلسلہ اور پھر عورتوں کی نہ ختم ہونے والی باتیں، غیبتیں، چغلیاں ایک دوسرے کی تحقیر و تذلیل بھری گفتگو۔

"تمہیں کچھ پتا ہے کہ سونیا نے کورٹ میرج کر لی ہے" ایک خاتون دوسری کے کان میں آہستگی سے منمنائی تھیں۔

"ارے کب" اک اور اشتیاق میں لپٹی آواز ابھری۔

"ابھی پرسوں کی بات ہے مگر مجال ہے جو مسز فاروقی نے کسی کو بھنک تک بھی پڑنے دی ہو" خاتون کا انداز انتہائی تحقیر آمیز تھا۔

"لڑکا اس کے ساتھ ہی دفتر میں کام کرتا ہے" بات تھوڑی اور بڑھی تو شمسہ نامی خاتون نے بھی دلچسپی سے کہا۔

"مسز فاروقی کو تو تردد بھی نہیں کرنا پڑا۔ لڑکی نے خود بخود ہی بر تلاش کر کے بیاہ بھی رچا لیا ہے۔ چلو جی مسز فاروقی تو تمام...... جھنجٹوں سے آزاد ہو گئی ہے" سحرش آپی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا اور پھر ملازمہ کے بلانے پر باہر چلی گئی تھیں۔

"نغمہ بھی شوہر کے ساتھ لڑ جھگڑ کر چلی گئی ہے" اک خوبصورت سی نفیس خاتون نے آ کر مزید محفل میں رنگ بھرے۔ باتوں کا رخ اب نغمہ کی طرف مڑ گیا تھا۔

"ہیں...... بھلا کب" کئی آوازیں ایک ساتھ ابھری تھیں۔

"صبح سویرے دونوں کے جھگڑنے کی آواز آ رہی تھی اس کے میاں نے شاید پھر کسی لڑکی کے ساتھ چکر چلا رکھا ہے"

"نہ جانے ان مردوں کی نیت کیوں نہیں بھرتی" شمسہ خود چوٹ کھائی ہوئی تھیں اس لیے تنفر سے بولیں۔

"ارے تم لوگوں کو کچھ خبر ہے کہ سحرش نے بیٹے کا نکاح کر دیا ہے" فریدہ نے تجسس پھیلانے والے انداز میں کہا تھا۔

"ہاں...... سنا تو ہے مگر سحرش نے آس پڑوس میں سے کسی کو نہیں بلایا تھا" نائمہ نے منہ بنایا۔

"ویسے کس کے ساتھ نکاح کیا ہے سحرش نے بیٹے کا"

"بھتیجی ہے اس کی"

"زید کی بیٹی؟" فریدہ نے آہستہ آواز میں پوچھا تھا زینب نے کچھ چونک کر خواتین کے اس ٹولے کی طرف دیکھا تھا جو کہ اس کی موجودگی سے بے خبر آپس میں باتوں میں مصروف تھیں۔

"ہاں...... سحرش کا ایک ہی تو بھائی ہے"

"زید نے بیٹی کے نکاح میں شرکت کی ہے؟" شمسہ نے متجسس لب و لہجہ میں استفسار کیا تھا۔

"ارے کہاں...... نہ جانے کیا معاملہ ہے۔ زید نے تو مڑ کر خبر ہی نہیں لی"

"آپ باتوں ہی باتوں میں سحرش کو کریدتیں تا کہ اصل بات معلوم ہوتی" فریدہ، نائمہ کے قریب مزید کھسک آئی تھیں۔ زینب سے مزید سننا دشوار ہو گیا۔ لرزتے قدموں سے چلتی ہوئی وہ بمشکل باہر آئی تھی اور پھر سحرش کے بے حد اصرار پر بھی نہیں رکی۔ گھر آ کر ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھوں سے گویا سیلاب جاری ہو گئے تھے۔ انجانے میں ان عورتوں نے نہ جانے کون کون سے زخموں پر سے ٹانکے ادھیڑ کر رکھ دیے تھے وہ درد اور کرب کی دلدل میں دھنسی کراہ رہی تھی۔

"اذیتوں کا یہ باب نہ جانے کب بند ہو گا"

مجھے اس عذاب مسلسل سے نہ جانے کب رہائی ملے گی"

اس نے اپنے بال نوچتے ہوئے اذیت سے سوچا تھا۔

☆☆☆

مشعل کو اپنی کسی سہیلی کے بھائی کی شادی میں جانا تھا۔ اعیان اسے چھوڑ تو آیا تھا مگر اب اسے لے کر آنے کا مسئلہ تھا اوپر سے اس قدر شدید بارش برس رہی تھی ایک دم ہی مشرقی جانب سے تیز بگولا اٹھا تھا جس نے پل دو پل میں ہی پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اگر زینب کو موسم کے رنگ بدلنے کی خبر ہوتی تو وہ کبھی بھی مشعل کو نہ جانے دیتی۔ گھڑی نے گیارہ بجائے تو زینب کے صبر اور ضبط کی طنابیں چھوٹ گئیں۔ اعیان بھی فکر مند سا صوفے پر بیٹھا اس طوفانی بارش کے تھمنے کا انتظار کر رہا تھا۔

گاڑی پچھلے تین روز سے ورکشاپ میں پڑی تھی زینب کو رہ رہ کر کبھی منحوس گاڑی پر اور کبھی اعیان پر غصہ آتا۔

"کل سے بکواس کر رہی ہوں کہ گاڑی کا جا کر پتا کرواؤ مگر صاحبزادے کو کرکٹ کھیلنے سے ہی فرصت نہیں ملتی"

"گاڑی کے دونوں پچھلے ٹائر بدلوانے کے بعد ہی گاڑی گھر آ سکے گی۔ اور ٹائر بدلنے پر کم از کم دس بارہ ہزار کا خرچہ آ جائے گا ورکشاپ کا مالک کہہ رہا تھا پہلے ایک قسط پیسوں کی جمع کروا دیں" اعیان نے آہستہ آواز میں منمنا کر کہا تھا۔

"فون کو بھی ابھی ہی ڈیڈ ہونا تھا" زینب شل ہوتی ٹانگوں کو گھسیٹتے ہوئے صوفے پر ڈھے گئی تھی اسی پل گیٹ کے قریب گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ وہ ماں بیٹا اور آنٹی مہرین تقریباً دوڑتے ہوئے نیچے آئے تھے مگر گاڑی سے نکلتی سحرش آپی کو دیکھ کر زینب کا دل گویا حلق میں پہنچ گیا تھا۔

"آپ لوگ یہاں کیوں کھڑے ہیں" سحرش نے بالوں پر سے بارش کے شفاف قطرے جھاڑتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔ سحرش کے ساتھ حنان بھی تھا زینب کی پریشانی دو چند ہو گئی۔

"وہ دراصل مشعل کا انتظار کر رہے تھے" مرتا کیا نہ کرتا۔ وجہ تو آخر بتانا ہی تھی۔ سحرش کے ساتھ ساتھ حنان کے چہرے کا بھی رنگ بدل گیا تھا۔

"کہاں گئی ہے مشعل، رات کے اس پہر"

"اس کی فرینڈ ہے حرا اس کے بھائی کی مہندی کے فنکشن میں گئی ہے"

"دوستی صرف کالج تک محدود رکھنی چاہیے" سحرش نے بمشکل خود کو تلخ ہونے سے روکا تھا۔

"فون کیا ہے تم نے"

"ڈیڈ پڑا ہے" وہ بے چینی سے بولی تھی۔

"موبائل پر رابطہ کرنا تھا"

"مشعل کے پاس موبائل نہیں ہے" اعیان نے آہستگی سے کہا تھا۔

"حنان! تم اور اعیان دونوں جا کر لے آؤ اسے" سحرش کے کہنے پر وہ دونوں ہی تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے تھے۔

زینب پر تو ہر گزرتا لمحہ بھاری تھا طرح طرح کے خدشات دل دہلائے دے رہے تھے پینتیس منٹ بعد سحرش کے موبائل پر حنان کی کال آئی تھی۔

موبائل کان سے ہٹا کر سحرش نے اس کی طرف دیکھا۔

"ڈیڑھ گھنٹہ پہلے مشعل وہاں سے آ گئی ہے" زینب کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

"کون چھوڑ کر گیا ہے اسے" مہرین آنٹی پریشانی کے عالم میں بولیں۔

"حرا اور اس کا کزن"

"پھر مشعل کہاں گئی ہے" زینب کو یوں محسوس ہو رہا تھا گویا کہ وہ کسی اندھے کنویں میں گر گئی ہے۔

"خود سے پوچھو" سحرش نے تلخی سے کہا۔

"آپ کیا کہہ رہی ہیں آپی!" زینب کے آنسو چھلک پڑے تھے۔

"وہ ہی جو تم سمجھ چکی ہو" وہ زہرخند ہوئیں۔ اسی اثنا میں حنان اور اعیان بھی لوٹ آئے تھے۔

"حرا اور اس کا کزن دونوں ہی گھر نہیں پہنچے ہیں" اعیان ماں کے پیروں کے قریب بیٹھ کر ٹوٹی آواز میں بولا تھا۔

"پھر وہ تینوں کہاں گئے ہیں؟" مہرین نے بیٹی کے تیور ملاحظہ کر کے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ سحرش نے تمسخرانہ نگاہوں سے زینب کی طرف دیکھا۔

"مشعل کی ماں جانے"

"بس کرو سحرش، وہ پہلے ہی بہت پریشان ہے" آنٹی نے گرج کر کہا تھا۔ سحرش لب بھینچ کر خاموش ہو گئیں۔

پوری رات ان پانچ لوگوں نے جاگ کر گزاری تھی صبح صادق کے وقت جب تمام امیدیں دم توڑ گئی تھیں، زینب کا وجود راکھ کا ڈھیر بن گیا اس وقت سوجی آنکھیں لیے روتی دھوتی، لرزتی کانپتی مشعل نے زید ولا میں قدم رکھا تھا۔

"اٹھو، استقبال کرو صاحبزادی کا۔ رات نہ جانے کہاں بسر کر کے تشریف لے آئی ہیں" سحرش نے اسے ماں کی طرف بڑھتے دیکھ کر تحقیر بھرے انداز میں کہا تھا حنان نے پہلے ماں اور پھر مشعل کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"مما! میں"

"بکواس بند کر، ذلیل کمینی...... بے غرت" زینب کے مردہ وجود میں حرکت ہوئی تھی اور پھر اس نے مشعل کے پھول سے رخساروں کو طمانچے مار مار کر لال کر دیا۔

"چلو حنان! گھر چلیں" سحرش آپی دوپٹہ سنبھال کر کھڑی ہو گئیں۔

"ٹھہریں ممی" وہ سرد آواز میں بولا تھا اور پھر دو قدم چل کر مشعل کے قریب آیا"

کہاں تھیں تم" "مم...... میں، حرا اور اس کے کزن"

"تم نے میرے ساتھ اور خود اپنے ساتھ اچھا نہیں کیا مشعل" اس کے لبوں سے شعلہ سا نکلا تھا۔ جس کی آگ نے مشعل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پھر وہ تیز قدم اٹھاتا باہر چلا گیا تھا۔ سحرش نے بھی بیٹے کی پیروی کی۔

"مما! یہ حنان کو کیا ہو گیا ہے یہ میرے ساتھ اس لہجے میں کیوں بات کر رہا ہے؟" اس نے روتے ہوئے ماں کو جھنجوڑا۔

دوسری شام انہیں ڈاک کے ذریعے ایک رجسٹری موصول ہوئی تھی زینب نے لفافہ چاک کر کے دیکھا اور پھر دل تھام کر رہ گئی۔

"آنٹی! یہ دیکھیں...... حنان نے مشعل کو طلاق دے دی ہے" وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی جبکہ مشعل ماں کو ساکت نظروں سے دیکھتی رہی۔

"مما! کیا کہہ رہی ہیں" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"حنان مجھے نہیں چھوڑ سکتا" وہ چلائی اور پھر بھاگتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

حرا اور عماد میں نہ جانے کون سا جھگڑا چل رہا تھا ان دنوں۔ وہ جوان دونوں کے ساتھ فنکشن اٹینڈ کرنے کے بعد گھر آ رہی تھی ایک دم ہی ان کے اونچا اونچا بولنے پر سہم گئی

"تم خود کو سمجھتی کیا ہو" عماد نے چلا کر دائیں ہاتھ سے حرا کے بازو کو دبوچا۔

"گھٹیا انسان! دھیان سے گاڑی چلاؤ" حرا اس سے بھی بلند آواز میں بولی تھی۔ وہ دونوں ہی گویا اس کی موجودگی کو فراموش کر چکے تھے۔

"میرے جیسے گھٹیا انسان کیساتھ تم آئی کیوں ہو"

"پاپا نہ بھیجتے تو میں تم پر تھوکتی بھی نہیں"

"تم......" عماد نے مارے اشتعال کے اسٹیرنگ پر ہاتھ مارا۔

"ذلیل، کمینے ہمارے نوالے کھا کر ہمیں ہی آنکھیں بھی دکھاتے ہو" حرا نے تلخی سے کہا تھا عماد کو نہ جانے کیا ہوا۔ ایک دم ہی اس نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی تھی۔ رات کا دوسرا

پہر، اوپر سے طوفانی بارش اور بادلوں کی گرج چمک جو کہ دلوں کو دہلا رہی تھی ساتھ میں ان دو جنونی لوگوں کا جنونی رویہ اسے خوف و دہشت میں مبتلا کر گیا تھا۔

"یہ تم کہاں لے کر جا رہے ہو ہمیں"

"اپنا گھٹیا پن دکھانے"

"عماد! گاڑی واپس موڑو، یا پھر ہمیں ادھر ہی اتار دو" حرا کا خود سر انداز، لہجے کی تلملاہٹ و تنتناہٹ ایک دم ہی سراسیمگی میں بدل گئی تھی۔ جوں ہی اس نے پیچھے مڑ کر مشعل کی طرف دیکھا اس کا تمام غصہ، جھنجلاہٹ صابن کی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا وہ تو بھول ہی چکی تھی کہ وہ مشعل کو اس کے گھر چھوڑنے کے لیے جا رہی تھی۔

عماد اس کا چچازاد بھائی تھا۔ وہ اسے شروع سے ہی سخت ناپسند کرتی تھی۔ اس نے اپنی ناپسندیدگی، کبھی کسی سے چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی وہ جب بھی اکٹھے بیٹھتے ان دونوں کا جھگڑا ہونا لازمی تھا حرا پل دو پل میں ہی اس کی توہین و تذلیل کر کے رکھ دیتی تھی اس بات سے بے خبر کہ عماد کا دل اس کے تلخ رویوں کی وجہ سے کیسے زخمی ہو جاتا ہے اپنی خودی میں انسان ہمیشہ گم ہو کر ایسی غلطیاں کر جاتا ہے، جس کا ازالہ ہونا ممکن ہی نہیں۔ ہمارے بعض غلط رویے دوسرے فریق کو انتہا تک لے جانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اس وقت عماد غصے اور جنون میں ہر نزاکت کو فراموش کر چکا تھا حرا کے چیختے چلانے اور مشعل کے دھواں دھار رونے کے باوجود اس نے گاڑی کا رخ نہیں موڑا تھا۔

بالکل سنسان علاقے میں وہ چھوٹا سا گھر، مکمل اندھیرے میں ڈوبا تھا جس میں انہوں نے یہ رات رو رو کر گزاری تھی اس بھیانک رات نے ان دو لڑکیوں کی زندگیوں میں اندھیرے بھر دیے تھے عماد تو انہیں ایک کمرے میں لاک کر کے چلا گیا تھا جبکہ وہ دونوں ہی ساری رات روتی چلاتی رہیں۔

انسان کا غرور اسے منہ کے بل گرا دیتا ہے اس پل حرا، عماد کے قدموں میں گری گڑگڑا رہی تھی۔

پلیز عماد! تم مجھے سزا دینا چاہتے ہو دے لو۔ مگر مشعل کو اس کے گھر چھوڑ دو" مگر عماد شاید اس گھڑی اندھا، گونگا اور بہرا بھی ہو گیا تھا۔

اگلی صبح وہ مشعل کو گھر چھوڑ گیا تھا جبکہ حرا ابھی بھی اس کی قید میں تھی اس کے گھر والوں کو اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہہ دیا تھا کہ حرا اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہی نہیں ہوئی

تھی ٹیکسی کے ذریعے وہ دوست کے ہمراہ چلی گئی تھی۔ اور حرا کی سرکشی اور خودسری سے بھلا کون واقف نہیں تھا تیسرے دن اسے زندہ سلامت گھر میں موجود دیکھ کر اس کے حقیقی خون کے رشتوں نے بھی اس کی کسی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔

ان دو لڑکیوں کی زندگیوں میں صرف چند لمحوں میں ہی ایسا طوفان آیا تھا جو سب کچھ اڑا کر لے گیا۔

مشعل نے حنان کو تمام حقیقت بتانی چاہی تھی مگر وہ دونوں ماں بیٹا کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھے بلکہ انہوں نے اس کی ذات پر اتنا کیچڑ اچھالا کہ وہ حیرت کی شدت سے گنگ ہو کر رہ گئی۔

اپنے ٹوٹے وجود کی کرچیاں سمیٹے وہ بمشکل گھر آئی تھی اور پھر آتے ...... ہی اپنے کمرے میں بند ہوگئی اعیان اور زینب دروازہ پیٹ پیٹ کر تھک گئے تھے۔

بیالیس گھنٹوں بعد اعیان نے لاک توڑا تو مشعل کا مردہ وجود کارپٹ پر ٹھنڈا پڑا تھا۔

میثال کے بعد مشعل کی اس ابدی جدائی نے زینب کی تمام ہمتوں کو گویا نچوڑ کر رکھ دیا تھا مشعل کے مرنے کے چوتھے روز بھی وہ بے یقین سی تھی اس کے کمرے میں موجود اس کی چیزوں کو، اس کے کمپیوٹر، کتابوں رائٹنگ ٹیبل اور اس کے کپڑوں میں رچی خوشبو کو محسوس کر کے وہ روتی جاتی اور تمام چیزوں کو چومتی جاتی۔

مشعل کا خط ابھی بھی اس کے ہاتھ میں لرز رہا تھا اختر ملک کی اس نظم کے ابتدائی نقرے دیوانگی کے عالم میں گنگناتے ہوئے وہ مسلسل ہنس بھی رہی تھی اور رو بھی رہی تھی۔

بساط جاں پر عذاب اترتے ہیں کس طرح
شب و روز دل پہ عتاب اترتے ہیں کس طرح
کبھی عشق ہوتو پتا چلے
کبھی عشق ہوتو پتا چلے

''مما جان! وہ.......... وہ آئے ہیں'' اسی پل دروازہ دھاڑ سے کھول کر اعیان چلا آیا تھا اس کی سانس پھولی ہوئی جبکہ چہرہ سرخ تھا۔

''کک ...... کون'' زینب نے چہرہ صاف کر کے پلٹ کر دیکھا۔

''پاپا......'' اعیان نے گویا اس کے سر پر دھماکہ کیا تھا۔

☆☆☆

اور وہ آ گیا تھا پورے بیس سال بعد۔ اس کی آدھی عمر اس کی یاد میں اور آدھی انتظار میں گزر گئی تھی مگر آج زید کو اتنے سالوں بعد دیکھ کر نہ اس کا دل خوشگوار انداز میں دھڑکا تھا اور نہ ہی چہرے پر کوئی رنگ کھلا اک گہری خاموشی تھی، سکوت کا ایسا عالم تھا کہ اس سناٹے میں دل وحشت زدہ رہ جائیں۔

اس کی آنکھوں میں اگر کوئی خوشی اتری بھی تھی تو وہ ریان کو دیکھ کر۔ یہ ریان اس کا ریان تو نہیں لگ رہا تھا اونچا، لمبا سرخ و سفید رنگت اور آنکھوں میں چھائی گہری سنجیدگی۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھے جارہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ اپنے لخت جگر کو بانہوں میں بھر کے اتنے سالوں کی پیاسی ممتا کو سیراب کر ڈالے وہ خود فراموشی کے عالم میں اس کی طرف بڑھی تھی مگر ریان کے سرد انداز کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

وہ شکل و صورت میں بالکل اپنے باپ جیسا تھا زینب یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ عادتوں اور مزاج میں مغروری اور خود پسندی میں بھی بالکل اپنے باپ کے دائیں جانب کھڑا ہے۔

☆☆☆

''رات کو ہی مجھے پتا چلا ہے کہ زید آ گیا ہے میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر ہی پہنچ جاتی۔ تمام رات اس بے قراری و بے چینی میں گزری ہے۔ اسی لیے تو صبح ہوتے ہی بھاگی بھاگی چلی آئی ہوں'' سحرش آپی تیز تیز بولتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوئی تھیں۔

''کس منہ سے آئی ہو۔ شرم نہ آئی تمہیں اس گھر میں آتے ہوئے تیری وجہ سے میری معصوم پوتی نے حرام موت کو گلے لگالیا'' مہرین آنٹی نے بیٹی کو دیکھ کر نفرت سے منہ موڑ لیا تھا۔ اس کی ڈھٹائی دیکھ کر دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیں۔

''میری وجہ سے'' سحرش آپی نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں اور پھر ماں کو کٹیلی نگاہوں سے گھورا'' مما! آپ سٹھیا تو نہیں گئی ہیں میرے ساتھ کس لہجے میں بات کر رہی ہیں آپ، ویسے آپ نے ساری زندگی کسی نہ کسی کو ایک دوسرے کی موت کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے'' انہوں نے گویا ناک پر سے مکھی اڑائی تھی اور پھر جلتی کلستی زید کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

زید کو آئے تقریباً پندرہ دن ہو گئے تھے اور اسی دن سے ہی سحرش آپی اور آمنہ نے یہاں ڈیرا جما رکھا تھا زینب نے گویا اپنے اردگرد بے حسی کی دبیز چادر لپیٹ رکھی تھی۔

ہمیشہ کی طرح اس نے زید کے ساتھ کسی بھی قسم کا کوئی جھگڑا نہیں کیا تھا۔ زید اس کی

گہری خاموشی پر قدرے حیران بھی تھا۔

زید کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ مستقل پاکستان شفٹ ہوگیا ہے کیونکہ آفیشل کام کے سلسلے میں وہ سارا دن ہی باہر رہتا تھا اس نے تین دن پہلے ہی یہاں کے آفس کو جوائن کیا تھا وہ دونوں باپ بیٹا شاید ایک ہی آفس میں جاب کرتے تھے۔

ریان باپ سے بے حد اٹیچ تھا وہ دونوں اکٹھے ناشتا کرتے، اکٹھے ہی آفس جاتے اور واپسی بھی ان کی ایک ساتھ ہی ہوتی تھی ان دونوں کو ایک دوسرے کے علاوہ شاید کسی اور کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ آفس سے واپسی کے بعد ریان چائے بناتا اور پھر باپ بیٹا دونوں اسٹڈی روم میں چلے جاتے تھے اسی پل اعیان کی آنکھوں میں محرومیاں آنسو بن کر چمکنے لگتی تھیں۔

''مما! لگتا ہے پاپا کو بھائی کے علاوہ کسی سے بھی پیار نہیں ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہیں مشعل کے مرنے کا بھی ذرہ برابر افسوس نہیں ہے۔''

اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ ماں سے شکوہ کیا تھا۔

زینب نے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ وہ زید کو مخاطب نہیں کرے گی۔ اب وہ بالکل بھی اس کے سامنے نہیں جھکے گی اس عمر میں وہ اپنی عزت نفس، اور وقار و خودداری کی دھجیاں بکھرتی نہیں دیکھ سکتی تھی مگر اعیان کی وجہ سے اسے ایک مرتبہ پھر اس پتھر کے دیوتا کے سامنے جھکنا پڑا تھا۔

سحرش آج ایک مضبوط ارادہ کر کے زید کے پاس آئی تھیں پچھلے دنوں تو وہ بے حد مصروف تھا ڈھنگ سے کوئی بات ہی نہیں ہوسکی تھی۔

زید آفس سے آیا تو اس نے سحرش کو اپنے کمرے میں موجود پایا۔ وہ بے حد تھکا ہوا تھا کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا مگر بڑی بہن کو دیکھ کر زبردستی مسکراہٹ لبوں پر سجالی۔

''چائے لاؤں تمہارے لیے''

''نہیں، ابھی کچھ دیر بعد پیوں گا'' زید نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے کوٹ صوفے پھر پھینکا اور پھر اطمینان سے ان کے پاس بیٹھ گیا۔

''زید! مجھے تم سے بہت ہی ضروری بات کرنا ہے'' سحرش نے گویا تمہید باندھی تھی۔

''جی، بولیے'' وہ سنجیدگی سے ان کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

''تمہیں پتا ہے ناں زید! یہ پیارا سا گھر ڈیڈی اور چھوٹے پاپا نے بڑی محبت سے بنوایا تھا اس کی نیم پلیٹ پر ابھی تک تمہارا نام ہی جگمگا رہا ہے ان دونوں کی خواہش تھی کہ اس گھر

کو تم اور میشال آباد کرو گے نہ میشال رہی اور نہ ہی تم نے خوشی کا اک پل بھی اس گھر میں گزارا ہے'' وہ زید کی طرف بغور دیکھتے ہوئے اک لمحے کے لیے رکیں اور ایک مرتبہ پھر سفا کی نما سنجیدگی سے بولیں۔

''اس گھر کو ڈھیروں چاہتوں اور محبتوں کے ساتھ بنوایا کس کے لیے تھا اور اب تک بس کون رہا ہے اس بات کو تو چھوڑ دو۔ ڈیڈی نے اتنا پیسہ بینک میں جمع کروا رکھا تھا تمہارے لیے۔ وہ ہی رقم مما نے ان لوگوں پر لٹا دی ہے۔ اب میں یہ چاہتی ہوں کہ کم از کم یہ گھر ریان کے نام ہو جائے تم خاموشی کے ساتھ وکیل سے مشورہ کر کے کاغذی کارروائی کروالو''

''ہوں......'' زید نے طویل ہنکارا بھر ''میں سوچوں گا'' وہ گہری سانس کھینچتا کھڑا ہو گیا تھا۔ سحرش بھی ''میں تمہارے لیے چائے لاتی ہوں'' کہہ کر اٹھ گئی تھیں۔ ان کا مقصد تو حل ہو ہی چل چکا تھا۔

☆☆☆

زید کا سحرش کی خواہش پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ اسے ریان کے علاوہ اعیان اور مشعل سے قلبی لگاؤ اور اتنی زیادہ انسیت نہیں تھی مگر اس کے باوجود وہ اعیان کے ساتھ کم از کم جائیداد میں ناانصافی نہیں کرنا چاہتا تھا بیس سال بعد اپنے بیٹے اعیان کو دیکھ کر اور مشعل کی خودکشی کا سن کر دل کی کسک میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔

اسے پہلا عشق میشال سے ہوا تھا اور دوسرا ریان سے کسی تیسرے کی گنجائش ہی کہاں نکلتی تھی۔ مگر اعیان کو دیکھ کر اسے اپنی بدنصیبی پر رونا آگیا تھا وہ کیسا خودغرض باپ تھا جو اندھی محبت میں ڈوبا ہر رشتے سے بے نیاز اپنی ہی دنیا میں گم تھا اسے احساس ہی نہ ہوسکا کہ اس کے دو بچے اور بھی ہیں۔ جو اس کی شفقت و محبت کے ترس رہے ہیں۔

اک عمر گزار دینے کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ اس سفر میں سوائے کھونے کے کچھ حاصل نہیں ہوا نگری نگری گھومنے، پوری دنیا کی خاک چھاننے کے بعد وہ پلٹ کر اپنے مرکز کی طرف ہی آیا تھا مگر اس دوران اس نے اپنی بیٹی کو بھی کھو دیا۔

رات کو ریان نے عجیب سی خواہش کا اظہار کیا تھا حالانکہ نہ بات عجیب تھی نہ اس کی خواہش مگر پھر بھی زید کو کچھ اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا ریان اصرار کر رہا تھا کہ وہ جلد از جلد سحرش سے بات کرے مگر نہ جانے کون سی قوت اسے ایسا کرنے سے روک رہی تھی پہلی مرتبہ اس کا

ریان کی خواہش پوری کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

''پاپا! اگر آپ پھپھو سے بات نہیں کر سکتے تو میں خود کر لیتا ہوں'' وہ آزاد ماحول میں پلا بڑھا تھا بے حد پر اعتماد، آنکھوں میں سنجیدگی لیے بڑے اطمینان کے ساتھ کہہ رہا تھا زید کو پہلی مرتبہ اس کا یہ انداز سخت ناگوار گزرا تھا تاہم وہ بولا کچھ نہیں۔

''کب جائیں گے آپ پھپھو کی طرف''

''اتنی جلدی بھی کیا ہے'' زید نے ناگواری سے کہا دو دن پہلے ہی تو مشعل کا چالیسواں ہوا تھا مگر ریان ان نزاکتوں کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔

''آج شام کو میں اور آپ پھپھو کی طرف چلیں گے''

''اتنی جلدی بھی کیا ہے'' زید نے ناگواری سے کہا دو دن پہلے ہی تو مشعل کا چالیسواں ہوا تھا مگر ریان ان نزاکتوں کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔

''آج شام کو میں اور آپ پھپھو کی طرف چلیں گے'' ریان نے گویا سب کچھ طے کر رکھا تھا زید کو ایک دم ہی غصہ آ گیا۔

''بکواس نہیں کرو اور جاؤ اب''

''ابھی جا رہا ہوں...... شام تک تیار رہیے گا'' وہ ضدی لہجے میں بولتے ہوئے باہر نکل گیا تھا۔

''زید کو مجبوراً ریان کے ساتھ جانا پڑا تھا۔ آپی کا رویہ اور انداز دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا یقیناً تمام معاملات وہ تینوں ہی طے کر چکے تھے زید بڑے بوجھل دل کے ساتھ گھر آیا تھا۔

دوسرے دن وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جب زینب آندھی طوفان کی طرح اس کے کمرے میں آئی تھی۔ پورے ڈیڑھ مہینے بعد وہ اس کے سامنے آئی تھی۔ زید نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

''آپ نے آئمہ کے ساتھ ریان کا رشتہ طے کر دیا ہے'' وہ غصے سے چلائی تھی۔

''ہاں'' وہ مختصر بولا۔

''کیوں...... ریان کے لیے پوری دنیا میں کیا لڑکیاں ختم ہو گئی تھیں جو آپ آئمہ کو بہو بنائیں گے۔ سحرش آپی کے ساتھ رشتہ جوڑیں گے۔ انہوں نے آپ کی بیٹی پر کتنے گندے الزام لگائے تھے کتنا کیچڑ اچھالا تھا اس کے پاکیزہ وجود پر حنان نے اسے طلاق دے دی پل بھر میں

تمام رشتے توڑ دیے میری مشعل نے خود کو ختم کر لیا۔ صرف اور صرف اس کمینے حنان کی وجہ سے''

زینب اس کا گریبان پکڑ کر چیخ رہی تھی اور زید میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اسے خاموش ہی کروا دیتا۔

''ریان کو منع کرو' اسے بتاؤ کہ تمہاری بہن کو موت کے گھاٹ اتارنے والی یہی ماں بیٹی ہیں۔ ان کے کٹیلے الفاظ، نفرتوں اور طعنوں نے اس کی جان لے لی ہے''

''اور میشال آنٹی کی جان لینے والی آپ ہیں'' ریان بھی دھاڑ سے دروازہ کھول کر اندر آ گیا تھا زینب نے ساکت نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا وہ اس کی ساعتوں میں کتنا ہی زہر انڈیل کر گرجتا برستا آندھی و طوفان کی طرح نکل گیا تھا جبکہ زینب بھربھری ریت کی طرح کارپٹ پر بیٹھتی چلی گئی۔

رات کو ایک مرتبہ پھر ریان دادی کے کمرے میں چیخ چلا رہا تھا سحرش نے اس کے ذہن میں نفرتوں کا زہر بھر دیا تھا وہ ماں سے بولتا نہیں تھا اس کی طرف دیکھتا نہیں تھا زید غصے کے عالم میں مہرین کے بیڈروم کی طرف بڑھا اور پھر زور زور سے بولتے ریان کو زید کے تھپڑ نے خاموش کروایا تھا۔

''مزید بکواس کی تو جان نکال دوں گا تمہاری'' زید بلند آواز میں چلایا تھا جبکہ کچن کے دروازے میں کھڑی زینب دیوار سے سر ٹکاتے ہوئے بے آواز رو دی تھی۔

''میں سارے جہان کی نفرت برداشت کر سکتی ہوں ریان! مگر تیری نفرت مجھے مار دے گی۔ میں مر رہی ہوں ریان، لمحہ لمحہ، قطرہ قطرہ'' وہ زیر لب بڑبڑاتی رہی اور روتی رہی تھی۔

اور پھر ریان کی نفرت نے اسے واقعی مار دیا تھا جس رات ریان آئمہ کو بیاہ کر اپنے ساتھ زید ولا میں لایا زینب اسی رات ہی گویا مر گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کبھی میشال کا چہرہ آتا، کبھی مشعل کا۔ سرخ لباس، اس کی آنکھوں میں چبھن پیدا کر رہا تھا۔ کبھی اسے سرخ لباس میں میشال لپٹی نظر آتی کبھی مشعل۔

میشال ہنس رہی تھی مشعل رو رہی تھی وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے چیخے جا رہی تھی

''نہیں ریان تو ایسا نہیں کر سکتا''

''اپنے دل پر لگی، تو تب ہی روبی کا کرب اور درد سمجھ میں آئے گا'' سامنے والی دیوار میں مہرین کی صورت ابھری تھی۔ انہوں نے گویا اس کی حالت پر قہقہہ لگایا تھا۔

''مجھے تم سے نفرت ہے۔ اس دن سے جب تم ہماری زندگیوں میں زہر گھولنے چلی

آئی تھیں میرا دل کرتا ہے کہ تمہیں آگ لگا دوں یا پھر اندھے کنویں میں دھکیل کر ہمیشہ کے لیے تمہارے ناپاک وجود کو ختم کر دوں'' اس نے دائیں جانب دیکھا تو زید کو بھی قہقہہ لگاتے پایا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے چلائی۔

''چلے جاؤ تم سب چلے جاؤ، مجھے تنہا چھوڑ دو''

''تم نے میشال کو زہر دے کر مارا ہے'' مہرین نے ایک مرتبہ پھر بلند آواز میں کہا تھا زینب غصے کے عالم میں بیڈ سے اٹھی۔

''کتنی جھوٹی عورت ہو تم۔ میں نے کب میشال کو زہر دیا ہے وہ تو اس نے خود غلط دوائی کھالی تھی'' وہ ایک مرتبہ پھر خود کو بہلانا چاہتی تھی۔ مگر دل اب کے بہلنے سے انکاری تھا۔

اب وہ ایک دفعہ پھر کانوں پر ہاتھ رکھے چیخ چیخ کر رو رہی تھی اعیان روزانہ ہی ماں کی چیخیں سنتا اور پھر بے قراری سے اس کے بیڈروم میں آ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا تھا پھر زید کو زینب کے ساتھ ساتھ اعیان کو بھی سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔

زینب کو بھی اب پاگل پن کے دورے پڑنے لگے تھے دورے کی حالت میں اس کے ہاتھ پاؤں مڑ جاتے تھے اور منہ سے سفید جھاگ نکلنے لگتا۔

''پلیز ریان! مجھے اس پاگل خانے سے کہیں دور لے جاؤ۔ دم گھٹتا ہے میرا یہاں، مجھے تو اس بات کا خوف ہے کہ میرے ہونے والے بچے پر کہیں اس کے برے اثرات ہی نہ پڑ جائیں۔ دن رات اس عورت کی چیخیں سن سن کر کہیں میں بھی اپنا ذہنی توازن نہ کھو دوں'' ایک صبح زینب کو معمول کا دورہ پڑا تھا زید اور اعیان اسے ہسپتال لے گئے تھے جب آمنہ نے ایپل جوس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے تنفر سے کہا تھا اور پھر اگلے چند دنوں تک وہ دونوں ہی ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلے گئے تھے۔

ایسی ہی ایک اداس شام کو علینہ ان کے گھر چلی آئی تھی ''زید ولا'' کا گویا نقشہ ہی بدل چکا تھا اجاڑ ویران لان، گھر کی ابتر حالت اور سب سے زیادہ زینب کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی تھی۔

اس کے ریشمی سنہرے بالوں میں جا بجا چاندی کے تار جھلملا رہے تھے آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، سنہری رنگت کملا کر رہ گئی تھی۔

ان براؤن کانچ سی آنکھوں میں وحشتوں نے گویا ڈیرے جما لیے تھے علینہ کا دل دکھ کے گہرے احساس تلے دب کر رہ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد مہمان کی آمد کا سن کر زید اور اعیان بھی چلے آئے تھے اور پھر علینہ کو زینب کے متعلق بتاتے ہوئے نہ جانے کیوں زید کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ علینہ ہونٹ چباتے ہوئے اس خوبصورت عمارت کو دیکھتی رہی۔

''میں نے آنے میں بہت دیر کر دی تھی'' وہ ہاتھ ملتے ہوئے آزردگی سے کہہ رہا تھا۔

اس نے میشال سے محبت کی تھی اور اس محبت نے اسے انتہا پسند بنا دیا۔ انتہا پسندی کے اس پھیر نے بالآخر اسے تنہا کر دیا تھا زید اور زینب دونوں انتہا پسند تھے۔ شدت پسندی کا انجام تنہائی، ناکامی شکست اور پچھتاوا۔

ہمارا مذہب ہمیں میانہ روی کا سبق دیتا ہے جب بھی ہم صراط مستقیم سے بھٹک کر کوئی اور راہ اختیار کرتے ہیں اور ان حقوق و فرائض سے نگاہ چراتے ہیں جو ہم پر واجب کر دیے گئے ہیں تو پھر زندگی اسی طرح پچھتاوا بن جاتی ہے اور عجیب بات تو یہ تھی کہ پورے اکیس سال بعد اس کامیاب مرد کو اس پاگل عورت سے محبت ہو گئی تھی۔

علینہ نے زید ولا سے نکلتے ہوئے بوجھل دل سے سوچا اور پھر سفید آلٹو کی طرف بڑھ گئی۔

❁

پرکھ

جوں ہی وہ لوہے کا گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا تھا اک بے حد ناگوار بدبو اور سڑاند سی نتھنوں سے آن ٹکرائی۔مہد کو ایک دم ابکائی آنے لگی تھی۔گیٹ کے ساتھ رکھے ڈرم میں سے کوڑا ابل ابل کر باہر گر رہا تھا۔ڈھیروں مکھیاں اردگرد بھنبھنا رہی تھیں۔کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی تھی کہ کوڑے والی سے ڈرم ہی اپنی نگرانی میں خالی کروا کر احسان عظیم کر دیتا۔

پورے صحن میں جابجا درختوں کے پتے اور گلا سڑا پھل شاخوں سے گر کر ماربل کے فرش کو داغ دار کر چکا تھا۔بچوں کے ٹوٹے پھوٹے کھلونوں کے ڈھیر بیرونی دیوار کے ساتھ لگے تھے۔

''کیا پہلے ایسا گھر تھا یہ۔صرف چند مہینوں میں ہر شے تلپٹ ہو گئی ہے'' وہ تلخی سے سوچنے لگا۔اس قدر شدید گرمی اور بینک میں چار گھنٹے انتظار کرنے کے بعد اس کے اپنے بھی چار ہی بج چکے تھے۔ابھی وہ لاؤنج میں داخل ہوا تھا جب قاسم بھاگتا ہوا آ گیا۔

''چاچی نے سارے کچن کے برتن توڑ دیئے ہیں فہد کو بہت مارا ہے۔اسی لیے تائی امی اور چاچی کی خوب لڑائی ہوئی ہے۔چاچی جواب دینے کی بجائے ہنستی رہی تھیں۔بے چاری پاگل جو ہوئیں'' قاسم کا لہجہ تاسف سے بھر گیا۔مہد کے من میں اذیت کی ایک تیز لہر اترتی چلی گئی۔

''قاسم!ایک گلاس پانی تو لا دو''

''میں لا دوں بابا!'' شفق نہ جانے کہاں سے برآمد ہوئی تھی۔الجھے بکھرے بال،گندے کپڑے اور ٹوٹی چپل پہنے ہوئے۔مہد کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔

''ملشہ جب ٹھیک تھی تو ایک دن بھی شفق گندے حلیے میں دکھائی نہیں دیتی تھی اسے شفق کو سجانے سنوارنے کا بہت شوق تھا'' مہد نے بے حد رنجیدگی سے سوچا۔

''چاچو!پانی'' قاسم نے بوتل اور گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''ٹھنڈا پانی نہیں تھا'' وہ دو گھونٹ اس گرم سیال کو اندر اتارتے ہوئے بےزاری سے بولا۔

''نہیں،کسی نے فریج میں بوتلیں نہیں رکھیں'' قاسم جواب دے کر بھاگ گیا تھا۔

''دادو کہاں ہیں'' اس نے پانی پی کر شفق کو اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''اپنے کمرے میں''

''کیوں؟اس وقت تو تخت پر بیٹھتی ہیں وہ'' اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے حیرانی سے کہا۔

''ماما کو پھر دورہ پڑا ہے۔اس لیے غصے کی وجہ سے دادو اپنے کمرے میں چلی گئی ہیں پتا ہے بابا!کیا کہہ رہی تھیں دادو'' شفق اس کے گالوں پر دونوں ہاتھ رکھے معصومیت بولی۔

''کیا'' وہ چونکا۔

''کہہ رہی تھیں۔تمہارا باپ اسے پاگل خانے چھوڑ کر آئے گا تب ہی باہر نکلوں گی''

''اماں بھی نا،حد کرتی ہیں۔بچوں سے ایسی باتیں بھلا کی جاتی ہیں'' اس نے ناگواری سے سر جھٹکا۔

''بابا آپ ماما کو پاگل خانے چھوڑ آئیں گے۔پھر میں ماما کہاں سے لوں گی'' وہ آزردگی سے کہنے لگی۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔آپ ماما کے لیے دعا کیا کرو۔اللہ انہیں صحت دے'' وہ دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔ملشہ بیڈ پر لیٹی تھی۔اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ہاتھوں میں زنجیر تھی۔مہد کے دل میں اک درد کی تیز لہر اٹھی۔

''میں تو روز ماما کے لیے دعا کرتی ہوں'' شفق نے اس کی گود سے اتر کر ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے بتایا۔

''چلو پہلے تمہارا منہ دھلوا لوں۔پھر کھانا کھلاتا ہوں'' مہد،شفق کو لے کر واش روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔کچھ دیر بعد وہ باہر نکلا۔پھر اس نے شفق کے بالوں میں برش کیا۔کپڑے نکال کر پہنائے اور پھر کھانا لے کر کچن سے واپس آیا تو ملشہ بیڈ پر پاؤں نیچے لٹکائے بیٹھی تھی۔مہد نے شفق کے منہ میں نوالے ڈالتے ہوئے اپنے چہرے پر کچھ تپش سی محسوس کی تھی۔اس نے نگاہ

اٹھا کر دیکھا۔ ملشہ اس کے قریب آ کر کارپٹ پر بیٹھ رہی تھی پھر اس نے مہد کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

''مہد! آئی لو یو'' وہ ساکت سا حیران پریشان ملشہ کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ پھر اس کے چہرے پر یکا یک خوشی، تعجب اور بے انتہا سرشاری کی کیفیات نمودار ہونے لگیں۔

☆☆☆

''اماں بی! غصہ مت کرنا۔ ہمیں تو دلہن پسند نہیں آئی'' چوچک نے حلوے اور نان چنے سے بھرپور انصاف کرتے ہوئے کہا تھا۔ اماں بی نے پہلے تو گھور کر چوچک کی طرف دیکھا پھر غصے کے اظہار کے طور پر چوچک کے سامنے رکھی ناشتے کی ٹرے کھینچ لی۔

''تین نان، پوری پلیٹ حلوے کی اور سالن کا پیالہ چاٹ کر میری بہو کی شان میں گستاخی کرتی ہے۔ تجھے کس نے اختیار دیا ہے کہ تو دلہن کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر، اٹھ جا منحوس، میری نظروں کے سامنے سے ورنہ جھانپڑ لگا کر بتیسی باہر نکال دوں گی۔ کم بخت بولتی ہے دلہن پسند نہیں آئی''

''سوری اماں بی! میرے پیو کی توبہ، غلطی ہو گئی جی'' چوچک گھگھیاتے ہوئے اٹھی۔

''چل جا، باورچی خانے میں برتنوں کا ڈھیر لگا ہے۔ پہلے انہیں دھو، پھر مشین لگانا'' اماں بی تخت سے اٹھ کر چپلیں ڈھونڈتی ناراضی سے بولیں۔

''میں نے کچھ غلط تو نہیں بولا آپ تو خواہ مخواہ سیخ پا ہو رہی ہیں یہی بات تو پورے گھر میں پچھلے ایک ماہ سے سب کی زبان پر ہے۔ اگر میرے منہ سے کچھ پھسل گیا ہے تو آپ آگ بگولا ہو گئیں۔ بہوؤں، بیٹیوں کو نہ روکا نہ ٹوکا اور مجھے بے چاری کے اوپر سارا نزلہ گرا دیا ہے، سچ ہے جی، غریب کی بھلا کیا عجت (عزت) ہر طرف سے پھٹکار ہمارے حصے میں بھاگی دوڑی چلی آتی ہے'' چوچک منہ ہی منہ میں بدبد کرتی جوں ہی باورچی خانے میں داخل ہوئی سامنے موجود نئی دلہن کو دیکھ کر گویا اسے دانتوں پسینہ آ گیا۔

''سلام بی بی!'' کچھ نہ سوجھا تو شرمندگی کی ماری چوچک نے فوری سلام جھاڑ دیا۔

ملشہ نے مڑ کر دیکھا اور پھر سر ہلا کر چوچک کے شرمندگی میں ڈوبے سلام کو قبول کر لیا۔

''بھائی صاحب لوگ دفتروں اور کالجوں میں نکل گئے'' وہ خجالت مٹانے کی غرض سے اپنی بھدی آواز میں پوچھنے لگی۔ ملشہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس کی سماعتوں میں ابھی تک

کچھ دیر پہلے اس منہ چڑھائی ملازمہ کے الفاظ...... تھے چوچک جیسی مطلبی، خوشامدی سی ملازمہ کو جلد اپنی غلطی کا ادراک ہو گیا تھا۔ تبھی تو وہ تیز گام کی طرح تیز تیز بول رہی تھی۔ گویا کچھ دیر پہلے اپنے منہ سے نکلنے والے الفاظ کے اثر کو زائل کرنا چاہتی تھی۔

''مسکان بی بی بھی کلینک چلی گئی؟ انہوں نے دوائیوں کا نسخہ نہ جانے لکھا بھی ہے کہ نہیں خیر دو بجے تک تو آ جائیں گی اور بڑی بھابھی بھی آج جلدی دفتر چلی گئی ہیں؟ ان کے بچوں کے یونیفارم دھونے تھے میں نے بسمہ بھابھی''

''مسکان روزانہ نو بجے کلینک چلی جاتی ہے، نائلہ بھابھی کا دفتر ٹائم آٹھ بجے سے چار بجے تک ہے۔ بسمہ بھابھی کا کالج ٹائم بھی یہی ہے۔ جبکہ نادیہ بھابھی اور معراج بھائی ساڑھے دس بجے تک نکلتے ہیں۔ معراج بھائی کو ٹریول ایجنسی اور نادیہ بھابھی کو اپنے دفتر میں اتنے سویرے جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان سب کے تینوں بچے بھی اس وقت اپنی اپنی درس گاہوں میں جا چکے ہیں۔ منہب، ملت، مانیہ، منیم بھی اسکول اور کالج میں اپنے چاچو جان کے ہمراہ چلے گئے ہیں۔ باقی میں اور اماں بچے ہیں۔ تو ہم دونوں ہستیاں آپ کے سامنے موجود ہیں کچھ اور پوچھنا ہے تو پوچھ لو۔ اس کے بعد کسی سوال کا جواب نہیں ملے گا۔ روزانہ باتیں مٹھار کر، جھاڑو لگایا ایک جھپک پونچھا لگایا اور کچرا کونوں کھدروں میں سے نکالنے کی زحمت کیے بغیر ہاتھ جھاڑتی نظر بچائے بھاگ جاتی ہو۔ نائلہ بھابھی کے بچوں کے یونیفارم پہلے دھو کر آؤ۔ آج ان کی کام والی چھٹی پر ہے پھر آ کر صفائی وغیرہ کرنا''

ملشہ نے کیبنٹ اچھی طرح صاف کر کے اچار، دالیں، چاول، سونف اور اجوائن کے بڑے بڑے جار ترتیب سے رکھنے کے بعد کیبنٹ کو تالا لگایا اور دوسری الماری کی طرف بڑھ گئی۔

یہ الماری کچن کے دائیں جانب دیوار میں نصب تھی۔ اس میں صرف، صابن، نیل، ٹوتھ پیسٹ اور شیمپو وغیرہ کی بوتلیں ترتیب سے رکھی تھیں۔ مہینہ بھر کا تمام سودا اماں یکم تاریخ کو منگوا لیتی تھیں۔

مگر نہ جانے کیسی بے برکتی تھی کہ ابھی پندرہ دن گزرتے تھے کہ سرف سوڈے کے ڈبے صابن، ٹوتھ پیسٹ وغیرہ ایک ایک کر کے غائب ہونے لگتے اور مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی اماں سر پکڑے ہاتھ میں موجود گنے چنے نوٹوں کو یاسیت سے دیکھنے لگتی تھیں جبکہ بچوں کی فیسوں کا پہاڑ ابھی سامنے ہی موجود ہوتا تھا۔

ملشہ جلد ہی ''کچن چور'' کو دریافت کر چکی تھی اور یہ بڑے بڑے لشکارے مارتے

تالے بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی جبھی تو محترمہ چوچک صاحبہ کو اس گھر کی آخری نمبر والی یہ بہو جو مہینہ بھر پہلے خالصتاً اماں بی کی پسند سے جلوہ افروز ہوئی تھی اور جسے دیکھنے کے ساتھ ہی اماں کی بڑی پانچوں بہوؤں نے ''رات کے اندھیرے'' کا خطاب دے دیا تھا قطعاً پسند نہیں تھی۔ اپنی عام سی شکل وصورت کی وجہ سے نہیں اور نہ ہی دلہن صاحبہ کی کم تعلیم ناپسندیدگی کی اصل وجہ تھی بات تو کچھ یوں تھی کہ اب صدا کی کام چور چوچک کو دوگنا کام کرنا پڑتا تھا اور نئی دلہن اپنے وجیہہ سے شوہر پر توجہ دینے کی بجائے ہمہ وقت چوچک کو نگاہوں کی زد میں رکھتی تھی۔

اب بھی ملشہ اپنی زیرنگرانی چوچک سے برتن دھلوا رہی تھی۔ ایک ایک دیگچی، پتیلے اور کڑاہی کو اچھی طرح منجوانے کے بعد اس نے ایک صاف کپڑا چوچک کی طرف بڑھایا اور بولی۔

''انہیں اب اچھی طرح رگڑ کر خشک کرو تاکہ برتنوں پر پانی کے چھینٹے نما داغ نظر نہ آئیں'' چوچک کو ہدایات دینے کے ساتھ ساتھ وہ سبزی بنانے کا کام بھی تیزی سے سرانجام دے رہی تھی۔ اسے لنچ وقت سے پہلے تیار کرنا تھا تاکہ بچے اور بڑے انتظار کی کوفت سے بچے رہیں۔

''ملشہ باجی! آج کیا پکانے کا ارادہ ہے؟'' چوچک زیادہ دیر کہاں خاموش رہ سکتی تھی اور پھر ملشہ کو فریزر میں سے گردے، دل اور بھیجے کے علیحدہ علیحدہ پیکٹس کو نکالتے دیکھ کر اس کی چٹخارے لیتی زبان سے رہا نہ گیا تو پوچھنے لگی۔

''مونگ کی دال، گھیے کا رائتہ اور شاہجہانی کٹا کٹ'' ملشہ نے دیگچی چولہے پر چڑھا کر کیبنٹ سے آئل کی بوتل نکالی۔

''تو پھر یہ گردے، دل اور بھیجے کا کیا کرنا ہے'' چوچک کچھ بدمزا سی مینیو کو سن کر بولی۔

''شاہجہانی کٹا کٹ بناؤں گی''

''اچھا اچھا'' وہ ایک دم خوش ہوگئی۔

''سچ کہوں باجی! جب سے آپ اس گھر میں آئی ہیں قسم سے کھانے کا سواد آ گیا ہے۔ ورنہ یہاں تو ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب ہوٹل سے روٹی یا سالن نہ منگوایا گیا ہو۔ اتوار کے اتوار بڑی بھابھیوں کو فرصت نصیب ہوتی تھی اور اسی چھٹی والے دن ان کے سو کام ہوتے تھے اور سب سے بڑھ کر اوپر والی ساری ''بھابھیاں'' پورے ہفتے کی نیند چھٹی والے روز ہی پوری کرنے کے چکر میں سارا سارا دن نیچے نہیں اترتی تھیں۔ بارہ بجے تک بچے بھوک بھوک چلاتے خود ہی نان چنے لینے نکل پڑتے۔ یا کبھی کبھار منہب بھائی چائے بنا دیتے یا توس سینک کر بچوں

اور اماں بی کے سامنے رکھ دیتے۔

اتوار کے دن بھی گھر کا کھانا کہاں نصیب ہوتا تھا اوپر والی چاروں بھابھیوں کی ڈیوٹی تھی ہر اتوار کو ایک بھابھی اپنا پرس کھول کر بازار سے دونوں وقتوں کا کھانا منگواتی تھیں۔ اماں بی کو بازاری کھانوں کی وجہ سے معدے کی تکلیف ہوگئی ہے'' چوچک رازداری سے تفصیلاً بتانے لگی تھی۔

''کچن میں کھڑے ہو کر پکانا کہاں آسان ہے اور اوپر والی بھابھیاں ہیں ہی آرام طلب''

''زمین سے پانی اس لیے ختم ہو رہا ہے کہ تم جیسے لوگ پانی کی قدر نہیں کرتے برتنوں کو صابن لگاتے وقت ٹونٹی کو بند کر دیا کرو'' ملشہ نے ناراضی سے اسے ٹوکا تو وہ اور بھی زیادہ بدمزا ہو کر برتن رگڑنے لگی۔

''ایک تو ملشہ باجی کو تعریف اور خوشامد بھی خوش نہیں کرتی'' چوچک جل بھن کر سوچتی رہی۔

''اف روزانہ ہی اتنے برتنوں کا ڈھیر جمع ہو جاتا ہے'' برتن پتیلے اٹھا کر اسٹور میں لے جاتی چوچک جلتی کلستی رہی۔ اس پل وہ بھول چکی تھی کہ مزے دار سنہرے باداموں والے حلوے اور کم مرچوں والے پھولے پھولے سفید چنوں کے خوش ذائقہ سالن کے ''سواد'' کی وجہ سے برتنوں کا ڈھیر جمع ہوا ہے۔ پہلے پہل بازاری سالن، وغیرہ ڈبوں میں بند آتے تھے سو کاموں میں اس کے لیے سو طرح کی سہولتیں تھیں۔ مگر اب چوچک تربوز جتنا منہ سجائے ملشہ کی ہدایت کے مطابق جالے اتارنے لگی۔

☆☆☆

اماں بی قمر سلطانہ کا یہ سبزہ زار کی کالونی میں بنا پانچ منزلوں پر مشتمل کوٹھی نما مکان کچھ کچھ جدت لیے ہوئے تھا۔

''وہ پڑھی لکھی معاملہ فہم خاتون تھیں۔ شوہر بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ گھر میں بہت خوشحالی تھی۔

شوہر کو بیٹی کا بہت شوق تھا۔ اسی شوق کے پیش نظر ان کے ہاں سات بیٹوں کی ادت ہوئی۔

منیر، معراج، منہاج، مکرم، موسی، موثق اور مہد یار، سات صحت مند اور ذہین بیٹوں کی ں بن کر بھی وہ عجز وانکساری کا پیکر تھیں۔ بچے ذہین تھے سو انہوں نے تعلیم کے معاملے میں

والدین کو مایوس نہیں کیا تھا۔

منیر کو دوہا میں جاب مل گئی تو دادی کو سب سے بڑے پوتے کو بیاہنے کا شوق ہوا۔ آناً فاناً لڑکی پسند کی گئی جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا حساب ہوا۔ منیر کو پاکستان بلوایا گیا۔ ادھر لڑکی والے بھی گویا تیار بیٹھے تھے۔ شادی ہوئی۔ بارات گئی بڑی شان و شوکت سے پہلی پہلی بہو تھی سو دادی ساس نے بھی جی بھر کر ارمان نکالے۔ بتیس تولے سونا اور نہایت شاندار بری تیار کروائی گئی۔ ولیمہ ہوا، پھر چوتھی کی رسم اور اس کے بعد ابھی دادی ساس اور قمر سلطانہ کے چاؤ پورے نہیں ہوئے تھے جب بہو بیگم نے اعلان کر دیا وہ میاں کے ساتھ دوہا جانا چاہتی تھی۔

ان ساس، بہو نے دبی دبی آواز میں بیٹے کو سمجھانا چاہا۔ وہ سال دو سال صائمہ کو پاس رکھنا چاہتی تھیں مگر صائمہ نے نہ جانے کیا کیا میاں کے کان میں پھونک رکھا تھا۔ اس نے ماں اور دادی کی ہر بات گویا چٹکیوں میں اڑا دی۔ صرف تین مہینے بعد صائمہ دوہا چلی گئی تھی۔ محبوب صاحب نے بیٹے کے اس عمل پر نہ تنقید کی نہ تعریف۔ حالانکہ انہیں بھی بہو سے بیٹیوں والے ''سکھ'' کی خواہش تھی۔

بہر حال بیٹے کی خوشی ان ساس، بہو کو بھی مقدم تھی۔ اسی طرح کچھ وقت مزید سرک گیا۔ منیر کے پانچ سال میں تین بیٹے ہوئے۔ ادھر محبوب صاحب اپنی والدہ اور بیوی پر نہ بھروسہ کرتے ہوئے منہاج اور معراج کے لیے اپنے دیرینہ دوست خوشی محمد کی بیٹیوں کو پسندیدگی کی سند بخش آئے۔

پہلی بہو ان کی والدہ کی پسند سے آئی تھی۔ دوسری دونوں کو وہ خود پسند کر کے بالا ہی بالا تمام معاملات طے کر آئے۔ اس دفعہ پھر قمر سلطانہ دل مسوس کر رہ گئیں۔ اپنی پسند سے بہو لانے کا ارمان دل کے نہاں خانوں میں دبا کر شوہر کی رضا میں راضی ہو کر ایک دفعہ پھر جوش و خروش سے بری کی تیاریاں کرنے لگی تھیں۔

منیر سے شادی کے سلسلے میں رابطہ کیا تو اس نے اپنے ذاتی اخراجات کی طویل ترین دکھ بھری داستان سنائی کہ کہ اماں کی آنکھیں جل تھل ہو گئیں۔ ان کا بیٹا پردیس میں تنہا، اکیلا پریشان تھا سو انہوں نے اپنی طرف سے بیٹے کو نہ پریشان کرنے کا عہد کر کے فون رکھ دیا۔ حالانکہ شادی کے بعد منیر نے کبھی مہینوں بعد ڈرافٹ، منی آرڈر یا کسی کے ہاتھ تھوڑی بہت رقم بھجوانے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

معراج گورنمنٹ ملازم تھا۔ اس کی جاب بھی بہت اچھی تھی نادیہ بھی اسی محکمے سے وابستہ سرکاری آفیسر تھی۔

منہاج مقامی کالج میں پروفیسر تھا۔ اور نائلہ محکمہ تعلیم میں اس وقت جونیئر آفیسر تھی بعد میں ترقی کی منازل طے کرنے کے بعد اس وقت وہ ڈپٹی ایجوکیشن کے عہدے پر فائز تھی۔

دونوں بہنیں بلا کی ذہین تھیں۔ اپنی ''ذہانت'' کا بروقت استعمال کرتے ہوئے سب سے پہلے تو انہوں نے دوسرے اور تیسرے نمبر والے پورشنز پر اپنا تسلط جمایا تھا اور بعد میں سسر صاحب سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب وہ مزید بیٹوں کی شادی سے پہلے اوپر ایک اور منزل تعمیر کروالیں۔

اوپر والے دونوں پورشنز جدید طرز تعمیر کا شاہکار تھے۔ چار بیڈ رومز، اٹیچ باتھ، کچن، اسٹور، لاؤنج اور وسیع و عریض صحن نما بالکونیاں۔ محبوب صاحب بہوؤں کا مشورہ اچھی طرح سمجھ چکے تھے اسی لیے انہوں نے بینک میں جمع شدہ رقم سے اوپر دو اور پورشنز تعمیر کروا دیئے۔

سب سے نیچے اماں بی رہائش پذیر تھی۔ یہ والا حصہ اپنی جگہ بہتر تھا مگر جب لاؤنج سے اوپر کو جاتی سیڑھیوں سے نادیہ اور نائلہ کے پورشن کا ایک چکر لگانے کے بعد نیچے والا حصہ کافی پسماندہ سا لگتا تھا۔ نیا نکور جہیز اور فل کارپٹڈ بیڈ رومز، یوں لگتا گویا کسی سپر لگژری کشادہ سے فلیٹ میں قدم رنجہ فرما لیا ہے۔ اوپر والے لاؤنج بھی خوب ڈیکوریٹڈ تھے۔ دبیز کارپٹ، اسٹائلش سے گلدان اور سینریاں، ٹی وی شوکیس میں سجی کتابیں۔ ایک ٹھنڈا ٹھنڈا سا فرحت بخش احساس سرشار سا کر دیتا تھا۔

صائمہ جہیز نہیں لائی تھی۔ شاید وہ پہلے سے ہی یہاں نہ رہنے کے ارادے سے آئی تھی۔ سو نیچے اماں بی کا پرانا اور بد وضع سا سامان پڑا تھا لکڑی کے بھاری پایوں والے پلنگ، چار پائیاں اور لاؤنج میں رکھا تخت سستی سے ویلوٹ کا پرانا صوفہ، دو کرسیاں اور ایک لکڑی کی سولہ کرسیوں والی میز، یہ میز اپنی چمک دمک قائم رکھے ہوئے تھی شاید اس لیے کہ یہ میز اماں بی کے جہیز کی نہیں تھی۔

مکرم کے لیے بڑی اماں (ساس) اپنی نواسی بسمہ کو لے آئیں تب بھی قمر سلطانہ کی خاموشی نہ ٹوٹی وہ اپنی فرمانبرداری پر کوئی حرف لانا نہیں چاہتی تھیں۔ ساس اچھی صورتوں پر فدا ہو جاتی تھیں سو اس لیے ان کے آنگن میں کافی حسین چہرے جلوہ افروز تھے۔

نہ جانے یہ خوش قسمتی تھی کہ بدنصیبی، ان کی ساری بہویں ملازمت پیشہ تھیں بسمہ نے فیشن ڈیزائننگ میں ماسٹرز کیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے اپنا ذاتی بوتیک اسٹیبلش کرلیا اور مصروف سے مصروف تر ہوتی چلی گئی۔ بڑی اماں بہوؤں کے رنگ ڈھنگ سے دلبرداشتہ ایک رات سوئی تو پھر نہ اُٹھ سکیں پوتوں کی بیویوں سے خدمت کروانے کا ارمان لیے بے چاری آخری سفر پر روانہ ہوگئیں۔ اماں بی کو ساس کا بہت سہارا تھا۔ ان کے دم سے اماں بی کا دل بھی لگا ہوا تھا مگراب وہ تھیں اوراتنے بڑے بھاں بھاں کرتے گھر کی تنہائیاں۔

شوہر کی وفات کے بعد وہ اور بھی کم گو ہوتی چلی گئیں سب سے چھوٹا مہدان دنوں کراچی میں اپنی نانی کے پاس رہائش پذیر تھا دراصل قمر سلطانہ مہد کی دفعہ بہت بیمار ہوگئی تھیں۔ تبھی ان کی والدہ ننھے مہد کو لے کر کراچی چلی گئیں مہد بہت ذہین اور لا ابالی طبیعت کا کھلنڈرا سا نوجوان تھا۔ پڑھائی کے علاوہ اس کی اور بھی بہت سی مصروفیات تھیں نانی کے گھر اسے بہت توجہ اور محبت ملی تھی یہ خاص اہمیت اور بے تحاشا چاہت اسے بے حد مغرور کرتی چلی گئی اکلوتی مامی اوران کی لاڈلی دختر نازنین دونوں ہی مہد کو خاص توجہ سے نوازتی تھیں اور وہ بھی نازنین کے حسن پر فریفتہ تھا اور یہ بات ہے کہ اس اونچی ناک کی وجہ سے اس نے کبھی اظہار کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

موسیٰ نے ایک دوست کی شراکت کے ساتھ بزنس اسٹارٹ کرلیا تھا دونوں میں اس کے بزنس نے خوب پھلنا پھولنا شروع کردیا۔ انہیں دنوں منیر اور صائمہ کی ایک حادثے میں نتقال کی خبر نے اماں ی کو توڑ کر رکھ دیا۔ بدقسمتی تو یہ تھی کہ وہ بیٹے اور بہو کا آخری دیدار بھی نہیں کرسکی تھی دو مہینے بعد منہب، منیم، ملت اور مانیہ کو موثق دو ہا سے لے آیا تھا بچوں کے ننھیال والوں نے اس معاملے میں صاف جھنڈی دکھادی تھی۔

وقت دھیرے دھیرے سرک رہا تھا موسیٰ نے ماں کو لڑکی ڈھونڈنے کے مشکل اور تکلیف دہ مرحلے سے گزرنے نہیں دیا اور خود ہی اپنے بزنس پارٹنر کی بہن سونیا کو بیاہ لایا یہ اور بات ہے کہ سونیا دلہن بنی سیدھی اپنے فلیٹ میں جا پہنچی۔

خیر سے سونیا کی شادی کو بھی اب تو آٹھواں سال لگا تھا اس کے بھی تین بیٹھے تھے منیر کی بیٹی فی الحال اماں بی بی کی اکلوتی پوتی تھی شاید اسی لیے مانیہ انہیں سب بچوں میں زیادہ عزیز تھی نیا نیا اس نے کالج جانا شروع کیا تھا نئی کتابیں، یونیفارم، شوز اور دیگر اخراجات پر کافی رقم اٹھ گئی تھی جس کی وجہ سے اماں بی کی تجوری بھی خالی ہوچکی تھی سب بیٹے چند ایک ہزار مہینے کے

شروع میں بچوں کے اخراجات کے لیے اماں کے ہاتھ میں تھما دیتے۔ گھر کا راشن اماں بی کی پینشن سے آتا تھا سب کے لیے کھانا نیچے ہی پکتا مگر مجال ہے جو ایک دن بھی کسی بہو نے نیچے آکر اکٹھے کھانا کھانے کی کوشش کی ہو۔ دفتروں سے آنے کے بعد دو منٹ کے لیے رک کر اماں بی کی خیریت پوچھنے کے بعد جوں ہی وہ اوپر جاتیں تو پھر نیچے صبح ناشتے کے وقت ہی ان کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

جب تک اماں بی میں ہمت تھی بڑے شوق اور اہتمام سے دیگ نما دیگچی میں دونوں وقتوں کا کھانا پکتا۔ اپنے ہاتھوں سے نرم نرم پھلکے اتارتیں۔ بچوں کی فرمائشیں پوری کرتیں۔ آلو کے چپس، مٹریاں اور اخروٹ کی ٹافی بنا کر رکھ لیتی تھی اسکول سے آنے کے بعد بچے سیدھے دادی کے پاس آجاتے تھے پھر بچوں کی ماؤں کو احساس ہوا کہ ان میں منیرز اور ایٹی کیٹس کی کمی ہوتی جارہی ہے بچے چھری، کانٹے کا استعمال بھولتے جارہے ہیں تبھی بچوں کے نیچے آنے پر پابندی عائد ہوگئی اب وہ صرف مخصوص وقت میں باہر کھیلنے کی غرض سے دادی کے پاس آتے تھے ویسے بھی عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ بچوں کی ترجیحات بھی بدل رہی تھیں۔

گھر کے کاموں کے لیے پہلے چوچک کی ماں چاندنی آیا کرتی تھی جب سے اسے ٹی بی کا مرض لاحق ہوا تھا نادیہ اور نائلہ نے چاندنی کے گھر آنے پر بین لگادیا۔ اماں بی کے دبے دبے اعتراض پر وہ دونوں بہنیں ہی انہیں قائل کرنے کی غرض سے میدان میں کود پڑیں۔

''اماں بی بی! ٹی بی تو بہت اچھوت کی بیماری ہے کھانس کھانس کر سارے گھر میں تھوکتی رہتی ہے بیس سال تک اس تھوک کے جراثیم جگہ نہیں چھوڑتے بچے تو ہوتے ہی بہت حساس اور نازک ہیں جلد اثر قبول کرلیتے ہیں''

''تو یہ کیا بات ہوئی'' اماں بی بہو کی نرالی منطق سن کر خفا ہوگئیں۔

''بہرحال چاندنی کو اب کام پر آنے کی ضرورت نہیں بلکہ چوچک کو بھی رہنے دیں۔ مجھے تو وہ بھی دمے کی مریضہ لگتی ہے میں نے تو ہاشمی صاحب کی ملازمہ بانگی کو دو ہزار ماہوار تنخواہ پر رکھ لیا ہے'' نائلہ نے ناک چڑھا کر اطلاع دی۔

''دو ہزار۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے'' اماں بی نے دہل کر کہا'' چوچک بے چاری بارہ سو میں پورے گھر کا کام کرتی ہے''

''اب اماں بی! مہنگائی بھی تو دیکھیں نا۔ اور پھر بانگی ہے بھی تو بانکی سجیلی، صاف

ستھری، سمجھدار روزانہ نہا کر آتی ہے۔ بچے بھی خوش ہیں'' نادیہ نے بھی سنجیدگی سے کہا۔ وہ ان کی سب بہوؤں میں زیادہ سنجیدہ مزاج اور بردبار تھی۔

''لو بی بی! اگر ساس کو بھی ٹی بی یا دمہ ہو گیا تو کیا مجھے بھی اٹھا کر باہر کرو گی۔ ایسی بھی کیا نزاکتیں'' اماں بی کا غصہ کسی طور کم نہ ہوا۔ ویسے بھی بڑھاپے کی منازل طے کرنے کے ساتھ ساتھ وہ کافی روکھے مزاج کی ہوتی جا رہی تھیں۔

''بس میں نے کہہ دیا ہے کہ چوچک ہی نیچے والے پورشن میں کام کرے گی۔ تم لوگ اپنی من مانیاں کرتی پھرو''

''یوں کریں چاچی! اخبار میں ایڈ دے دیں کہ ہمیں ایک عدد صاف ستھری، خوبصورت، پڑھی لکھی تمام بیماریوں سے پاک میڈ کی ضرورت ہے۔ براہ مہربانی ضرورت مند ملازمائیں مندرجہ بالا خوبیاں اگر خود میں پائیں تو اس ایڈریس پر رابطہ کرلیں'' منہب دادی کے کپڑوں کو جما جما کر استری کرتے ہوئے مزے سے بولا۔

''ایڈ میں ان دوسطروں کا بھی اضافہ کرلیں کہ میڈیکل چیک اپ لازمی کروانا ہے ورنہ ہمارے گھر میں ایک عدد ڈاکٹر موجود ہے۔ رپورٹس غلط دکھا کر بے ایمانی کی گئی تو الٹا لٹکا دیا جائے گا'' ملت نے بھی ٹانکا جوڑا۔ چوچک آج چھٹی پر تھی۔ سونیم اور مانیہ دونوں صفائی ستھرائی میں مصروف تھے دونوں نے جھوٹے منہ بھی اپنی اپنی کام والی کو نیچے بھیجنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ بلکہ کافی غصے کے عالم میں نائلہ اٹھ کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

''چاچی! آج دوپہر کا کھانا بنانے کی ڈیوٹی آپ کی ہے'' مانیا جھاڑو پکڑے۔ اسٹور سے برآمد ہوئی۔

''میں نے تو مشین لگا رکھی ہے۔ بچوں کے کپڑے ٹیلر کو دینے جانا ہے۔ میری امی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔ سوچا تھا آج کھڑے کھڑے امی کا حال چال پوچھ آؤں گی'' نائلہ کو اور بھی بہت سے کام یاد آنے لگے تھے سو تفصیل سنانے کی غرض سے دوبارہ نیچے آگئی۔

''تو اس کا مطلب ہے آج پھر نان اور کباب کھانے پڑیں گے'' ملت نے منہ بنا کر کہا۔

''ایک بات کہوں دادی!'' منیم ڈسٹنگ کرتے ہوئے پرسوچ آواز میں بولا۔

''بولو، جتنا مرضی بولتے رہو۔ یہاں کسی پر اثر نہیں ہوگا'' اماں بی بے زاری سے تخت پر لیٹ گئیں۔

''آپ موثق چاچو کی شادی کسی کام والی سے کردیں۔ ہمارے سارے مسائل حل ہو جائیں گے ایک تو مفت میں کام اور دوسرے بڑی چاچیوں کی طرح کم از کم نخرے تو نہیں دکھائے گی موثق چاچو کی بیوی'' منیم نے اپنی عقل کے مطابق نہایت احمقانہ بات کی تھی۔

''ماشاءاللہ، میرے بھتیجے نے کیا خوب سمجھداری کی بات کی ہے۔ میرا اسٹینڈرڈ تو ان نوکرانیوں تک محدود ہے نا'' موثق اسی وقت گھر میں داخل ہوا تھا۔

''یوں کرو۔ اپنے مہد چاچو کے لیے اس بارے میں سوچو۔ کیا پتا وہ تم لوگوں کی خواہش پوری کرے''

''ارے۔ اس مہد کو دیکھو، آٹھواں دن ہے آج اور اس نے کوئی فون نہیں کیا'' اماں بی ایک دم پریشانی سے اٹھ بیٹھیں۔

''منہب! ذرا کراچی کال تو ملادو''

''اس وقت تو مہد آفس میں ہوگا'' موثق نے لاپرواہی سے بتایا۔

''آفس'' اماں بی حیران رہ گئیں۔

''مہد نے نوکری کرلی۔ اور مجھے بتایا بھی نہیں''
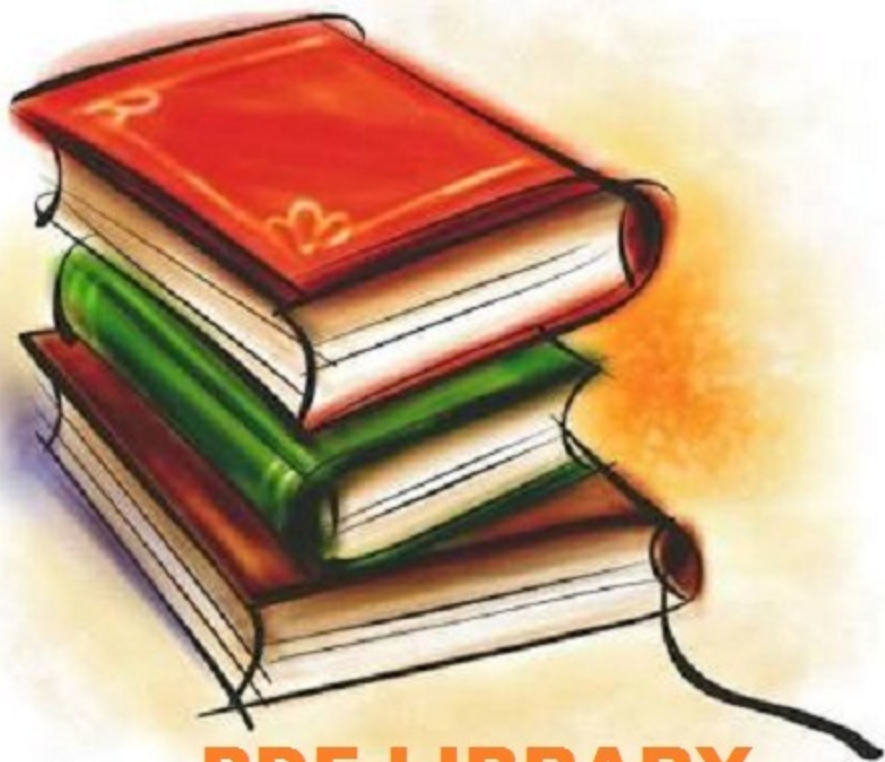
''دو ماہ ہو چکے ہیں اسے جاب کرتے ہوئے۔ بڑی اچھی جاب ہے اس کی آفس کی طرف سے گھر اور گاڑی کی سہولت بھی ملی ہے مامی اور نازنین پرانا مکان چھوڑ کر مہد کے ساتھ رہ رہی ہیں'' موثق نے اماں بی کی حیرانی دور کرنا چاہی۔

''مہد چاچو نے تو نہیں بتایا'' مانیا خوشی سے چہکتی ہوئی کام چھوڑ کر آگئی۔

''مہد نے کب فارمیلٹیز نبھائی ہیں۔ بہرحال ہماری طرف سے بھی مبارکباد دے دیجیے گا۔'' نائلہ بھابھی جاتے جاتے رک کر معنی خیزی سے کہتی ہوئی چلی گئی۔ اماں بی سوچوں میں گم خاموش بیٹھی تھیں۔ وہ پریشان اس لیے نہیں تھیں کہ ثریا اور نازنین مہد کے ساتھ کیوں رہ رہی ہیں بلکہ انہیں مہد کے رویے نے تکلیف دی تھی ''مہد نے کیوں مجھے بے خبر رکھا'' یہی بات انہیں مضطرب کررہی تھی۔

مہد کو اپنی ماں کے حوالے کر کے وہ مطمئن ہو چکی تھیں مگر انہوں نے اپنے بیٹے کو کسی پر بوجھ بننے نہیں دیا تھا۔ ایک مخصوص رقم وہ مہینے کے شروع میں کراچی بھجوادیا کرتی تھیں۔ یہ سلسلہ ان کی والدہ کی بیماری کے دوران اور وفات کے بعد تک بھی جاری تھا۔ ابھی

پچھلے مہینے انہوں نے سات ہزار روپے کراچی بھجوائے تھے اگر مہد کو جاب مل گئی تھی تو پھر اسے وہ رقم اپنے پاس نہیں رکھنی چاہئے تھی۔ کیا اسے نہیں پتا تھا کہ ان پر چار بچوں کی ذمہ داریاں ہیں اور اس کے بھائی چند ایک نوٹ پکڑا کر اپنا فرض ادا کرنے کے بعد پوچھتے تک نہیں ابھی وہ انہیں سوچوں میں گم بیٹھی تھیں جب مہد کا فون آ گیا۔

''کیسی ہیں آپ؟ طبیعت ٹھیک ہے؟ میں کچھ دن تک چکر لگاؤں گا۔ بچے ٹھیک ہیں؟ میں نے ناظر کے ہاتھ کچھ پیسے بھجوائے ہیں۔ کسی چیز کی ضرورت ہوتو بتایئے گا''

''کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ تو یہ بتا نوکری لگ گئی ہے کیا'' اماں بی کی آواز میں خوشی بھی تھی اور ناراضی بھی۔

''جی اماں''

''تو نے بتایا نہیں'' شکوہ لبوں پر مچل ہی گیا۔

''میں خود آ کر آپ کو بتانا چاہتا تھا۔ موثق نے میرے سرپرائز کا بیڑہ غرق کر دیا ہے''

''کب آؤ گے'' اماں بی نے پوچھا۔

''چند دن تک آؤں گا۔ ثریا مامی کا چیک اپ کروانا ہے۔ ڈاکٹر سے ٹائم لے رکھا ہے۔'' اس نے تفصیلاً بتایا۔

''میری طرف سے بھی پوچھنا ثریا کو۔ اور بیٹے آ کر ماں کو صورت دکھا جاؤ اپنی، نہ جانے آخری پہر کا یہ چراغ کب گل ہو جائے۔ میں نے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ یہ لو، مانیا بے چین ہے پہلے اس سے بات کرلو'' اماں بی نے کندھے سے لٹکتی مانیا کے ہاتھ میں ریسیور تھمایا اور نم پلکوں کو پونچھنے لگیں۔

☆☆☆

''کہاں جانے کی تیاری ہے؟'' نازنین نے کمرے میں جھانکا۔

''یہ دو تین شرٹس تو پریس کر دو'' نازنین کو دیکھ کر اسے فوراً کام یاد آ جاتے تھے۔

''لاؤ ادھر'' نازنین کمرے میں آ گئی۔ بیڈ پر کپڑوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ مہد اپنی ٹائیاں، رومال اور جرابیں وغیرہ علیحدہ علیحدہ کر کے رکھ رہا تھا۔ اس کے کپڑے لانڈری سے دھل کر آتے تھے البتہ پریس وہ خود کر لیتا تھا حالانکہ نازنین نے چھوٹی سی عمر سے اس کے تمام کاموں کی ذمہ داری اٹھا رکھی تھی۔

''کب واپسی ہوگی'' نازنین سمجھ چکی تھی کہ مہد کہاں جانے کی تیاری کر رہا ہے۔

''تقریباً ایک ہفتہ تو رہوں گا۔ بچے بہت مس کر رہے ہیں''

''میں ایک بات سوچ رہی تھی'' نازنین شرٹس پریس کرنے کے بعد کمرے کا پھیلاوا سمیٹتے ہوئے بولی۔

''صرف سوچا ہے، کہا کیوں نہیں؟'' وہ اطمینان سے صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ جانتا تھا کہ اب نازنین اس کی پیکنگ کردے گی۔

''تم پھوپھو اور بچوں کو یہاں کیوں نہیں لے آتے''

''کیا مطلب؟'' وہ حیران ہوا۔

''بھئی تمہاری جاب ادھر ہے سال دو سال تک تم یہاں رہو گے تو بہتر نہیں کہ روز روز آنے جانے کے چکروں سے نجات مل جائے گی۔ تمہارے لیے بھی آسانی ہوگی''

''اور اس فلیٹ میں اتنے لوگ کیسے سمائیں گے۔ ایک کمرہ میرے پاس ہے اور ایک تمہارے اور مامی کے پاس، زوہیب ڈرائنگ روم میں سوتا ہے جبکہ اماں تو اس ڈربے کو دیکھ کر گھبرانے لگیں گی''

اس نے بڑے اطمینان سے اس سپر لگژری فلیٹ کو ڈربے کا نام دے دیا تھا فلیٹ بہت اچھی جگہ پر تھا مگر بیڈ روم صرف دو ہی تھے ایک فیملی با آسانی رہ سکتی تھی۔

''میں بھی چلوں تمہارے ساتھ۔ پھوپھو سے بھی ملنے کو بہت دل چاہ رہا ہے''

''اور مامی اکیلی رہیں گی'' مہد نے طنزیہ کہا۔

''رجو سے کہہ دوں گی۔ وہ امی کے پاس رہ لے گی دو چار دن'' اس نے فوراً پروگرام ترتیب دے لیا۔

''اور تمہارا آفس''

''بھاڑ میں جھونکو'' نازنین نے خفگی سے کہا۔ ''صاف صاف منع کیوں نہیں کر دیتے''

''پھر کبھی لے چلوں گا'' مہد نے پچکارا۔

''مہد! تم بہت برے ہو'' نازنین کے گلابی چہرے پر خفت کے آثار نمودار ہونے لگے۔

''مجھے پتا ہے'' وہ اسے چڑاتے ہوئے کہنے لگا

''کیا؟'' نازنین نے ناگواری سے بھنویں اچکائیں۔

''یہ کہ میں بہت برا ہوں۔اور تم''

''ہاں، ہاں، میں کیا ہوں۔بولو بتاؤ'' وہ تنک اٹھی۔

''تم، تم بہت اچھی ہو، سب سے اچھی'' مہد کے لبوں کی تراش میں مسکراہٹ تھی۔

نازنین کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

''جلدی آجانا'' وہ تاکید کرنا نہیں بھولی تھی۔

''او کے جناب'' مہد کورنش بجالایا۔

''اس شاپر میں کیا ہے'' نئے نکور شاپنگ بیگ پر نازنین کی نظر پڑی تو پوچھنے لگی۔

''ماثیہ، منہب اور منیم کے کپڑے ہیں'' وہ مصروف سے انداز میں بولا۔اسی صبح وہ چلا گیا تھا۔ثریا نے اس کے جانے کے بعد بیٹی سے کہا۔

''تم بھی ساتھ چلی جاتیں''

''مہد آپ کی وجہ سے نہیں لے گیا''

''ہوں۔ماشاء اللہ سے بڑا خیال رکھتا ہے ہمارا۔ہم نے بھی تو اولاد سے بڑھ کر چاہا'' ثریا کے لبوں پر محبت بھری مسکراہٹ تھی ایسے ہی بیٹوں جیسے داماد کی تو انہیں چاہ تھی۔

''تم نے بات کی مہد سے''

''ایک ہزار ایک مرتبہ تو کر چکی ہوں''

''کیا کہتا ہے وہ'' ثریا نے کچھ پریشانی کے عالم میں بیٹی کا چہرہ ٹٹولا۔شاید اس کے تاثرات سے کچھ اندازہ لگانا چاہ رہی تھیں۔

''کہہ رہا تھا ستائیس سالوں سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔شادی کے بارے میں جب بھی سوچا ہے تمہارا ہی چہرہ ذہن کی اسکرین پر جگمگانے لگتا ہے مگر اماں کی رضامندی زیادہ ضروری ہے'' نازنین نے خوشدلی سے کہا۔

''تو اسے کہنا تھا آپا سے بات کرلے۔میرا ارادہ جلد از جلد تمہاری شادی کرنے کا ہے تم اور مہد یہیں رہو گے میں گوجرہ بڑی آپا کے پاس چل جاؤں گی گھر کا کرایہ تو آتا ہی ہے'' وہ مستقبل کی پلاننگ کر رہی تھیں اور ادھر لوح محفوظ پر کچھ اور لکھا جا چکا تھا۔

☆☆☆

سید پور سے ایک میل دور دریائے توی ٹھاٹھیں مار رہا تھا یہ بجوات کا علاقہ تھا بارڈر کے

پاس اس کا پسماندہ سا گاؤں۔وہ اکیس سال بعد اپنے گاؤں اماں کی وفات پر آئی تھی بہت بچپن میں تائی نے اسے گود لے لیا تھا اسی لیے زندگی کا ایک بڑا حصہ واہ کینٹ میں گزرا تھا تایا فوج میں ملازم تھے ریٹائرڈ ہونے کے بعد بھی انہوں نے گاؤں کا رخ نہیں کیا تھا ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی تائی نے اپنی بہن کے ایک بیٹے کو بھی فرزندی میں لے رکھا تھا کاظم ان دنوں کویت میں ملازمت کی غرض سے مقیم تھا۔تایا، تائی کو اس نے اپنے پاس بلوا لیا تھا۔

جانے سے پہلے تایا اس کی شادی کر دینا چاہتے تھے مگر اماں کی اچانک وفات کی وجہ سے تایا اور تائی نے خاموشی اختیار کرلی ویسے بھی ان کی بے انتہا کوششوں کے باوجود کوئی مناسب رشتہ فی الحال ان کی نظر میں نہیں تھا تائی بہت پریشان تھیں اس پریشانی میں ان کی سیٹ کنفرم ہو گئی اور وہ دونوں ڈھیروں دعائیں دے کر پردیس کے لیے رخصت ہو گئے تھے اس نے انہیں ہر طرح سے اطمینان دلایا تھا وہ تعلیم یافتہ باشعور لڑکی تھی کہیں بھی جاب کر کے خود کو مصروف رکھ سکتی تھی۔مگر تائی مطمئن نہیں تھیں جبھی تو انہوں نے جانے سے پہلے اپنی کسی کزن کو خط لکھ کر نہ جانے کون کون سی داستانیں سنا ڈالی تھیں۔ابھی تک جوابی خط موصول نہیں ہوا تھا وہ منڈیر کی دیوار سے ٹیک لگائے سوچوں میں گم بیٹھی تھی تبھی پھوپھی کی آواز سنائی دی۔

''چندا! او چندا!!''

''کیا ہے پھوپھی؟'' اس نے منڈیر سے نیچے جھانکا۔

''شام کا سماں ہے نیچے آجا'' پھوپھی نے پچکارا۔

''اسے بھوت پریت کا کیا خدشہ، یہ کون سا حور پری ہے'' اس کی پھوپھی زاد نے طنزیہ کہا تھا اور پھر قل قل ہنسنے لگی۔چندا ایک دفعہ پھر سوچوں کے بھنور میں ڈوبنے ابھرنے لگی تھی دور بہت دور جموں کے پہاڑ دکھائی دے رہے تھے اس طرف کے آسمان کا رنگ کسی قدر سرخی مائل سیاہ تھا اونچے اونچے مٹی کے ٹیلوں پر ننگ دھڑنگ بچے اچھل رہے تھے اسے بچے بہت اچھے لگتے تھے گندے، ستھرے، گورے، سانولے، ہر طرح کے بچوں کو دیکھ کر اس کے دل میں عجیب سی محبت کا طوفان امڈنے لگتا تھا ہر لڑکی کے اندر مامتا چھپی ہوتی ہے اسے لگتا تھا اس کے دل کا پیالہ کچھ زیادہ ہی ممتا سے لبریز ہے۔

واہ کینٹ میں وہ محلے کے بچوں کو مفت ٹیوشن پڑھاتی تھی۔اپنے جیب خرچ سے مونگ پھلی، ٹافیاں، نمکو کے پیکٹ خرید کر رکھ لیتی اور پھر وقتاً فوقتاً ان بچوں میں بانٹ دیا کرتی اور

جب وہ اس کے گال پر پیار کر کے نرمی سے بولتے ''چندا آپا! آپ بہت اچھی ہیں'' تو اس کی آنکھیں محبت کے اس مظاہرہ پر چھلکنے لگتیں۔

اسے بہت کم رشتے میسر آئے تھے اور جو تھے اب وہ بھی پاس نہیں تھے۔

''چندا آپا! چندا آپا'' مکان کے پچھواڑے سے آواز آئی تھی۔ راول اسے بلا رہا تھا چندا نے دوپٹہ سر پر جما کر نیچے جھانکا۔

''کیا ہے راول''

''آپا! بیر لے لوں''

''اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے''

''آپ خود ہی تو کہتی ہیں جو بھی کام کرو بڑوں سے پوچھ کر کرو'' راول مدبر بنا۔

''اچھا، اچھا۔ اس وقت بیر نہ ہی توڑو تو بہتر ہے''

''کیوں آپا''

''درختوں کو اس وقت نیند آجاتی ہے'' چندا نے اسے سمجھانا چاہا۔

''درخت بھی سوتے ہیں؟'' اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرانی در آئی۔

''درخت سنتے بھی ہیں، سانس بھی لیتے ہیں۔ صرف بول نہیں سکتے''

''یہ بیری کا درخت ہماری باتیں سنتا ہے'' راول کو گویا یقین نہیں آیا تھا۔

''ہاں، اب تم گھر جاؤ۔ رات کے سائے بڑھنے لگے ہیں'' وہ خود بھی کچی مٹی سے بنی سیڑھیوں کو پھلانگتی نیچے آگئی۔

پھوپھی دودھ میٹھا کر رہی تھی۔ شمو چارپائی پر لیٹی تھی جبکہ بالا روٹی کھانے میں مگن تھا۔ اس کے بعد سونے کی تیاری، چاہے نیند آئے یا نہ آئے چارپائی پر چادر تان کر لیٹنا ضروری تھا اکثر سونے کی ایکٹنگ کرتے کرتے وہ تھکن سے چور ہو جاتی۔ جسم اکڑ جاتا اور وہ کروٹ بدلنے کی خواہش دل میں دبائے دبکی رہتی صبح کا آغاز منہ اندھیرے ہوتا تھا پھوپھی بھی نماز کی پابندی کرتی تھی۔ اس لیے چندا کو اپنے ساتھ ہی جگا لیتی۔ نماز پڑھنے کے بعد وہ دونوں قرآن پاک کی تلاوت کرتی تھیں پھر پھوپھی اپنے جانوروں کے ساتھ مصروف ہو جاتی۔ چارہ کاٹنا، دودھ دھونا۔ پانی بھرنا اور پھر مچھلی کا جال پکڑ کر دریا کی طرف نکل جانا۔ پھوپھی کے کاموں کی فہرست بہت طویل تھی۔ وہ اس کا دل بہلانے کی غرض سے اسے بھی

ساتھ مصروف رکھتی۔

پھوپھی کا لوکاٹ کا کھیت تھا۔ بیر سے کچھ بڑے گول گول رس بھرے لوکاٹ اسے بہت پسند تھے۔ روزانہ پھوپھی ٹوکرا بھر کر لوکاٹ اتار کر لاتی اور پھر بالا شہر جا کر انہیں بیچ آتا۔ اکثر پیسے دینے کے معاملے میں وہ ڈنڈی مار جایا کرتا تھا۔

ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا لیے پھوپھی جب ہڈی پسلی ٹوٹنے کے نتائج کی پرواہ کیے بغیر بالے کی کمر پر، ٹانگوں پر برساتی تو بالا خود بخود سچ اگل دیتا۔

''اماں! پپو کا قرض دینا تھا'' اسے فلموں کا چسکہ تھا۔ پپو کی دکان پر بیٹھا سارا دن آنکھیں سینکتا رہتا۔

پھوپھی اپنے حصے کی دس مچھلیاں لائی تھی جو کہ ایک سو بارہ روپے کلو کے حساب سے بک گئیں۔

رسوئی میں سے بڑے مزے کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ چندا رہو مچھلی کا سالن پکا رہی تھی۔ پچھلی مرتبہ شمو کے ہاتھوں سے بنا سالن دیکھتے ہی گویا ابکائی آگئی۔ عجیب سی ناگوار بو اٹھ رہی تھی سالن میں سے کہ صدا کے ندیدے بالے نے بھی ہاتھ سے رکابی پرے کھسکا دی۔

پھوپھی سوہانجنہ اور چقندر کا اچار ڈال رہی تھی ایک کونڈے میں کٹے ہوئے کریلے اور لیموں رکھے تھے راول کچے آم توڑ کر لایا تھا اور چندا آم کی چٹنی بنا رہی تھی کچھ دور سکھ چین کی گھنی چھاؤں میں لگے تندور میں ماسی بختاں روٹیاں لگا کر سفید مکھن کی ڈلی ان پر رکھتی جاتی تھی۔

شموں نے پھوپھی کے کئی دفعہ جھاڑنے پر دسترخوان بچھا کر بالآخر برتن بھی چن ہی دیئے چندا گھڑے میں سے تازہ پانی جگ میں ڈال کر لے آئی۔ پھر اس نے ٹھنڈے، میٹھے رسیلے آم کاٹ کر ایک ٹرے میں ترتیب سے قاشیں رکھ دیں۔ اس پل لکڑی کے دروازے پر زوردار دستک ہوئی تھی۔ راول بھاگتا ہوا دروازے تک گیا۔ چندا بھی کچھ حیران سی بیرونی دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ یہاں دستک کا کوئی رواج نہیں تھا اس کی حیرانی فطری سی تھی تبھی لاکھیا رنگ کا قیمتی نفیس سا سوٹ پہنے ایک بہت ہی سرخ وسفید رنگت کی اکہتر سالہ بوڑھی خاتون اندر داخل ہوئیں۔ ان کے پیچھے ایک کم عمر لڑکا اور ایک وجیہہ سا نوجوان بھی تھا۔

وہ خاتون پھوپھی سے اپنا تعارف کروا رہی تھیں۔

''میں قمر سلطانہ ہوں۔ افسر ممتاز کی سہیلی اور چچا زاد بہن۔ ملشہ کو لینے آئی ہوں'' چندا

نے گھبرا کر لکڑی کے کواڑ کو تھام لیا۔ اس کے دل کی دھڑکن غیر معمولی رفتار سے چل رہی تھی۔

☆☆☆

''نکاح۔ چندا آپا تیرا نکاح ہوگا۔ آج، ابھی اور اسی وقت'' بالا اور راول لڈی ڈال رہے تھے وہ دونوں بہت خوش تھے کیونکہ قمر سلطانہ نے دونوں کو ہزار ہزار کا ایک ایک نوٹ پکڑایا تھا۔

''دیکھ تو چندا! تیری ساس پوری تیاری سے آئی ہیں۔ کتنا پیارا جوڑا ہے اور دیکھ یہ سونے کا اصلی زیور'' صدا کی نک چڑھی شمو کی زبان سے گویا شہد ٹپک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ کچھ رشک کی چمک اڈ رہی تھی۔ وہ بار بار سانولی سلونی، معمولی سے نقوش والی چندا کو بغور دیکھ رہی تھی۔ مامی نے بتایا تھا چندا نے ایم کام کر رکھا ہے مگر شمو کو تو قطعاً یقین نہیں آتا تھا کہ چندا آپا اتنا ڈھیر سارا پڑھ کر آئی ہے۔ اس کی شخصیت ہی ایسی بجھی بجھی سی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا معمولی سا لباس، نہ رنگ نہ روپ نہ ہی ظاہری چمک دمک اور نہ ہی اعلیٰ تعلیم پر اکڑ مغروری۔ وہ تو شکل سے ہی پرائمری پاس لگتی تھی یہ شمو کا ہی نہیں اس کی سہیلیوں کا بھی خیال تھا اور اس کے اس ذاتی قسم کے خیال پر تصدیق کی مہر سلطانہ خالہ کے پوتے نے لگا دی تھی جو کہ اپنے چاچا کے کان میں کھسر پھسر کر رہا تھا۔

''چاچو یار! کہاں قسمت پھوٹ گئی ہے آپ کی، چاچی کی شکل دیکھ کر لگتا ہے گویا انہیں الف انار اور ب بکری کا بھی نہیں پتا۔ اتنی ہونق سی تو ہیں مجھے تو یقین ہے انہوں نے اسکول کے درشن تک نہیں کئے'' منہب روہانسا ہو رہا تھا اسے اپنے مستقبل کی فکر تھی شہر کی پڑھی لکھی چاچیوں نے ان کے ناک میں دم کر رکھا تھا یہ تو پھر گاؤں کی گنوار تھی۔ نہ جانے انکا کیا حشر کرتی۔

اس نے تو دادی کی بھی بہت منتیں کی تھیں کہ اپنے ارادہ کو بدل لیں مگر نہ جانے دادی پر کون سی دھن سوار تھی۔ شاید بچھڑی سہیلی کی التجاؤں کا اثر تھا یا پھر برسوں پرانی دل میں چھپی اپنی پسند کی بہو لانے کا ارمان انگڑائیاں لے کر جاگ اٹھا تھا۔ آناً فاناً گاؤں کی خواتین جمع ہو گئیں۔ مولوی صاحب تشریف لے آئے۔ نکاح ہوا۔ چھوارے بٹے اور مبارک سلامت کے شور کو سن کر منہب کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اس نے ایک دفعہ پھر اپنی دوربین جیسی نظروں کو چاچو کے چہرے پر فٹ کر کے کچھ ناگواری، غصہ اور دکھ کے ملے جلے تاثرات ڈھونڈنے چاہے۔ مگر ایک سو بیسویں دفعہ بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ مہد کا چہرہ پہلے کی طرح سپاٹ تھا۔ منہب جل بھن کر رہ گیا۔ ماسی بختاں روح افزاء والے دودھ سے مہمانوں کی تواضع کر رہی تھی۔ ایک گلاس مہد کی خدمت

میں بھی پیش کیا گیا تھا۔ مہد نے شائستگی سے معذرت کر لی۔ البتہ منہب کو مروتاً گلاس پکڑنا پڑا تھا جوں ہی اس نے گلاس لبوں سے لگایا اسے زوردار ابکائی آنے لگی۔

''مجھ سے نہیں پیا جاتا''

''تو رکھ دو۔ اتنا ندیدہ بننے کی کیا ضرورت ہے'' مہد نے اسے ڈپٹا۔

''آپ خاموشی سے بیٹھیں۔ دولہا بولتا نہیں''

''تسی بھائی صاحب دے بھرا ہو جی'' کسی منچلی نے لہک کر پہلے سے جلے سڑے منہب سے پوچھا تھا۔

''نہیں، تمہیں کیا لگتا ہے، اٹھائی گیرا ہوں، چور اچکا ہوں''

''منہب!'' یہ آواز دادی کی تھی جو کہ خشمگیں نظروں سے تنبیہاً اسے گھور رہی تھیں۔

''سوری دادی'' وہ فوراً جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

''یہ میرا سب سے بڑا پوتا ہے'' دادی اب اسی گولا گنڈا ابنی محترمہ سے منہب کا تعارف کروا رہی تھیں۔ اس کے ماتھے پر مزید دو بل نمودار ہو گئے۔

''یہ آپ کے ساتھ سراسر زیادتی ہے، ظلم ہے۔ آپ احتجاج کیوں نہیں کرتے'' منہب مسلسل اسے بغاوت پر اکسا رہا تھا۔

''دادی کی جذباتی بلیک میلنگ کی نذر ہو کر آپ کی یہ بانکی سی جوانی اور سجیلی سی عمر ضائع ہو گی'' منہب کا تاسف کسی بھی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

''میں تو بطور چاچی کبھی بھی انہیں قبول نہیں کروں گا اور دیکھیے چاچو میں پہلے ہی آپ کو باور کروا رہا ہوں۔ اگر انہوں نے پنجابی فلموں کی ولن بن کر ہماری دادی کے خلاف یا ہمارے ساتھ کسی بھی قسم کی زیادتی کی تو میں خاموش نہیں رہوں گا۔ مجھے تو ابھی سے مستقبل کے اندیشے دہلا رہے ہیں۔ دیکھ لینا آستینیں چڑھا کر سر پر کپڑا باندھے روزانہ فساد کھڑا کر کے رکھیں گی محترمہ۔ ہمارے گھر میں ایک جنگ کا آغاز ہونے والا ہے۔

اوپر والی چاچیاں تہذیب کے دائرے میں رہ کر صرف زبان سے نشتر چلاتی ہیں۔ یہ محترمہ ہاتھوں اور پیروں کا استعمال بھی بے دریغ کریں گی ایک ہی وہٹی اور وہ بھی کھوٹی۔ آپ سے زیادہ سمجھدار تو موثق چاچو نکلے ہیں۔ ہفتہ بھر پہلے ڈاکٹر مسکان کا ہاتھ تھامے گھر لے آئے۔ ان کے تعارف پر خواہم خواہ سب پر لرزہ طاری ہو گیا تھا اب سوچتا ہوں انہوں نے اچھا ہی کیا

ہے آپ کی طرح بدھو نہیں ہیں وہ''

''ابھی بکواس بند کرو چھٹکے! گھر جا کر تیری انٹ شنٹ بکواس کا جواب دوں گا'' مہد نے اس کے پاؤں پر اپنا پیر مارا۔

''یہ تلملاہٹ مجھ پر نہیں اپنی بیگم پر نکالیے گا''

منہب جھلایا۔

''تم دونوں کیا بک بک کر رہے ہو'' قمر سلطانہ نے ناراضی سے انہیں ڈپٹا۔

''کچھ نہیں دادی! چاچو سے نیگ کے سلسلے میں ڈسکشن کر رہا ہوں'' وہ بوکھلا کر سیدھا ہوا۔ کچھ دیر بعد رخصتی کا شور اٹھا تھا اور مہد گہری سانس کھینچتا منہب کا ہاتھ پکڑے کھڑا ہو گیا۔

اس قدر ہنگامی شادی کے بارے میں اس نے کہاں سوچا تھا۔ وہ تو اماں کی محبت میں کشاں کشاں کراچی سے آیا تھا۔ اس کی آمد سے کوئی دو دن قبل اماں بی کو ایک خط موصول ہوا۔ بدقسمتی سے یہ خط اسی کے ہاتھوں ہی اماں تک پہنچا تھا۔ انہوں نے بے تابی سے لفافہ چاک کیا۔ خط کا متن کچھ یوں تھا۔

''پیاری بہن قمر سلطانہ'' منہب نے دادی کے ہاتھ سے خط کو اچک لیا اور بلند آواز میں پڑھنے لگا۔

''بہت عرصہ بعد تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ گردش ایام نے ایسے الجھایا ہے کہ خود اپنی بھی خبر نہیں رہی۔ تمہیں شاید اپنا وعدہ بھول چکا ہے یاد کرو کراچی میں ان دنوں جب میرے میاں کا ٹرانسفر ہوا تو ہم مکان کی وجہ سے کس قدر پریشان تھے''

''آں۔ ہاں'' کیوں نہیں یاد۔ بھلا وہ وقت بھلایا جا سکتا ہے اللہ بخشے اماں مرحومہ بھی اس وقت زندہ تھیں۔ افسر میرے ابا کی چچازاد بھائی کی بڑی بیٹی تھی۔ پہلے پہل بہت آنا جاتا تھا پھر آہستہ آہستہ مصروفیات زندگی میں مگن ہو کر ملنا ملانا چھوٹ گیا۔

ہماری دانت کاٹے کی دوستی تھی اور افسر کی اماں اور میری اماں منہ بولی بہنیں۔ بہت عرصہ تک اس نے خط و کتابت کے ذریعے میرے ساتھ رابطہ رکھنے کی کوشش کی تھی مگر اپنی نااہلی کے باعث میں نے اس کے ایک خط کا بھی جواب نہیں دیا تھا اور دیکھو اس کی محبت ابھی تک مجھے یاد رکھے ہوئے ہے'' منیب کو پتا ہوتا ''یہ یاد'' کرنا صرف اور صرف دادی کی سہیلی کی ''مطلب پرستی'' کی ایک کڑی ہے تو کبھی بھی اتنے جوش و خروش سے خط پڑھ کر نہ سناتا ادھر دادی، سہیلی کی

محبت میں پور پور ڈوبی آبدیدہ سی بیٹھی تھیں۔

''آگے بھی پڑھ کر سنا منہب!'' دادی کی آواز رندھی سی محسوس ہوئی تھی منہب کو۔ اس نے ایک دفعہ پھر خط پڑھنا شروع کیا۔

''تین سال تک ہم اکٹھے رہے تھے۔ تم بھی ہر چھٹیوں میں بچوں کے لے کر آ جایا کرتی تھیں۔ کتنا پیارا وقت تھا جو بیت گیا ہے۔ بجوات سے آم اور لوکاٹ کے ٹوکرے بھر بھر کر آیا کرتے تھے۔ میں چولائی اور سرسوں کا ساگ پکاتی تھی تم باجرے کی روٹی بنا لیتیں اور سردیوں کی شاموں کا تمام تر گلابی حسن تمہارے ابا جی کے آنگن میں اتر آتا تھا''

''واہ۔ واہ کیا شاعرانہ قسم کا خط ہے'' مہد، جامن کھاتا ہوا سر دھننے لگا۔

''سرسوں کا سال، باجرے کی روٹی، مکھن کا پیڑہ اور سنہری سی دوپہر اور گلابی سی شام'' منیم بھی قالین پر گرتے ہوئے مسخرے پن سے بولا۔

''اور میں ٹھنڈی ٹھار لسی پینا چاہتا ہوں۔ ابھی خط میں لسی کا بھی ذکر آئے گا'' ملت نے مہد کے ہاتھ سے جامن کا باؤل کھینچ کر ٹی وی ریموٹ سے آف کر دیا۔

''مجھے خط تو سن لینے دو۔ اپنی بک بک شروع کر دیتے ہو'' اماں کا غصہ سوا نیزے پر پہنچ گیا۔

''ایسی ہی جھٹپٹے کی شام تھی'' منہب نے خط پر نگاہیں جما دیں۔ وہ بمشکل ہنسی رو کے خط پڑھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

''ادھر لا میں خود پڑھ لیتی ہوں۔ ملت! جا میری نزدیک کی عینک اٹھا لا'' اماں بی سے ذرا سی تاخیر بھی برداشت نہیں ہوئی تھی اسی لیے منہب کو ایک دھموکا بھی جڑ دیا تھا منہب شرافت سے خط پڑھنے لگا۔

''ایسی ہی جھٹپٹے کی شام تھی تم اسی شام بچوں سمیت رہنے کے غرض سے آئی تھیں۔ میری گود میں صحت مند سی چندا کو دیکھ کر تمہیں حیرت کا جھٹکا لگا میں نے تمہیں بتایا کہ چندا میری دیورانی کی بیٹی ہے جسے ہم نے گود لے لیا ہے تم نے چندا کو خوب پیار کیا تمہاری اماں مرحومہ بھی پاس ہی بیٹھی تھیں۔ اور موتی چور کے لڈو بنانے کے لیے چنے کی دال صاف کر رہی تھیں مہد قریب چٹائی پر بیٹھا پڑھ رہا تھا اور تمہاری گوری چٹی بھتیجی نازنین بھی مہد کے ساتھ بیٹھی شاید ہوم ورک کر رہی تھی اس وقت مہد شاید ساتویں جماعت میں تھا یا آٹھویں میں۔

چندا تمہاری گود میں کھیل رہی تھی تبھی تم نے اچانک کہا۔

''افسر! چندا میری بیٹی ہے اسے میں اپنے مہد کی دلہن بناؤں گی۔ مانو خوشی سے رات بھر مجھے نیند نہ آئی۔ ہم تو سیدھے سادے دیہاتی لوگ ہیں۔ زبان سے نکلی بات کو بڑی اہمیت دیتے ہیں میں نے اسی رات چندا کے تایا کو بتا دیا تھا کہ پوری برادری والوں کو اطلاع دے دو کہ میری چندا قمر کے مہد کی ٹھیکرے کی مانگ ہے''

''ٹھیکرے کی مانگ'' منہب سمیت سب ہی کی سانسیں لمحہ بھر کو تھم سی گئیں۔ اماں بی کے چہرے پر تفکر کے سائے پھیل گئے تھے اور اک نامعلوم اضطراب ان کی آنکھوں میں ہلکورے لینے لگا تھا۔

''آگے کیا لکھا ہے افسر نے'' اماں بی نے قدرے دبی آواز میں پوچھا۔ منہب اس دھچکے سے ذرا سنبھل کر پھر سے خط کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''پیاری قمر! میں تمہیں وعدہ یاد دلا رہی ہوں۔ ابھی مجھے کویت چلے جانا ہے۔ ملشہ میری چندا اب بالکل تنہا ہے اس کی ماں دو ہفتے قبل وفات پا گئی ہے۔ باپ تو پیدائش سے دو مہینے پہلے ہی چل بسا تھا تم اپنی امانت کو لے جاؤ۔ اسے میری التجا سمجھو یا درخواست میں تمام عمر تمہاری مشکور رہوں گی'' خط اختتام پذیر ہوا تھا اور منہب کی زبان بغیر کوما، فل اسٹاپ کے چل پڑی۔

''خبردار، خبردار۔ اگر آپ نے چاچو کے ٹھیکرے کی مانگ کو یہاں لانے کی کوشش کی۔ دریا کے اس پار سے کسی گنوار جاہل کو لانے کی ضرورت نہیں۔ یہ جو باشعور، تعلیم یافتہ اور زمانہ ساز خواتین ہیں انہیں بزرگوں، بچوں کے حقوق کا نہیں پتا۔ ہمارے ساتھ اینٹ، پتھر کا بیر باندھا ہوا ہے۔ ذرا سی ہماری غلطی ان کی نازک طبیعتوں پر گراں گزرتی ہے۔ اب ایک جاہل خاتون کو لے آیئے گا تا کہ دوسرے ہی دن وہ ہمیں نکال باہر کریں اور اپنی زبان کے ایسے ایسے جوہر دکھائیں گی کہ ہمیں کہیں بھی منہ چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی اور چلو بھر پانی میں ہمیں ہی ڈوب مرنا پڑے گا'' منہب کا واویلا بجوات آنے تک جاری و ساری تھا اور وہ دل ہی دل میں ملشہ کے خلاف ڈھیروں عناد بھرے یہاں آیا تھا۔ واپسی کے سفر میں بھی وہ جلی کٹی سناتا رہا تھا ملشہ حیران تھی وہ بار بار اس اکیس سالہ لڑکے کو دیکھ رہی تھی جو نہ جانے کیوں اس سے خفا خفا سا تھا

مانیہ نے ولیمے کے دوسرے دن اس کے سوال پر ہنستے ہوئے کہا۔

''منہب آپ کو نند کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گا چاچی''

''اور ملشہ کو کچھ دن گزرنے کے بعد مانیہ کی بات کی صداقت پر گویا یقین آ گیا۔

''ملشہ کو اپنانے کا فیصلہ بہت اچانک نہیں تھا بلکہ مہد نے بہت سوچنے کے بعد اماں بی کو رضامندی دی تھی اس سے بھی پہلے اس نے نازنین کو فون کر کے پوری صورتحال سے آگاہ کیا۔ اول تو سن کر وہ گم صم رہ گئی تھی۔ اوائل عمری کا خواب کس مقام پر ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے آنسو ایک تواتر سے گرنے لگے۔

وہ اسے سمجھتا رہا تھا بہت ساری باتیں بتاتا رہا۔ وہ اپنی ماں کی آس کو نہیں توڑنا چاہتا تھا بہت دیر بعد ہی سہی نازنین اس کی تمام باتیں سمجھ کر اپنی محبت سے دستبردار ہو گئی تھی۔

''تم میرے نصیب میں نہیں تھے یہ سب تقدیر کے فیصلے ہیں اور تقدیر سے کیا لڑنا۔ تم پھوپھو کے مان کو مت توڑنا۔ وہ پہلے ہی تمہارے بڑے بھائیوں کے رویوں اور ان کی خود غرضانہ سوچ کی وجہ سے دلبرداشتہ ہیں۔ ماں کی دعا تو پوری زندگی کا حاصل ہوتی ہے۔ تم اپنی ماں کی ساری دعائیں سمیٹ لو''

''تھینک یو نینو! تم نے میری آدھی ٹینشن ختم کر دی ہے اگرچہ ہمارے درمیان بظاہر کچھ بھی نہیں تھا تاہم میں خود کو تمہارا مجرم سمجھ رہا تھا یہ مت سمجھنا کہ اب تم لوگ میری ذمہ داری نہیں رہے ہو جب تک زوہیب اپنی تعلیم مکمل نہیں کر لیتا تب تک تم اور مامی میرے ساتھ رہو گے اور میں اپنے فرائض کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ تم زوہیب کے لیے فکر مند مت ہونا'' ایسی بہت ساری تسلیاں دے کر اس نے فون رکھ دیا تھا اس کا ضمیر مطمئن تھا وہ کسی کا دل دکھانے کا سبب نہیں بنا تھا مگر اس کے باوجود بہت ساری آزمائشیں مہد یار کے حصے میں چلی آئی تھیں۔

وہ اور نازنین اچھے دوست تھے اور ان دونوں نے ہمیشہ اچھے دوست رہنے کا وعدہ کیا تھا اماں بی کو گھر کے اخراجات کے علاوہ وہ مامی کو اپنی تنخواہ میں سے مخصوص رقم تھما دیتا تھا۔ وہ پہلے بھی مہد سے خوش تھیں۔ اب بھی مطمئن تھیں، ولیمہ میں مامی اور نازنین دونوں نے شرکت کی تھی۔ ملشہ کو مہد کی یہ کزن بہت پسند آئی تھی۔ باوقار اور سنجیدہ سی۔

مہد ولیمہ کے چوتھے روز کراچی چلا گیا تھا اور ملشہ نے خود کو روٹین لائف میں مصروف کر لیا۔

سب سے پہلے تو اس نے اپنے پورشن کی از سر نو صفائی کی، چھتیں، دیواریں تک جھاڑیں پردے دھوئے۔ اگرچہ کئی سالوں کی دھول مٹی سے اٹے کافی بوسیدہ ہو گئے تھے تاہم

اچھی طرح دھونے سے کافی بہتر لگنے لگے چوچک دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتی رہی اور ملشہ اس کے چہرے کے بگڑے بگڑے تاثرات سے مزہ لیتی رہی۔

اندرونی حصہ صاف کرنے کے بعد اب ملشہ کی توجہ بیرونی صحن کی طرف خود بخود مبذول ہوگئی لان کے لیے تو کوئی جگہ نہیں تھی کہ کچھ نئے پودے لگا لیے جاتے۔ پورے صحن میں ماربل لگا ہوا تھا۔ البتہ گملوں کی بہتات تھی اور ان میں بے جان ہوتے سوکھے سڑے سے گرد آلود پودے، جنہیں پانی دینے کا تو شاید گھر کے کسی فرد کو خیال نہیں آیا تھا۔ سب سے بری حالت گیٹ کے قریب رکھے ڈرم کی تھی جو کہ پانچوں پورشنز کے کوڑے کرکٹ اور گندگی سے لبالب بھرا ہوتا تھا ہر ہفتے کوڑا اٹھانے والی چمپا آتی تھی اس نے بڑی مشکل سے اسے روزانہ آنے کے لیے رضا مند کیا۔ اس کی تنخواہ میں دوسو روپے کا مزید اضافہ کیا۔ اب روزانہ ڈرم خالی ہو جاتا تھا اور گھر میں داخل ہوتے ہی اس ناگوار بو اور سڑاند سے نجات مل گئی تھی کچھ ہی دنوں بعد گملوں کی حالت بھی بہتر ہوگئی سفید اور سرخ پینٹ سے خوشنما لگنے لگے تھے اور ان میں موجود نوحہ کناں پودوں نے بھی پھلنا پھولنا شروع کر دیا تھا اس تبدیلی کو سب نے ہی محسوس کیا تھا البتہ سب سے پہلے اظہار سونیا بھابھی نے کیا۔ وہ مہینے میں ایک دو مرتبہ ساس صاحبہ کی قدم بوسی کے لیے تشریف لے ہی آتی تھیں۔ اندرونی حصے کی طرف دیکھ کر ان کی آنکھوں میں ستائش ابھر آئی۔

''واؤ ملشہ! تم نے تو کمال کر دیا ہے'' ان کے تعریفی جملے پر وہ صرف مسکرا کر رہ گئی حالانکہ سامان تو پرانا تھا بس ترتیب، صفائی اور نفاست کی وجہ سے سب ہی ٹھک کر اک لحظے کو تو ضرور ہی رکتے تھے۔

کچن، لاؤنج، گول کمرہ اور سیٹنگ روم سب صاف ستھرے بہت اچھا تاثر دے رہے تھے شاید اسی لیے نفاست پسند تک چڑھی سی سونیا بھابھی کا موڈ بے حد خوشگوار ہو گیا تھا۔

ملشہ کچن میں چلی آئی تھی۔ سب سے پہلے اس نے چائے کے لیے چولہے پر پانی چڑھایا پھر فریج میں سے کھجور کا حلوہ نکال کر گرم کیا۔ ٹرالی میں برتن سیٹ کئے، نمکو، بسکٹس اور نگٹس پلیٹوں میں علیحدہ علیحدہ رکھے پھر چٹنی بھرے شامی کباب فرائی کئے چکن رول، میٹھے سموسے اور ناریل کی چٹنی کیساتھ پرتکلف چائے تیار تھی۔ جوں ہی وہ ٹرالی گھسیٹ کر گول کمرے میں آئی تو سونیا بھابھی فوراً بولیں۔

''ملشہ! چائے آج صحن میں پیتے ہیں''

''لایئے چاچی! میں ٹرالی صحن میں لے جاتا ہوں'' منیم فوراً اس کی مدد کے خیال سے بھاگا چلا آیا تھا۔

وہ صحن میں بیٹھے دلفریب موسم کی رنگینی کو محسوس کرتے ہوئے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے جب منہب کتابیں اٹھائے گیٹ سے اندر چلا آیا۔

''چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات'' وہ طنز کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

''ہر اندھیری رات کی ایک سحر بھی ہوتی ہے'' ملشہ نے بغیر بُرا منائے اطمینان سے کہا۔

''ملشہ! تم نے مجھے اناس کی پڈنگ کی ریسپی بتانی ہے'' سونیا بھابھی میٹھے سموسوں اور ناریل کی چٹنی سے بھرپور انصاف کرتے ہوئے بولیں۔ اماں بی بھی تمام پرہیز بالائے طاق رکھے چکن رول چٹنی میں ڈبو ڈبو کر کھا رہی تھیں۔

''اماں! آپ کے لیے صرف کھجور کا حلوہ ہے'' ملشہ ان کی بد پرہیزی دیکھ کر چیخ اٹھی۔

''مہد بہت غصہ کریں گے۔ رات کو انہوں نے فون کر کے آپ کے کھانے پینے کی تفصیل پوچھنی ہے اور آپ کو پتا ہے میں جھوٹ نہیں بول سکتی'' وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

''آپ بول لیجیے گا۔ چاچو کی ڈانٹ سے بچنے کے لیے'' مانیہ نے اسے تسلی دی۔ اسی طرح کی خوشگوار باتوں میں وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا تھا۔ سونیا بھابھی اٹھنے لگیں تو ملشہ فوراً بولی۔

''کھانا کھا کر جایئے گا بھابھی!''

''ارے نہیں، اب اتنا کچھ تو ٹھونس چکی ہوں۔ رات کو بالکل نہیں کھاؤں گی۔ اور ابھی بچوں کی وجہ سے جا رہی ہوں۔ ان کے قاری صاحب کے آنے کا وقت ہو چکا ہے'' سونیا بھابھی نے حلاوت سے جواب دیا۔

''بچوں کو بھی لے آتیں ہر دفعہ انہیں گھر چھوڑ آتی ہیں'' وہ بڑی بھابھی کے فہد کو گود میں بٹھائے حلوہ کھلاتے ہوئے قدرے خفگی سے بولی۔

''نیکسٹ سنڈے کو لے کر آؤں گی بلکہ موسی بھی آئیں گے۔ کہہ رہے تھے ملشہ سے اچھی حلیم کوئی پکا ہی نہیں سکتا'' سونیا مسکراتے ہوئے اپنی آلٹو کی طرف بڑھ گئیں۔ ملشہ نے مانیہ کو سامان سمیٹنے کے لیے کہا تھا اور خود فہد کا منہ دھونے لگی۔ جوں ہی وہ صحن کی طرف گئی محسن کو گملے میں سے تازہ نم مٹی سے کھیلتے ہوئے دیکھ کر فوراً لپک کر آئی اس نے منہ، ہاتھ اور کپڑوں کو خوب رنگین کر لیا تھا۔ ابھی ابھی تو وہ اوپر سے نہا کر آیا تھا اب یقیناً اسے نائلہ بھابھی سے مار پڑنی تھی سو

وہ خود ہی اسے اٹھا کر واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ پہلے اسے نہلایا پھر کپڑے تھوڑے سے سرف میں ڈال کر بھگو دیئے مانیہ، محسن کے اوپر سے کپڑے لے آئی تھی۔ ملشہ نے اسے کپڑے پہنا کر بال بنائے اور پھر کافی رعب داب سے ڈانٹا۔

''اب گملے میں ہاتھ ڈالو گے''

''نہیں چاچی'' اس نے اپنا ہاتھ محسن کے سامنے پھیلا دیا۔

''پکا والا پرامس'' محسن ہنستے ہوئے اس سے لپٹ گیا تھا۔ ملشہ نے اس کے سرخ سرخ گالوں کو بے ساختہ چوم لیا۔

☆☆☆

''میرے کپڑے کہاں رکھے ہیں'' منہب نے چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔

ملشہ نے اماں بی کی قمیض سلائی کرتے ہوئے سر اٹھا کر چلاتے ہوئے منہب کی طرف دیکھا اور تحمل سے بولی۔

''کیا ہوا ہے؟''

''میرے کپڑے، رومال اور جرابیں نہ جانے مانیہ نے کہاں ٹھونس دیئے ہیں'' منہب یوں ہی پہلے دن سے ملشہ کے لیے کوئی نہ کوئی پرابلم کری ایٹ کر دیتا تھا کبھی کھانے میں نقص تو کبھی مانیہ کے ساتھ لڑائی جھگڑا۔ وہ اپنا اشتعال کسی نہ کسی بات کو بڑھا چڑھا کر نکال ہی دیتا تھا۔

''میرے ساتھ آؤ'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ملت، منیم کے مشترکہ کمرے میں لے آئی۔

ان تینوں کے پلنگ اسی کمرے میں ترتیب سے سیٹ تھے۔ ایک کونے میں رائٹنگ ٹیبل تھی جس کے گرد تین کرسیاں موجود تھیں۔ ملشہ دیوار گیر الماری کی طرف بڑھ گئی۔

''یہ کپڑے مانیہ نے نہیں بلکہ میں نے الماری میں ترتیب سے پریس کر کے رکھے ہیں۔ اس دراز میں تم تینوں کے سوکس، رومال اور یونیفام کی ٹائیاں ہیں''

''سوری چاچی!'' وہ ایک دم پشیمان ہوگیا۔

''اٹس او کے'' ملشہ مسکرا کر باہر نکل گئی تھی اور منہب حیران حیران سا اس کی پشت کو دیکھتا رہ گیا پہلی دفعہ جب اس نے ملشہ کو دیکھا تو کچے مکان میں کھڑی اول جلول سے حلیے والی ملشہ اسے قطعاً پسند نہیں آئی تھی مگر ملشہ چاچی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو پہلی نظر میں نہیں بلکہ دھیرے دھیرے اپنا تاثر چھوڑتے ہیں اور یہ تاثر بہت اپنا اپنا، بہت گہرا اور دل میں اترنے کا

باعث بنتا ہے۔ کچھ ایسی بات مہد چاچو رات کو فون پر کہہ رہے تھے۔

''کیوں پیارے! میری بیوی کے مائنس مارکس میں سے کچھ پلس کا اضافہ ہوا ہے یا نہیں'' وہ شرارت سے پوچھ رہا تھا۔

''چاچی اچھی ہیں'' اس نے کچھ جھینپتے ہوئے اعتراف کر لیا۔

''او۔ ہو'' دو مہینے گزر جانے کے بعد تمہیں احساس ہو ہی گیا ہے حالانکہ ہم تو پہلی نظر میں ان کی اچھائیوں اور خوبیوں کو جان چکے تھے'' مہد کا انداز بہت بھرپور ستائشی اور دل موہ لینے والا تھا۔

''منہ دھو رکھیے۔ دادی کے حصے میں تمام کریڈٹ جاتا ہے۔ ملشہ چاچی خالصتاً ان کی پسند سے آئی ہیں'' منہب نے اسے خوب ''جتا'' کر کہا دروازے میں کھڑی ملشہ مطمئن سی ہو کر پلٹ گئی تھی اس کے دل پر رکھا ایک نوکیلا پتھر ہٹ چکا تھا وہ منہب اور مہب کے چاچا کا دل جیتنے میں کامیاب ہوگئی تھی اور اسے یقین تھا کہ محبت، خلوص اور پیار اور ایثار سے وہ سب کے دلوں کو جیت لے گی۔

مہد مہینے میں دو یا تین چکر لگا لیتا تھا اور بچے اس کا خوب خوب ریکارڈ لگاتے تھے۔

''تم نے اس مقولے پر خوب غور و فکر کیا ہے ملشہ'' رات کو مہد اسے مساج کرتا دیکھ کر شرارت سے بولا۔

''کون سے مقولے پر'' وہ حیران ہوئی۔

''یہی معدے کے راستے دل میں اترنے والے مقولے پر'' مہد نے ہنسی دبائی ''منہاج بھائی تمہاری تعریف کر رہے تھے''

''تائی جی نے مجھے کوکنگ میں اچھا خاصا ایکسپرٹ کر دیا تھا مگر میں نے کوکنگ بیکنگ کا کورس بھی کر رکھا ہے'' وہ روانی سے بولتے ہوئے قدرے لب بھینچے خاموش ہوگئی۔

''کورس'' مہد کی آنکھوں میں حیرانی در آئی ''تم نے باقاعدہ کلاسز لی ہیں''

''ہوں'' اس نے محض ہنکارا بھرا۔

''کیا ایجوکیشن ہے تمہاری؟'' مہد نے لہجے کو خوب سرسری بنا کر پوچھا۔

''میں نے ایم کام کیا ہے''

''وٹ؟'' مہد اچھل ہی تو پڑا تھا ''کہاں سے پڑھا ہے؟'' وہ کچھ مشکوک ہوا۔

’’کالج آف کامرس سے‘‘ملشہ نے لاپرواہی سے بتایا مگر مہد کو چونکتا دیکھ کر وہ ہنسنے لگی تھی پھراس کی کیفیت کا مزہ لیتے ہوئے بولی’’ آپ کے خیال میں تو میں بالکل گنوار اور جاہل تھی‘‘مہد کے چہرے پر اترتی خفت کی سرخی کو دیکھ کر وہ جی بھر کر لطف اندوز ہوئی۔

’’کیا واقعی میں شکل سے اتنی گنوار لگتی ہوں کہ یہ ایم کام کی اعزازی ڈگری بھی گنوار پن کی چھاپ نہیں اتار سکی‘‘ملشہ حد درجہ معصومیت سے بولتی ہوئی سیدھا مہد کے دل میں اتر گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا پھر ملشہ کے قریب جا پہنچا۔

’’میں نے تو اس وقت قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے کہا تھا جب مجھے صرف اتنا علم تھا کہ تم واقعی گنوار، جاہل اور پینڈو ہو مگر اب‘‘ وہ شدت جذبات سے غلط سلط بولتا اسے بانہوں میں بھینچ بھیچ کر گول گول گھماتا چیخ رہا تھا تبھی تو اماں بی اس کے شور اور چلانے کی آواز سن کر دہلتی ہوئی دھاڑ سے دروازہ کھولے گرتی پڑتی اندر چلی آئیں ان کے پیچھے مانیا، منیم اور ملت بھی گھبرایا، بوکھلایا دوڑا دوڑا چلا آیا۔ملشہ نے اس کے بانہوں کے حلقے کو توڑ کر خفت زدہ سی اماں کی طرف بڑھ گئی۔

’’کیا ہوا ہے؟‘‘اماں بی گھبرائی گھبرائی ملشہ کو ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

’’کچھ نہیں اماں! ملشہ نے چھپکلی دیکھ لی تھی‘‘ مہد بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے لاپرواہی سے کہنے لگا۔

’’مگر آواز تو تمہاری تھی‘‘اماں کو اس کے جھوٹ پر قطعاً یقین نہیں آیا۔

’’او۔اچھا اچھا‘‘ وہ گڑبڑا سا گیا’’میرے گلے میں خراش ہونے لگی تھی۔اسی لیے میں‘‘

’’حلق پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگے تھے‘‘اماں نے اس کے ادھورے جھوٹے کو مکمل کیا۔

وہ ڈھٹائی سے ہنستا رہا۔

’’چاچی! بھلا دیواروں سے چپکی اس مخلوق سے کیسا خوف‘‘ منیم نے حیرانی سے کہا۔

’’میں نہیں ڈرتی ورتی کسی سے جاؤ تم لوگ کتابیں لے کر آؤ پھر میں نے کھانا بھی بنانا ہے قائم، عمر اور مرسلین کو بھی بلاؤ‘‘ملشہ نے نائلہ اور نادیہ کے بچوں کا نام لیا۔بسمہ کا بیٹا بہت چھوٹا تھا مگر دوسرے بچوں کو کتابیں کھولے پڑھتے دیکھ کر خود بھی کتاب لے کر بیٹھ جاتا۔کاشان کے شوق کو دیکھ کر وہ اس پر بھرپور توجہ دینے لگی تھی۔ جہاں بچوں کو ملشہ کے پاس مگن اور شوق سے پڑھتا دیکھ کر بچوں کی مائیں مطمئن ہوئی تھیں وہیں انکی اپنی کہی باتیں ان کا منہ چڑاتی رہیں وہ جو ملشہ کی معمولی شکل اور کم تعلیم کو موضوع گفتگو بنا کر اسے ڈی گریڈ کرنے کی کوشش کرتی رہی تھیں

اب خفت اور شرمندگی سے منہ چھپاتی پھرتی تھیں جب بچوں نے ملشہ کی تعلیم اور ذہانت کی جی بھر کر تعریفیں کیں۔ملشہ بچوں کو بھرپور توجہ سے پڑھاتی تھی۔بھابھیوں کے ٹیوٹرز کے اخراجات خود بہ خود ختم ہو گئے تھے اور وہ ملشہ کی اچھی خاصی احسان مند ہو چکی تھیں۔

ادھر اب انہیں کھانے پینے کی بھی کوئی پرابلم نہیں تھی تینوں وقت کا کھانا، ناشتا نیچے ہی دیگ نما دیگچے میں پکتا تھا اور وہ ڈیوٹیاں بھگتا کر فرش ہونے کے بعد آرام سے ڈونگے بھرتیں اور ہاٹ پاٹ سے روٹیاں نکالتی اور اطمینان سے اپنے اپنے پورشن میں اے سی لگا کر خوب سیر ہو کر کھاتیں۔ساتھ اماں بی کے انتخاب کو سراہتی بھی ضرور تھیں۔

بہت کم عرصے میں وہ سب کو پسندیدہ اور ہردلعزیز ہستی بن چکی تھی اماں بی کے سامنے جب کوئی ان کی سب سے چھوٹی بہو کی تعریف کرتا تو اماں بی کا سر فخر سے تن جاتا اک عجیب سا غرور ان کے لہجے میں جھلکنے لگتا۔

’’بڑی بہو ساس مرحومہ کی پسند تھیں اور چھوٹی دو ان کے والد محرم کی۔جبکہ دو بیٹوں نے پسند ناپسند کی زحمت سے بچا لیا تھا البتہ ملشہ صرف اور صرف میری پسند سے آئی ہے میرا انتخاب لاجواب ہے ہیرے کی کنی کو تلاش کیا ہے میں نے‘‘ وہ تفخر سے کہتیں۔

’’ملشہ کی مصروفیت کا گراف دن بہ دن بڑھتا جا رہا تھا وہ کسی بھی قسم کی ستائش اور تعریف کی توقع اور طلب کے بغیر خلوص نیت سے سب کا خیال رکھتی اور احسان کرتی تھی تائی جی کے ہفتے میں دو تین فون اور خط وغیرہ آ جاتے تھے وہ اسے بہت سمجھاتی بجھاتی رہتی تھیں۔زمانے کی اونچ نیچ سسرالیوں کے رویے۔

’’بس دلوں پر گرد نہیں آئی چاہیے چھوٹی موٹی رنجشوں پر دل چھوٹا نہیں کرتے‘‘شروع شروع میں وہ بڑی بھابھیوں کی تلخ کلامی اور طنزیہ گفتگو کو سن کر گھبرا جایا کرتی تھی مگر کچھ ہی عرصہ بعد اس کی محبت، انسیت اور خلوص نے انہیں ملشہ کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

’’اپنا مرد توجہ اور محبت دے تو پھر مشکل کیسی۔بھرے پرے گھروں میں سو باتیں ہو جاتی ہیں اپنے مسائل خود بخود حل کرنے کی کوشش کیا کرو اور دیکھو بیٹی! جٹھانیوں کے سامنے اپنا ’’بھرم‘‘ توڑنے کی کوشش کبھی نہ کرنا اس ’’بھرم‘‘ کی آڑ میں عورت بہت محفوظ اور معتبر ہوتی ہے‘‘ تائی جی کی ہر بات اس نے گویا گرہ سے باندھ لی تھی۔

مہد کراچی سے آتا تب وہ قدرے تاخیر سے اٹھتی تھی کہ صبح صبح مہد کو کھٹر پھٹر سے

الجھن ہوتی تھی وہ نیند کا بڑا رسیا تھا سو اپنی نیند کا اسے خاص خیال رہتا تھا جبکہ ملشہ کی صبح کا آغاز منہ اندھیرے ہو جاتا تھا نماز کے بعد معمول کی تلاوت اور پھر نہ ختم ہونے والے کاموں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ناشتے کے بعد تقریباً دس بجے تک تمام مرد حضرات، خواتین اپنے اپنے دفتروں اور بچے اسکول، کالجوں کے لیے نکل جاتے تھے ملشہ اپنی زیر نگرانی پورے گھر کی صفائی کرواتی تھی اس کے بعد کبھی نائلہ اور کبھی نادیہ بھابھی کے کپڑے سلائی ہو رہے ہیں کبھی بچوں کے کرتوں پر کڑھائی کی جا رہی ہے۔ کبھی مانیہ کا غرارہ، شرارہ تیار کیا جا رہا ہے۔

بسمہ اس کی سلائی میں نفاست اور ڈیزائننگ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی اس کی خواہش تھی ملشہ اس کے بوتیک کے لیے اچھے اچھے ڈیزائن تیار کر دے۔ ان دنوں وہ بسمہ کی فرمائش بڑی تندہی سے پوری کرنے کے چکروں میں تھی کبھی نادیہ بھابھی بیمار ہوتیں تو ملشہ ان کے ڈھیروں کے حساب سے کپڑے مشین لگا کر دھو دیتی۔ نائلہ کی زچگی کے دنوں میں بچے اور گھر کی دیکھ بھال بڑی جانفشانی سے کرتی۔

ان دنوں مسکان بھی ڈلیوری کی غرض سے میکے گئی ہوئی تھی۔ روزانہ فون کر کے وہ ملشہ کو ہدایات دیتی تھی کہ اس کے پورشن کی ڈسٹنگ لازمی کروادی جائے کیونکہ اسے ڈسٹ الرجی تھی۔ واپس آنے کے بعد وہ گھر کو صاف ستھرا دیکھنا چاہتی تھی۔

آج کل ملشہ اماں بی سے نئے پردوں اور کشن اور صوفے وغیرہ کے نئے کورز کی فرمائش کر رہی تھی۔ اماں بی اس اضافی خرچ کے لیے تیار نہیں تھیں اسی لیے اس نے مہد سے فرمائش کی۔

''کمال ہے بیوی یار! میں سمجھ رہا تھا تم روبی، نیلم یا قوت کے ہار کی فرمائش کرو گی اتنے عرصے بعد مانگا بھی تو کیا۔ پردے، کورز اور الم غلم'' مہد نے مصنوعی تاسف سے ہنکارا بھرا۔

''مجھے ان فضولیات سے دلچسپی نہیں'' ملشہ نے ناک چڑھائی۔

''ذرا میری بھائیوں کی کمپنی میں بیٹھنا۔ وہ تمہیں اس صدی کی مخلوق نہیں سمجھیں گی''

''وہ مجھے کیا سمجھتی ہیں میں نے کبھی پرواہ نہیں کی'' اس کے انداز میں بلا کا اعتماد تھا

''آپ کے حوالے سے میرے لیے قابل احترام ہیں''

''زیادہ سر چڑھانے کی ضرورت نہیں'' مہد نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''اچھا، اب اٹھ بھی جائیے۔ سونیا بھابھی کی طرف دعوت ہے۔ سب تیار ہو چکے ہیں

بس آپ بیٹھ کر باتیں بگھارتے رہیں'' ملشہ اس کے کپڑے نکالتے ہوئے زیر لب بڑبڑاتی رہی۔

''ہر شریف شوہر کی ایک عدد اضافی خوبی بھی ہوتی ہے'' واش روم کی طرف بڑھتے ہوئے مہد نے بڑے ہی مدبرانہ انداز میں کہا۔

''کون سی خوبی'' ملشہ چونکی۔

''میری طرح فرماں بردار'' تابعدار'' وہ ہنستے ہوئے واش روم میں گھس گیا تھا جبکہ ملشہ بھی سر جھٹک کر مسکرانے لگی۔

☆☆☆

نئے پردے، کورز کے ساتھ ساتھ دو نئے نکور صوفہ سیٹ بھی آ گئے تھے اور بیڈ روم سیٹ بھی مہد نے اسے سالگرہ کے گفٹ کے طور پر دیا تھا۔

ان کی شادی کو ایک سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ مسکان، پیاری سی بیٹی کی ماں بن چکی تھی ان کی شادی ملشہ کے نکاح سے ہفتہ بھر پہلے ہوئی تھی اور اس وقت مسکان کی گود میں ننھی کونپل موجود تھی پہلی مرتبہ عجیب سی بے کلی اور خالی پن نے ملشہ کو نامعلوم اضطراب کے سمندر میں دھکیل دیا تھا مگر یہ بے چینی وقتی تھی کچھ دیر بعد وہ مہمانوں کی آمد کی وجہ سے مصروف ہوتی چلی گئی تھی۔ دوست، احباب سب مبارکباد دینے آ رہے تھے مہد بھی شام کو پہنچ چکا تھا وہ بچی کے لیے بہت سے گفٹ لایا تھا فراک، کھلونے اور ننھے منے سے سینڈل۔ ایک دفعہ پھر ویسے ہی اضطراب اور اندر کے خالی پن نے اسے بے چین کر دیا۔

''نہ جانے مجھے کیا ہو رہا ہے'' اس نے رنجیدگی سے سوچا تھا اور بچی کے چہرے پر جھکے مہد کی طرف دیکھتے ہوئے ٹھٹک گئی'' تو کیا سامنے موجود بچی کی وجہ سے میں اس قدر مضطرب ہوں اور یہ دل میں بپا شور اور اس شور کے بھیانک سناٹے۔ میرے اندر کی پیاسی ممتا ان بچوں پر ڈھیروں پیار لٹانے کے باوجود کیوں بے قرار ہے'' وہ کھڑے کھڑے گویا سن ہو چکی تھی تبھی مہد کی آواز سنائی دی۔

''ملشہ! ایک جگ پانی کا لے کر آؤ''

''پانی'' جوں ہی وہ بیڈروم کا دروازہ کھول کر اندر آئی مہد کو اس نے ٹی وی میں گم دیکھ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' اس کے ہاتھ سے گلاس اور جگ پکڑ کر مہد نے ملشہ کو پلٹتے دیکھ

کر پوچھا۔

''ابھی آتی ہوں'' وہ بھرائی سی نم نم آواز میں بولی۔

''واپس آؤ''

''تھوڑی دیر تک آتی ہوں۔ ابھی کچن میں کام ہے'' وہ نگاہ چرا کر باہر کی طرف بڑھنے لگی تھی جب مہد نے تحکم بھرے لہجے میں اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔

''یہاں آؤ، میرے پاس بیٹھو'' مہد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بیٹھا کر نرمی سے کہا۔

''کیا پرابلم ہے؟ تھک چکی ہو؟ اتنے کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ خواہ مخواہ خود کو تھکاتی ہو''

''میں خود کو تھکاتی نہیں بلکہ فضول سوچوں سے نجات کی غرض سے خود کو مصروف رکھتی ہوں'' ملشہ خود کو سنبھال چکی تھی تبھی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''کیسی فضول سوچیں'' مہد نے ٹھٹک کر اس کے چہرے پر نگاہ جمائی۔

''کچھ نہیں'' اس کا انداز صاف ٹالنے والا تھا۔

''ملشہ! کیا پریشانی ہے۔ شیئر کرلو'' اس نے بہت نرمی اور محبت سے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر یقین بھرے لہجے میں کہا تو ملشہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مہد گھبرا گیا تھا۔

''ملشہ! پلیز کچھ بتاؤ تو سہی، ورنہ میں اماں کو آواز دینے لگا ہوں''

''کیا بتاؤں؟'' اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے لبریز تھیں۔

''کیوں روتی ہو؟ کیا وجہ ہے''

''مہد! مہد، مجھے بھی ایک بچہ چاہیے۔ جو صرف میرا ہو۔ میرا اپنا۔ جسے میں جی بھر کر پیار کروں جو مجھے کبھی چھوڑ کر نہ بھاگے'' وہ گالوں پر پھسلتے آنسو پونچھ کر بولی۔

''ارے۔ ارے، اتنی سی بات کے لیے آنسو بہا رہی ہو'' مہد نے اک طویل سانس کھینچا۔

''یہ اتنی سی بات نہیں ہے ہماری شادی کو ایک سال ہو چکا ہے''

''صرف ایک سال ہوا ہے ایک سو سال نہیں'' وہ غیر سنجیدگی سے بولا۔

''آپ کو تو احساس ہی نہیں''

''تمہاری طرح رونا شروع کر دوں'' مہد نے ہنستے ہنستے اس کے گال پر چپت لگائی۔

''پلیز مہد!'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''کیا چاہتی ہو تم'' مہد ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

''اگر چیک اپ کروانا ہے تو یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں میں کسی ڈاکٹر سے مشورہ کر لوں گا۔ تم بس یہ چہرے کے ڈیزائن ٹھیک کر لو۔ میں کراچی سے ہر تیسرے چوتھے دن یہ بے رنگ پرنٹ دیکھنے کے لیے نہیں دوڑا دوڑا چلا آتا''

''آپ بھی نا'' ملشہ روتے روتے مسکرانے لگی تھی۔ پھر اچانک خیال آنے پر مہد کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''نازنین کی کہیں بات چیت طے ہوئی''

''یہ خالص زنانہ قسم کی گفتگو میرے ساتھ کرنے کی ضرورت نہیں''

''آپ کو پتا تو ہوگا'' ملشہ مشکوک ہوئی'' مامی سارے ''زنانہ مشورے'' آپ سے ہی تو کرتی ہیں''

''نینو کی پسند کافی اونچی ہے''

''کتنے فٹ اونچی'' اس نے شرارت سے کہا۔

''چھ فٹ گیارہ انچ'' اس کا اشارہ مہد کی طرف تھا۔

''بکو نہیں'' وہ سمجھ کر مصنوعی خفگی سے بولا۔

''معاملہ تو کچھ یہی لگتا ہے'' اس نے معنی خیزی سے آنکھیں گھمائیں۔

''بات تو سچ ہے مگر'' مہد بھی جان بوجھ کر اسے ستانے، چڑانے لگا تھا۔

''مگر کیا؟'' وہ بے چین ہوئی۔

''تم بیچ میں ٹپک پڑی تھیں''

''اگر میں نہ ہوتی تو'' اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''تم کیسے نہ ہوتیں جانم! ہمارا تمہارا نام تو آسمانوں پر لکھا جا چکا تھا'' مہد مخمور نظروں سے اسے دیکھتا ہوا بولا۔

''نازنین کا فون آیا تھا''

''کیا کہہ رہی تھی؟''

''آپ کی واپسی کا پوچھ رہی تھی''

''کیوں؟''

''یہ تو آپ کو پتا ہونا چاہئے''

''تم پوچھ لیتیں؟'' مہد اسے باہر نکلتا دیکھ کر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا'' کہاں جا رہی ہو؟''

''کام ہے مجھے'' اس نے بے نیازی سے کہا۔

''بھاڑ میں گئے سارے کام۔ میرے رومینٹک موڈ کا ستیاناس کر دیتی ہو''

''میں نے کیا کیا ہے؟'' وہ مصنوعی معصومیت سے بولی۔

''ستم ڈھا کے پوچھتے ہو کہاں کہاں چھوٹ لگی ہے'' مہد نے آہ بھری۔

''اتنی آہیں نہ بھریں، میں تکور کا سامان لے آتی ہوں'' وہ جھپاک سے دروازہ کھولے باہر نکل آئی۔ لاؤنج میں گتھم گتھا منہب اور ملت کو دیکھ کر اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔

''کیا بے ہودگی ہے یہ؟'' اس نے لہجے میں کمال کا دبدبہ اور رعب سمو کر بلند آواز میں کہا تھا۔ منہب اور ملت دونوں ایک دم سنبھل کر اٹھے اور ہاتھ جھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگے

''کہاں ہے بے ہودگی'' منہب صوفے اور پردے کے پیچھے سے کسی نادیدہ چیز کو تلاشنے لگا تھا۔

''میں نے سمجھا مانیہ کی کوئی سہیلی ہے۔ مس بے ہودگی'' ملت دانت نکوستا کارپٹ پر ڈھے گیا۔

''کیوں جھگڑ رہے تھے تم دونوں'' وہ ان کی ایکٹنگ پر جی بھر کر خفا ہو کر بولی۔

''چاچی! اس سے کہیں تندور سے روٹیاں لے کر آئے'' ملت نے ''وجہ فساد'' اس کے گوش گزار کی۔ تنور پر جانا ان تینوں بھائیوں میں سے کسی کو بھی پسند نہیں تھا۔

''میں منہب منیر تندور پر کھڑا ہو کر روٹیاں کتنا اچھا لگوں گا مستقبل کا بزنس مین تم لوگوں کو شرم سے ڈوب جانا چاہئے'' منہب تو صدمے سے نڈھال ہی ہو گیا۔

''ویسے بھی روزانہ چالیس روٹیاں خریدتے ہوئے ارد گرد کھڑے لوگ بھی مشکوک انداز میں پوچھنے لگتے ہیں۔ کہ کہیں ''ڈھابہ'' تو نہیں کھول رکھا انہیں کیا پتا جنجال پورہ کی پوری کاسٹ ہمارے گھر میں موجود ہے ابھی تو آدھے افراد تندور کی روٹی نہیں کھاتے، ان کے لیے گھر میں پھلکے اتارے جاتے ہیں''

''تو پھر آج مٹن کے ساتھ ہوا کھالینا'' وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

''میں بالکل نہیں جاؤں گا'' ملت نے صاف جھنڈی دکھا دی'' اس گھر کے لیے ''روٹیاں'' ڈھوتے ڈھوتے میں آدھا ہو چکا ہوں''

''چاچی! بات انصاف کی ہونی چاہئے۔ اب قاسم اور علی چھوٹے تو نہیں۔ ان کی بھی ہفتہ ہفتہ بھر ڈیوٹی لگائیں'' منیم بھی ''حقوق بچگان'' کا نوٹس بورڈ اٹھائے نجانے کس کونے سے برآمد ہوا تھا۔ بات تو سچ تھی مگر کہنے کا حوصلہ کسی میں بھی نہیں تھا۔

''تم تینوں ہی رہنے دو۔ میں خود روٹی پکا لیتی ہوں۔ باہر ویسے بھی چلچلاتی دھوپ ہے۔ اماں بتا رہی تھیں۔ پچھلے سال منیم کو لو لگی تھی۔ ڈیڑھ مہینہ یہ بیمار رہا تھا'' کچھ سوچ کر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

''دیکھا...... دیکھا...... حاضرین چاچی نے فوراً ہتھیار پھینک دیئے ہیں۔ اوپر والوں کے سامنے بات کرنے کا کسی میں بھی حوصلہ نہیں۔ اب دو بجے کچن میں کھڑی ہوں گی اور شام ساتھ بجے دوپہر کی روٹیاں پکا کر فارغ ہوں گی۔ ہے نا ناانصافی اور ظلم، اماں بی ان سب کے کچن کیوں نہیں الگ کرتیں'' منہب چیخ کر بولا تھا۔ ملشہ تو دہل کر رہ گئی۔

''منہب'' اس نے ناراضی سے ٹوکا'' گھر میں معمولی سی بات پر بدمزگی ہو یہ مجھے گوارا نہیں۔ آئندہ تم اس قسم کی کوئی بات نہیں کرو گے''

''آپ کو سب کی بے لوث خدمتیں کرنے کے بدلے میں کوئی ایوارڈ نہیں ملے گا۔ بڑی چاچیاں کس قدر آرام طلب ہو گئی ہیں۔ سارے گھر کی ذمہ داری آپ کے سر ڈال کر خود سیر سپاٹے کرنے نکل جاتی ہیں'' ملت کے لہجے میں بھی واضح تلخی تھی۔ یہ بچے کس قدر حساس تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو کس شدت سے محسوس کرتے تھے۔

''اور ہم آپ کو یوں ''خرچ'' ہوتے بھی نہیں دیکھ سکتے اتوار کے اتوار سب چاچیاں پہلے کی طرح ناشتا کھانا اپنی اپنی باری پر بنائیں گی یا بازار سے منگوائیں گی۔ آپ اعلانیہ کہہ دیں۔ کم از کم آپ کو بھی چھٹی کے روز آرام کرنے کا موقع ملنا چاہئے'' منہب نے ترشی سے کہا۔

''اس لاحاصل بحث کا کوئی مقصد بھی ہے'' وہ کچن کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

''میں لے آتا ہوں چاچی! آپ کو گھر میں روٹی پکانے کی ضرورت نہیں'' منہب بائیک کی چابی دراز میں سے نکال کر باہر نکل گیا تھا جبکہ منیم اور ملت دونوں میز پر برتن سیٹ کرنے لگے۔

☆☆☆

وہ اماں بی کے پیروں اور سر میں تیل لگا کر مانیہ کو آواز دینے لگی تھی۔

''جی چاچی!'' مانیہ بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوئی۔

''ادھر آؤ تمہارے بالوں میں تیل لگا دوں، کیسے خشک اور بے جان ہو رہے ہیں''

اس نے زبردستی منمناتی مانیہ کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے سامنے بیٹھایا۔

''چاچی! تیل کی اسمیل سے چھینکیں آئیں گی''

''ناک پر ہاتھ رکھ لو'' مشورہ حاضر تھا۔

''ہاتھ تھک جائے گا'' مانیہ معصومیت سے بولی۔

''دوسرا ہاتھ رکھ لینا'' ملشہ نے ہنسی دبائی۔ کچھ دیر بعد نادیہ بھابھی سر دباتی آ گئیں

''ملشہ! میرے سر میں بھی تیل کا مساج کر دو۔ سر درد سے پھٹا جا رہا ہے''

''کر دیتی ہوں'' مروت کی ماری ملشہ نے سر ہلا دیا۔

''چاچی مجھے بھی'' محسن بھی بھاگا بھاگا آیا۔

''میں نے بھی کروانا ہے'' قاسم کو بھی حرص آ گئی۔ اپنی ماؤں کے تو ہاتھ نہیں آتے تھے۔ فہد، حسن اور عمار بھی اس کار خیر میں شرکت کی غرض سے بھاگے چلے آئے۔

''بھاگو یہاں سے'' منیم ہمیشہ آڑے وقتوں میں کام آتا تھا۔

''اپنی ماؤں سے کہو'' منیم نے جھٹ پٹ تیل کی بوتل اٹھائی اور کیبنٹ میں چھپا آیا۔

''مما سے نہیں۔ چاچی سے لگوانا ہے'' بچے مچلنے لگے۔

''کیوں تنگ کر رہے ہو بچوں کو'' ملشہ کو ان کے معصوم لٹکے چہرے دیکھ کر پیار آ گیا۔

''رہنے دیں آپ'' منیم کو قطعاً ترس نہ آیا۔

''اٹھیے، آپ کا کویت سے فون آیا ہے''

''تائی جی کا فون'' ملشہ کو اٹھنا ہی پڑا۔ بچے بے چارے منہ لٹکائے ایک دفعہ پھر کھیلنے کودنے لگے۔

ملشہ نے ریسیور کان سے لگایا تو کال شاید ڈسکنیکٹ ہو گئی تھی یا پھر منیم نے جھوٹ بولا تھا۔

''منیم بھی نا'' وہ ہنستے ہوئے سر جھٹکنے لگی۔ اسی پل فون کی گھنٹی بجی۔ چونکہ وہ پاس ہی کھڑی تھی اسی لیے دوسری بیل سے پہلے اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

''لگتا ہے تم میرے فون کا انتظار کر رہی تھیں'' ایئر پیس میں سے مہد کی آواز ابھری۔

''میں آپ کے فون کا نہیں، آپ کا انتظار کر رہی ہوں'' وہ برجستہ بولی'' آج آپ نے آنا تھا''

''آنا تو تھا مگر آؤں گا نہیں''

''کیوں''

''میری مرضی'' وہ شاید اسے چڑا رہا تھا اور ملشہ واقعی چڑ بھی گئی۔

''ایسی کی تیسی آپ کی مرضی کی۔ سیدھی طرح گھر آ جایئے''

''نہ آؤں تو پھر''

''میں پوری پلٹون کو لے کر آ جاؤں گی'' اس نے دھمکایا۔

''پلٹون کو ادھر ہی نہ لے آؤں۔ روز روز کی ''دوڑ'' سے نجات مل جائے گی''

''کیا مطلب؟'' وہ چونکی۔

''گھر آ کر مطلب سمجھاؤں گا۔ ابھی تم اماں کو فون دو''

''اماں! مہد سے بات کر لیں'' اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کر اماں کو آواز دی۔ اماں تخت پر بیٹھی تھیں۔ وہ فون سیٹ اٹھا کر ان کے پاس لے آئی۔ پھر دھلے ہوئے کپڑے اٹھا کر اوپر چلی آئی۔ نادیہ بھابھی خرابی طبیعت کی وجہ سے آج دفتر نہیں گئی تھیں۔ وہ ان کے قریب ہی فلور کشن پر بیٹھ گئی۔ بھابھی بچوں کے یونیفارم استری کر رہی تھیں اسے آتا دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

''کیسی طبیعت ہے بھابھی''

''اب تو کچھ بہتر ہوں''

''آپ کے لیے کھچڑی بنائی ہے'' ملشہ نے انہیں بتایا۔

''شکریہ جناب'' بھابھی کے لہجے میں تشکر تھا۔

''اماں کیا کر رہی ہیں'' بھابھی نے کچھ رازداری سے پوچھا۔

''مہد سے بات کر رہی ہیں'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''اوہ ہوں، کوئی خاص بات'' بھابھی ٹھٹکیں۔

''مجھے کیا پتا'' اس نے کندھے اچکائے۔

''تم نے بات کی ہے مہد سے'' کچھ سوچ کر بھابھی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں۔ خیال نہیں رہا''

''لو اور سنو۔ میں تو انتظار کر رہی تھی'' بھابھی کی آنکھوں میں ناگواری در آئی۔

''بھابھی! ابھی بات کرنا کچھ مناسب نہیں۔ مہد کو شاید برا لگے۔ اور اماں بھی خفا ہوں گی''

''اسی لیے تو تم سے کہا تھا باتوں ہی باتوں میں مہد کی رائے لو''

''میں کوشش کروں گی'' اس نے ایک مرتبہ پھر انہیں تسلی دی۔

''ان سب کے بھلے کی بات ہے۔ میرا ذاتی مفاد تو کوئی نہیں'' بھابھی اپنی اچھائیوں اور خاندان کی حشمت کے قصے سنانے لگی تھیں۔ ملشہ تھوڑی دیر میں ہی بور ہوگئی اور پھر اماں کو دوا دینے کا بہانہ کر کے نیچے اتر آئی۔

ابھی تین دن پہلے بھابھی صاحبہ نے اپنے ڈنمارک میں مقیم بھائی کا پروپوزل مانیہ کے لیے پیش کیا تھا حالانکہ وہ خود بھی براہ راست اماں سے بات کر سکتی تھیں مگر انہوں نے نہ جانے کیوں ملشہ کا انتخاب کیا تھا کہ وہ بات ہوم منسٹری تک پہنچائے۔ بہر حال ملشہ اب ہامی بھر چکی تھی اسی لیے اس نے دبی دبے آواز میں بڑے مناسب الفاظ میں بھابھی کا مدعا بیان کر دیا تھا اماں بی پہلے حیران ہوئیں اور پھر ان کی تیور بگڑنے لگے۔

''بہو! میری پوتی نہ تو عمر رسیدہ ہو رہی ہے اور نہ تم پر ایسا کوئی بوجھ میں نے لاد دیا ہے۔ جو تم اسے اتارنے کے چکر میں ہلکان ہو رہی ہو''

''اماں'' وہ تو دھک سے رہ گئی ہے۔

''میں نے ایسا کب کہا اور میں بھلا ایسا کیوں چاہوں گی اور مجھے تو نادیہ بھابھی نے آپ سے بات کرنے کے لیے کہا تھا میں تو خود کہہ رہی تھی کہ مانیہ ابھی بہت چھوٹی ہے''

''نہ اس کے اڑتیس سالہ بھائی کے لیے میری معصوم پوتی رہ گئی ہے'' اماں بی تو آگ بگولہ ہوگئیں''

''میرا کیا قصور ہے؟'' وہ روہانسی ہوگئی۔

''میم سے بیاہ کر رکھا تھا اس نے'' اماں نے غصے سے بتایا۔

''اسی لیے تو میں نے مہد سے بات نہیں کی۔ ویسے بھی مانیہ تو ابھی پڑھ رہی ہے'' وہ منمنائی لوگوں میں نہ شرم ہے نہ حیا۔ چندیا رنگنے سے جوانی لوٹ نہیں آتی'' اماں بی رات تک بڑبڑاتی رہی تھیں اور اس وقت کو ملشہ کوس رہی تھی جب اس نے نادیہ بھابھی کی باتوں میں آ کر

اماں بی کو اشتعال دلا دیا تھا۔

☆☆☆

مہد نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ ان سب کو کراچی لے کر جانا چاہتا ہے اماں بی نے سنا تو فوراً انکار کر دیا۔

''اپنی جورو کو لے جاؤ''

''جورو کے ساتھ ہم بھی جائیں گے'' ملت ہنکارا۔

''اماں! مامی لوگ اپنے گھر میں شفٹ ہو گئے ہیں۔ مجھے کھانے پینے کی سخت پرابلم ہے'' مہد نے اماں کو قائل کر کے دم لیا تھا۔ وہ اپنا آبائی گھر چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں مگر مہد کے اصرار اور کچھ اپنا آرام بھی مطلوب تھا سو اسی لیے انہیں ماننا ہی پڑا کہ جانتی تھیں یہاں پر کسی نے ملشہ کی طرح خدمتیں نہیں کرنی جن کی وہ عادی ہو چلی تھیں۔

بچے بھی بے حد ایکسائیٹڈ تھے سو سب نے بہت جوش و خروش کے ساتھ پیکنگ مکمل کی۔ اگلی صبح وہ لوگ کراچی پہنچ گئے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کی شادی کو تیسرا سال لگ گیا تھا۔ فلیٹ اگرچہ چھوٹا تھا مگر تھا بہت اچھے ایریا میں تھا۔ سب سے پہلے بچوں کے ایڈمیشن کروائے گئے۔

ملت اور منیم کا بی اے کرنے کا ارادہ تھا۔ منہب نے یونیورسٹی جوائن کر لی تھی مانیہ کا قریبی کالج میں با آسانی داخلہ ہوگیا۔

روٹین لائف سیٹ ہوتے ہوتے دو ماہ کا عرصہ گزر گیا اس دوران مامی اور نازنین نے ان کا بہت ساتھ دیا۔ روزانہ مامی اور نازنین شام کو آ جاتی تھیں اماں بی بھی بہت خوش تھیں۔ انہوں نے بہت جلد ارد گرد کے لوگوں سے دوستیاں گانٹھ لیں۔

نئی جگہ اور نیا گھر تھا۔ آہستہ آہستہ وہ لوگ اچھی طرح ایڈجسٹ کر رہے تھے۔

دن گزرتے کہاں پتا چلتا تھا وقت کے تھال میں سال سکوں کی مانند گرنے لگے تھے

اس دن وہ صبح قدرے تاخیر سے اٹھی تو منیم نیا کلینڈر دیوار پر چسپاں کر رہا تھا۔

''ارے، ایک سال گزر بھی گیا۔ ابھی کل کی بات ہے جب ہم لوگ یہاں آئے تھے''

وہ حیرانی سے سوچتی رہ گئی۔

''چوچک کی شادی ہوگئی'' ملت نئے سال کی نئی خبر جوش و خروش سے سنا رہا تھا۔

''کس کے نصیب پھوٹے ہیں'' منہب پودوں کو پانی دیتے ہوئے پلٹ کر پوچھنے لگا۔

''بشیر صاحب کے چوکیدار کے''

''بے چارا شبیر، عشق میں مارا گیا'' ملت نے اظہار افسوس کیا۔

''چاچو سے بات کرو، ہمیں اس کا ولیمہ اٹینڈ تو کرنا چاہیے'' منیم پرسوچ لہجے میں کہنے لگا۔

''پتا تو ہے، اس چورنی کو چاچی نے نکال دیا تھا'' منہب کو اچانک یاد آیا۔

''چاچی، پلیز ناشتہ دیں'' ملت نے دہائی دی۔

''پہلے جا کر مانیہ کو سینٹر سے لے آؤ'' ملشہ نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔ مانیہ قریبی سینٹر سے فلاور ارینجمنٹ کا کورس کر رہی تھی۔

''خود ہی آ جائے گی'' ملت نے سستی سے کہا۔ روزانہ اکیلے ہی تو آتی ہے''

''اماں کو کھچڑی تو دے آؤ'' وہ پلیٹ اٹھائے باہر آ گئی۔

''ادھر لائیں'' منیم ٹھنڈا پانی لیے آ گیا۔

''منہب! تم مانیا کو لے آؤ۔ کم از کم چھٹی کے روز تو مانیہ کو لے آیا کرو'' وہ ناراضی سے انہیں جھاڑتے ہوئے بولی۔

''بہتر چاچی!'' وہ فرمانبرداری سے اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا، اسی پل مانیہ لال بھبھوکا چہرہ لیے اندر آ گئی۔

''السلام علیکم! ہم تو آپ کو لینے جا رہے تھے'' منہب نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ٹی وی آن کر لیا۔

''چاچو کہاں ہیں؟''

''اماں کی دوائیاں لینے گئے ہیں'' منیم نے مصروف سے انداز میں سلاد کے لیے فروٹ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

''ملشہ کچن سے باہر آئی تو مانیہ کو کارپٹ پر سر جھکائے گم سم بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

''مانی! کیا بات ہے؟'' اسے کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہو رہا تھا۔

''کچھ نہیں چاچی!'' وہ گڑبڑا کر سیدھی ہوئی۔

''کوئی بات تو ہے۔ تم کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو'' وہ یقین سے گویا ہوئی۔

''نہیں تو'' مانیہ نے دانستہ مسکرانے کی کوشش کی۔

''میرے ساتھ غلط بیانی کرو گی''

''نن، نہیں چاچی''

''میرے کمرے میں آؤ فوراً'' وہ اُٹھ کر اپنے بیڈروم میں چلی گئی تھی۔ کچھ دیر مانیہ بھی سر جھکائے سوچوں میں گم چلی گئی۔

''اب بتاؤ، کیا پرابلم ہے؟ میں تمہاری دوست ہی نہیں ماں بھی ہوں۔ جھجکو مت، جو کچھ دل میں ہے کہہ دو'' اس نے پیار سے نرمی سے اس کا اعتماد بحال کیا تھا۔ جبھی تو وہ لرزیدہ آواز میں کہنے لگی تھی۔

''بڑی چاچی کے بھائی ہیں نا۔ بنکاک والے، اکثر موبائل پر فون کرتے ہیں''

''کیوں؟'' اس کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔

''وہ کہتے ہیں۔ میں ان سے شادی کر لوں'' مانیہ معصومیت سے بولی۔

''تم نے پھر کیا کہا؟''

''میں نے انہیں صاف صاف بول دیا ہے کہ چاچی اور اماں سے بات کر لیں''

''ہوں۔ تو یہ بات ہے'' وہ پرسوچ انداز میں سر ہلا کر بولی ''تم نے دیکھ رکھا ہے نا جمال صاحب کو۔ تمہارے منہاج چاچو جتنے ہوں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے ان کے بارے میں'' ملشہ نے بہت ہی دوستانہ لب و لہجے میں نرمی سے پوچھا۔

''مجھے نہیں اچھے لگتے وہ'' مانیہ نے ناک چڑھائی۔

''آئندہ ان کا فون مت سننا''

''مگر چاچی! وہ دھمکیاں دیتے ہیں کہ چاچو کو بتا دیں گے'' اس نے روہانسے انداز میں اصل وجہ بتائی۔

''او۔ تو بلیک میل کرنے کی کوششیں'' وہ ناگواری سے سوچتی رہی ''تم پریشان مت ہو۔ میں معاملہ سنبھال لوں گی'' ملشہ نے اسے تسلی دینے والے انداز میں کہا تھا اور پھر واقعی اس نے بہت احسن طریقے سے بھابھی کو ان کے بھائی کے کارنامے بتائے اور معاملے کی سنگینی کے متعلق دھمکایا۔ وہ دل ہی دل میں تلملاتے ہوئے اس کی کڑوی کسیلی باتیں سنتی رہیں بہرحال جمال صاحب کے فون آنا بند ہو چکے تھے اور انہوں نے مانیہ کے حصول کی کوششیں ترک کر کے ایک بیوہ سے نکاح کر لیا تھا۔

ملشہ نے سنا تو گویا اک بھاری بوجھ سے آزاد ہو گئی۔

مانیہ کے سیکنڈ ایئر کے پیپرز ہو رہے تھے اماں کو اس کے رشتے کی فکر لاحق ہو گئی۔ حالانکہ مہد بھی ابھی مانیہ کی شادی کے حق میں نہیں تھا مگر اماں کے اصرار اور ضد کی وجہ سے وہ خاموش ہو گیا۔

ان دنوں اس کے لیے کیپٹن سعد کا پرپوزل آیا تھا جسے متفقہ طور پر قبولیت کی سند بخش دی گئی۔

گھر میں شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ مہد نے مانیہ کی شادی بہت دھوم دھام سے کی تھی۔ شادی کے سلسلے میں مانیہ کے بڑے چچاؤں نے دس دس ہزار کے چیک دے کر گویا اپنا فرض ادا کر دیا تھا اماں بی اس موقع پر خاموش نہیں رہ سکی تھیں۔

انہوں نے بیٹوں کو خوب خوب شرمندہ کیا تھا مگر وہ بھی بڑھتی مہنگائی، اخراجات کی پوری تفصیل رٹ کر آئے تھے۔

مانیہ رخصت ہو گئی تھی اس کے جانے کے بعد ملشہ کو تنہائی کا احساس ستانے لگا تھا۔ حالانکہ وہ بہت کم گو تھی اس کے باوجود اس کی موجودگی سے خوب رونق کا احساس ہوتا تھا لڑکے تینوں پورا دن باہر گزار کر شام کو گھر آتے تھے۔ ان کی اپنی بہت سی مصروفیات تھیں اماں بھی زیادہ ارد گرد کی سہیلیوں میں مصروف رہتیں۔ رہا مہد تو وہ نجانے کیوں الجھا الجھا سا پریشان اور تھکا تھکا سا لگنے لگا تھا۔ ملشہ کے بہت دفعہ پوچھنے پر ہنس کر ٹال دیتا مگر ایک روز ملشہ کو اس کی پریشانی کی وجہ معلوم ہو گئی۔

''سات لاکھ قرض اور نوکری بھی چھوٹ گئی'' وہ فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ مہد جس کمپنی میں جاب کرتا تھا وہ دیوالیہ ہو گی۔ فلیٹ خالی کرنے کا نوٹس بھی مل گیا تھا اور اس بڑھتی مہنگائی میں وہ ہراساں سی بدلتے وقت کی کروٹوں میں چھپی اذیتوں کو محسوس کرتی رہی۔ دس دن کی خجل خواری کے بعد معمولی سا مکان سات ہزار ماہانہ کرائے پر مل گیا۔ تھوڑی بہت رقم موجود تھی۔ سو وہ خاموشی سے اس آثار قدیمہ کے مکان میں آ گئے۔ اماں تو مکان کی خستہ حالی کو دیکھ کر چیخ اٹھیں۔

یہ کہاں لے آئے ہو مہد! ارے ہوا کے زور پر چھتیں ہلنے لگتی ہیں۔ کسی روز آ گریں گی ہمارے اوپر'' انہیں پرانی سہیلیوں کے چھوٹنے کا بھی غم تھا وہ یہاں آ کر سخت غم و غصے کا شکار تھیں

کچھ وہ عمر کی اس حصے میں تھیں کہ بات بات پر چڑنے لگتیں۔ جھگڑنے لگتیں نہ انہیں کھانا پسند آتا نہ ہی موجودہ رہائش۔

مہد کو بہت کوششوں کے بعد پندرہ ہزار ماہوار تنخواہ پر ملازمت مل گئی تھی۔ ملشہ نے بھی ایک پرائیویٹ سکول میں جاب کر لی۔ اسے سات ہزار تک سیلری مل جاتی تھی۔ مگر زندگی کا یہ مشکل ترین دور تھا۔

اک طویل تھکا دینے والے مشقت بھرے دن کا آغاز اماں کی پھٹکار، کوسنوں اور جھگڑے سے ہوتا تھا۔ گھر کے کام، لڑکوں کے کپڑوں کی دھلائی وغیرہ، اماں کا پرہیزی کھانا۔ اسکول سے آ کر وہ گھن چکر بن جاتی۔ مہد خود دو دو جگہ کام کر رہا تھا منہب انہیں دنوں ایک دوست کے توسط سے باہر چلا گیا تھا کچھ ہی عرصے بعد اس نے منیم اور ملت کو بھی بلوا لیا۔ ملت اور منیم جانا نہیں چاہتے تھے مگر اچھے مستقبل کی خواہش نے آگے بڑھنے کی لگن پیدا کر دی تھی۔ پھر ان کے سامنے وسیع جہاں تھا۔

مہد نے انہیں اچھی طرح سمجھا بجھا کر بھیجا تھا۔

''اپنی پڑھائی پر توجہ دینا۔ ادھر کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ابھی تم لوگ اتنے باشعور نہیں ہو کمائی کے چکروں میں پڑو گے تو تعلیم ادھوری رہ جائے گی میں تم تینوں کو اعلیٰ مقام پر دیکھنا چاہتا ہوں''

بچے چلے گئے تو گھر میں ویرانیاں اتر آئیں مانیہ کبھی کبھار رہنے کی غرض سے آ جاتی تھی۔ اماں کے وہ ہی روز و شب تھے ہر وقت کچھ نہ کچھ بڑبڑاتی رہتی تھیں۔

اگلے دو سال کس مشکل اور کٹھن ترین مرحلوں سے گزر کر انہوں نے مانیہ کی شادی کے سلسلے میں لیا جانے والا قرض اتارا تھا۔

''مہد کی تنخواہ میں بمشکل گزر بسر ہو رہی تھی۔ جبکہ ملشہ کے سات ہزار تو کرائے میں چلے جاتے تھے اماں کی دوائیاں، ان کے لیے سوپ، جوسز، فروٹ اور گوشت، دودھ وغیرہ پر بچت کی رقم آرام سے خرچ ہو جاتی۔

کبھی کبھار تو مہد اور اسے اچار اور چٹنی کے ساتھ روٹی نگلنا پڑتی تھی۔ اماں اپنی خوش خوراکی کی وجہ سے چاق و چوبند تھیں۔ ان کی زبان کے جوہر شادی کے آٹھ سال بعد ملشہ پر اچھی طرح آشکار ہو گئے تھے۔

ویسے بھی کسی نے سچ ہی کہا تھا کہ مشکل وقت میں اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے اس بوجھل، تکلیف دہ پر مشقت دنوں میں ہوا کا ٹھنڈا پرنم جھونکا جیسی اس خبر نے مہد اور اسے حیران، ششدر اور بے تحاشا خوشی سے ہمکنار کر دیا تھا۔

وہ ماں بننے والی تھی۔ آٹھ سال گزر گئے تھے اس ایک خبر کو سننے کے لیے کان ترس رہے تھے دلوں میں حسرتیں تھیں اور آنکھوں کی جوت ماند پڑ رہی تھی۔

''بی بی! ہم تو مایوس ہی ہو چکے تھے'' اماں بھی حیران تھیں۔ ملشہ اپنی خوشی اور جنون میں ان کے لہجے کے مفہوم پر خود کو الجھانے کی بجائے ان دنوں خوش تھی بے تحاشا خوش۔

مہد کی ضد اور اصرار پر اس نے جاب چھوڑ دی تھی۔

نو مہینے کے انتظار کے بعد اللہ نے انہیں اپنی رحمت سے نوازا تھا۔ ننھی شفق کی آمد نے ان کی بے رنگ زندگیوں میں رنگ ہی رنگ بھر دیئے تھے۔

منہب، منیم اور ملت کے فون روزانہ ہی آتے۔ وہ اپنی چھوٹی سی کزن کو دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔

ملشہ کو اک ننھا منا سا جیتا جاگتا کھلونا مل گیا تھا وہ پورا دن اپنی بیٹی کو سجانے سنوارنے میں مصروف رہتی۔

کبھی اسے نہلاتی کبھی سیریلیک کھلاتی۔ کبھی شفق کے لیے کھچڑی پکانے لگتی، کبھی دلیہ بناتی اس کے لیے چھوٹی چھوٹی فراک سیتی۔ قمیضوں پر ستارے ٹانکتی۔ اس پل ملشہ کی اپنی آنکھیں ستاروں سے گویا بھر جاتی تھیں۔

مہد اس کی دیوانگی دیکھ کر مسکراتا رہتا تھا۔

''کیا سارا پیار شفق پر لٹا دینا ہے۔ یہ چھ فٹ گیارہ انچ کا آدمی نظر نہیں آتا''

''میری بیٹی سے جیلس ہونے کی ضرورت نہیں'' وہ شفق کی اجلی پیشانی کو چوم کر کہتی۔

''صرف تمہاری'' مہد چیخ اٹھتا۔

''یہ چیٹنگ کیوں؟'' وہ ناراضی سے پوچھتا۔

''بیٹیاں باپ کی ہوتی ہیں اور بیٹے ماں کے۔ تم اپنے لیے اور بندوبست کر لو''

''جائیے اپنا راستہ ناپیئے۔ میرے اور میری بیٹی کے پیار کے بیچ دیوار چین بننے کی ضرورت نہیں'' وہ شاہانہ انداز میں جتاتی۔

''اس کا مطلب ہے تمہیں اور بے بی کی ضرورت نہیں'' وہ کچھ نا قابل فہم لہجے میں بولا۔

''نہیں'' ملشہ نے قطعیت سے کہا۔

''ہوں'' مہد نے محض ہنکارا بھرا۔ اس کے دل پر سے اک نادیدہ بوجھ ہٹ گیا تھا۔ بیٹی کی پیدائش کے دوران کچھ پیچیدگی کی وجہ سے وہ مزید ماں نہیں بن سکتی تھی۔ یہی بات مہد اس سے چھپائے کافی مضطرب تھا۔ مگر اب وہ مطمئن ہو چکا تھا۔ تبھی اس نے ملشہ کو سچائی بتا دی۔ وہ بغیر کچھ کہے سنتی رہی تھی اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اس کے پاس شفق موجود تھی اس کی پوری کائنات۔

شفق نے پاؤں پاؤں چلنا سیکھ لیا اس کے لبوں سے نکلنے والا پہلا لفظ ''ماں'' تھا۔

شفق کی مسکراہٹ، اس کی ہنسی، آنسو، وہ تو گویا بیٹی کی ایک ایک ادا پر قربان ہو جاتی تھی۔

''ایسی بھی کیا دیوانگی'' اماں کو محبت کے ان مظاہروں سے بہت چڑ تھی۔ وہ اس پیاسی عورت کے صحرا دل کی کیفیات سے قطعاً نا آشنا تھیں۔

شفق کی اسکولنگ شروع ہوئی تو ساتھ ہی مہد کے ٹرانسفر آرڈر آ گئے۔ اماں بی نے گویا سکھ کی سانس لی تھی۔

''کچھ ہی دن بعد وہ اپنے آبائی شہر آ گئے تھے یہاں سب کچھ ویسا ہی تھا۔ بس منہب، منیم اور ملت نہیں تھے۔

گھر کی حالت نہایت خستہ تھی۔ گندگی کے ڈھیر اور دھول مٹی سے اٹا فرنیچر، ابھی تک اماں بی کی بہوویں نیچے والا کچن استعمال کرتی تھیں۔

شفق یہاں آ کر بہت خوش تھی اس کے ہم عمر اور کچھ بڑے سائز کے ہر طرح کے بچے موجود تھے وہ تتلی کی مانند اڑتی پھرتی تھی ملشہ بیٹی کو خوش دیکھ کر خود بھی مسرور ہوتی رہتی۔

☆☆☆

منہب نے ایک انگریز مسلم لڑکی سے شادی کر لی تھی ملت نے ایک ہفتہ پہلے اطلاع دے کر انہیں باخبر کر دیا تھا۔ ملشہ کو اک عجیب سے احساس زیاں نے گھیر لیا۔

''کم از کم منہب مجھے تو مطلع کر دیتا'' وہ کافی رنجیدہ تھی۔ مہد کے استفسار پر اس نے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔

''منہب نے مجھ سے پوچھا تھا گرین کارڈ اس کی مجبوری تھی۔ پھر وہ اپنے فیصلوں

میں خودمختار ہے اور ہم بچوں کی خوشی میں خوش۔ مجھے تو آج تک یہ محسوس نہیں ہوا کہ یہ بچے منیر بھائی کی اولاد ہیں مجھے ان سے اپنی اولاد کی طرح کا پیار ہے'' منہب نے شفق کے لیے ڈھیروں کھلونے، کپڑے اور دیگر ضرورت کی بے حد اسٹائلش چیزیں بھجوائی تھیں۔ اصل فساد اسی وجہ سے شروع ہوا تھا بسمہ اور نادیہ جلبلاتی رہی تھیں مگر اس میں نہ شفق کا قصور تھا نہ ملشہ کا۔ مہد نے جھگڑا ختم کرنے کی غرض سے کہا۔

''تم کچھ چیزیں ان سب میں بانٹ دو''

''ٹھیک ہے'' ملشہ خود بھی ہنگامہ اور بدمزگی نہیں چاہتی تھی مگر اوپر والوں کے مزاج تو وہ آج تک سمجھ نہیں پائی تھی۔

''ہمیں خیرات نہیں چاہیے'' نادیہ بھابی کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ دو گھنٹے ان کی فضولیات سن سن کر اس کا دماغ دکھنے لگا۔ نیچے آئی تو اماں نے الگ سے ہنگامہ کھڑا کیا تھا۔

''میری لال مہندی کا پیالہ اُلٹ دیا ہے اس چھٹکی نے'' وہ شفق کو خوب کوس رہی تھیں جو کہ فرش پر گری مہندی سے ہاتھ رنگنے میں مصروف تھی۔

''یہ میری ہے۔ یہ میری ہے'' ملشہ نے اسے ڈانٹ کر فرش کپڑے سے صاف کیا تو شفق نے رو رو کر پورا گھر سر پر اٹھا لیا۔

''میں نے بیندی ''مہندی'' لگانی ہے یہ میری ہے، مجھے دو ماما! مجھے دو'' وہ فرش پر پاؤں پٹختی رہی۔ ملشہ نے پیالہ اٹھا کر کچن میں رکھا اور شفق کو گود میں لیے اس کے ہاتھ دھلوانے لگی۔

''بابا کو بتاؤں گی۔ ماما گندی ہیں'' دادو گندی ہیں'' وہ مسلسل چیختی رہی۔

''جا، باوا کو بتا دے۔ میں نہیں ڈرتی ورتی تیرے باوا سے'' اماں بھی خوب مقابلہ کیے جاتی تھیں یہاں تک کہ شفق رو رو کر چپ کر جاتی۔

''اس کے حلق میں تو بیٹری فٹ ہے کم بخت چلائے جاتی ہے۔ سیل نہیں رکتے اس کے'' وہ بے زاری سے کہتیں۔

''آپ کے سیل نہیں رکتے'' شفق کی ایک عادت بہت پختہ ہو چکی تھی جو کچھ وہ بڑوں کے منہ سے سنتی تھی مسلسل دہراتی رہتی۔ ملشہ کے غصہ کرنے مارنے ...... پر بھی وہ باز نہیں آتی تھی اگر وہ مہد سے شکایت کرتی تو وہ آرام سے کہہ دیتا ''وقت کے ساتھ ساتھ ٹھیک ہو جائے گی''

''ملشہ! سمجھا لے اس چھٹکی کو، ورنہ لگاؤں گی دو ہاتھ'' اماں جلبلانے لگیں۔

''میں بھی لگاؤں گی دو ہاتھ'' شفق بھی پورے جوش کا مظاہرہ کرتی۔

''آ لے تیرا باوا، بتاتی ہوں اسے تیری بدزبانی کے متعلق'' اماں بھی سیخ پا ہو جاتیں۔

''آپ کے باوا کو بھی بتاتی ہوں۔ آپ گندی ہیں، دادو گندی ہیں'' وہ گیت گاتی پھر رہی تھی اور اماں بی کی توپوں کا رخ ملشہ کی طرف ہو گیا۔

''بڑی اچھی تربیت کر رہی ہو۔ یہ ہے چومنے چاٹنے کا انجام''

''اماں! بچی ہے سمجھ جائے گی'' وہ دبی آواز میں صفائی دینے لگی۔

''نہ جی نا۔ یہ نہیں سمجھنے والی۔ پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آ جاتے ہیں۔ چونڈے میں خاک ڈلوائے گی۔ ذرا اگ تو لینے دو اسے۔''

''خدا نہ کرے'' ملشہ نے دہل کر دل ہی دل میں بے ساختہ کہا'' اماں بھی حد کرتی ہیں'' اسی وقت مہد بھی آ گیا تھا اور شفق قلانچیں بھرتی باپ سے لپٹ گئی۔

''دادو ڈانٹتی رہیں'' اس نے شکایت لگائی۔

''آپ نے تنگ کیا ہو گا دادو کو''

''نئی۔ صرف بیندی (مہندی) لی تھی''

''پیالہ الٹ دیا تھا اس نے مہندی کا'' وہ غصے سے بھری بیٹھی تھیں ایک دم شروع ہو گئیں۔

''میرے بابا اور لا دیں گے'' شفق شاہانہ انداز میں بولی۔

''فیکٹریاں چلتی ہیں نا تیرے باوا کی''

''اماں! بس بھی کریں'' مہد نے ناگواری سے ٹوکا۔

''لو اب، ماں کا بولنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ یوں کر میرا منہ کپڑے سے باندھ دو، یا ٹیپ چپکا دو'' وہ تنتنا اٹھیں۔

''نہ بولوں گی نہ بات بڑھے گی۔ سارا فساد اس نگوڑی زبان کا ہی تو ہے''

''ملشہ! اماں کے لیے کھانا لاؤ''

''کھا لیا ہے میں نے دال کا ملغوبہ'' وہ سخت بے زار تھیں۔

''اماں! آپ کے لیے پرہیز اب ضروری ہے ذرا سی بدپرہیزی کے بعد رات بھر تکلیف سے بے چین رہتی ہیں'' مہد نے نرمی سے سمجھایا۔

''ہاں ہاں، رات بھر تمہاری جورو کو جاگنا پڑتا ہے۔ بیوی کے بغیر نیند کیوں آنے لگی

ہمارے صاحبزادے کو"

"ایسی کوئی بات نہیں" وہ خفت زدہ رہ گیا۔

"میں سب سمجھتی ہوں کیوں خود پر جبر کرتے ہو جب باقیوں سے فیض نہیں ملا، سکھ نہیں پایا، نہ ہم نے شکوہ کیا نہ شکایت۔ تو تم بھی ہری جھنڈی شوق سے دکھا دو۔ لبوں پر قفل لگا دیں گے۔ کسی کو "فرمانبردار" بیٹوں کی اصلیت نہیں بتائیں گے" وہ سیب کی قاشیں کھاتے ہوئے ناراضی سے گویا ہوئی۔

"یہ دودھ کیساتھ دوا کھا لیجیے گا" مہد اٹھتے ہوئے تاکیداً بولا۔

"کھا لوں گی۔ ساری دوائیں کھا لوں گی۔ گولیاں پھانکنے کے علاوہ اور بھی کوئی کام ہے مجھے"

"اماں! ایک بات کہنا تھی" وہ چیزیں ٹھکانے پر لگا کر ان کے قریب بیٹھ گئی۔

"صاف صاف بات کیا کرو۔ پہلے ہزار تمہیدیں باندھنے لگتی ہو" اماں کو اس کی ہر بات پر اعتراض رہنے لگا تھا۔

"اماں! دراصل تائی اور تایا جی کراچی آ چکے ہیں۔ کل وہ ادھر آئیں گے ہمارے پاس پھر بجوات چلی جاؤں بارہ سال ہو چکے ہیں میں تو وہاں کے راستے بھی بھولنے لگی ہوں"

"نہ بی بی! ہم نے تو ایک دن بھی پابندی نہیں لگائی۔ نہ منع کیا، میاں سے کہنا تھا وہ ہر سال ہی لے جاتا" وہ بے نیازی سے بولی تھیں۔ ملشہ انہیں جتا نہیں سکی تھی کہ ان بارہ سالوں میں فرصت کا کون سا لمحہ اسے میسر آیا تھا کہ وہ میکے والوں کو دو گھڑی یاد ہی کر لیتی۔

"تائی جی صرف بیس دنوں کے لیے کویت سے آئی ہیں۔ یہاں سے انہوں نے جدہ جانا ہے میں اتنے دن ان کے پاس رہنا چاہتی ہوں"

"شوق سے رہو۔ ہم منع کرنے والے کون ہوتے ہیں اگر وہ مل جائیں گی تو پھر ننھی سی بچی کو لے کر خوار ہونے کی کیا ضرورت ہے" وہ کوئی نہ کوئی اعتراض اٹھا ہی لیتی تھیں ملشہ دل مسوس کر اٹھ گئی۔

رات کو سونے سے پہلے اس نے مہد سے ذکر کیا تو وہ کافی دیر سوچتا رہا تھا پھر بولا تو لہجے میں محسوس کی جانے والی نرمی تھی جو اس کی شخصیت کو نکھار بخشتی تھی۔

"اماں کو کسی نے وقت پر دوا دینی ہے نہ خوراک۔ مجھے آفس سے چھٹی ملنا مشکل ہے

ورنہ دو تین دن میں گھر میں اماں کی دیکھ بھال کر لیتا۔ دوسرے شفق کیسے اس پسماندہ علاقے میں رہے گی۔ موسم بھی گرمی کا ہے بچی بیمار ہو جائے گی بہر حال میں تمہیں جانے سے روک نہیں رہا"

"اپنی بھاوجوں کو دیکھا ہے بڑھاپے میں بھی میکے کی دہلیز کے درشن کرنے سے باز نہیں آتیں۔ بچے جوان ہو گئے ہیں مگر ان کی روٹین میں فرق نہیں آیا اور ایک میں ہوں بارہ سالوں میں پہلی مرتبہ جانے کا نام لیا ہے تو سو طرح کے مسائل منہ کھولے کھڑے ہیں" ملشہ سخت کبیدہ خاطر ہو رہی تھی۔

"غصہ مت کرو۔ تائی جی کو آنے تو دو پھر چلی جانا میں تمہیں منع نہیں کر رہا" مہد نے نرم آواز میں کہا تھا۔ اس کے لہجے کی ملائمت نے ملشہ کے غصے کا گراف لمحوں میں گرا دیا تھا ہمیشہ ایسے ہی تو ہوتا تھا اسی طرح تو ہوتا تھا کچھ دیر بعد وہ اور پہلوؤں پر غور کرنے لگی۔

"بجوات میں گرمی کا موسم عروج پر ہے اے سی بھی نہیں، یو پی ایس کی سہولت بھی نہیں مچھر بھی ہوں گے۔ کہیں شفق بیمار نہ پڑ جائے پھر اماں کا مسئلہ بھی ہنوز برقرار ہے۔ انہیں باتھ روم کون لے کر جائے گا۔ دوا، کھانا پینا اور سب سے بڑھ کر ان کی ٹانگ پر مالش کون کرے گا مجھے اپنا پروگرام ملتوی کر دینا چاہیے" وہ فیصلہ کر چکی تھی اماں کو واش روم میں پھسلنے کی وجہ سے ٹانگ پر چوٹ لگ گئی تھی جس کی وجہ سے انہیں چلنے پھرنے میں دقت کا سامنا تھا۔

اگلی شام تایا جی اور تائی جی دونوں بھاری بھرکم سامان ہمراہ لیے آ گئے تھے یہ سب تحائف شفق کے لیے اور اپنی سہیلی کے لیے تائی جی لائی تھیں۔ تائی جی بہت کمزور اور کافی بوڑھی ہو چکی تھیں۔

وہ پورا ایک ہفتہ اس کے پاس رہی تھیں۔ ان دنوں ملشہ بہت خوش تھی۔ اس کی آنکھوں سے مسرت کی کرنیں نکل کر اس کے چہرے کو روشن کر رہی تھیں۔

جانے سے پہلے تائی جی نے اس سے تنہائی میں پوچھا۔

"چندا! تو خوش ہے۔ میرا انتخاب غلط تو نہیں"

میں نے قمر پر بھروسہ کر کے تیرے ساتھ زیادتی تو نہیں کی"

"میں بہت خوش ہوں تائی جی!" وہ انہیں ہر طرح سے مطمئن کر چکی تھی تائی جی بجوات میں بیس دن رہنے کے بعد واپس کویت چلی گئی تھیں جانے سے پہلے ایک مرتبہ پھر وہ دو دن اس کے پاس رہیں۔ مہد انہیں ایئر پورٹ چھوڑ کر آیا تھا۔ رات کو جب ملشہ کاموں سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آئی تو مہد کے سینے پر شفق لیٹی سو چکی تھی اس نے احتیاط سے شفق کو

بیڈ پر لٹایا تھا پھر خود گھوم کر دوسری طرف بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔

''ہماری شکایتیں تو خوب لگائی ہوں گی'' مہد کا ہاتھ کچھ دیر بعد اس کے بازو پر سرسرانے لگا۔

''ایں۔ کیسی شکایت؟'' وہ چونکی۔

''اب بنو نہیں۔ خالہ کو اماں کے رویے کے متعلق تو ضرور بتایا ہوگا'' مہد نے وثوق سے کہا۔

''میں آپ کو شکایتی ٹٹو یا چغل خور لگتی ہوں'' ملشہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

''او۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں'' وہ جھنجلایا۔

''تم نے اماں کی زیادتیوں کے متعلق تو ضرور بتایا ہوا''

''کیسی زیادتیاں؟'' وہ حیران ہوئی'' اماں میری ماں ہیں اگر غصے میں کچھ کہہ لیتی ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں سب کے سامنے ڈھنڈورا پیٹتی رہوں۔ ویسے بھی اماں جیسے لوگ تو نیت کے کھرے اور دل کے صاف ہوتے ہیں'' اس کی آواز میں بلا کی نرمی تھی۔

بہت سال تک وہ بھی اماں کو دل کا صاف اور نیت کا کھرا ہی سمجھتا رہا تھا۔ ہمدرد، پُرخلوص اور احساس کرنے والی۔ مگر کھرے اور کھوٹے کی پہچان آزمائش کی بھٹی میں جلنے کے بعد معلوم ہوتی ہے اور آزمائش پر کوئی پورا اترتا ہے۔

''آپ نے ایسا سوچا بھی کیوں؟'' وہ کافی ناراضی سے کروٹ بدلے مہد کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''غلطی ہوگئی ہے۔ معاف کردو''

''مجھے آپ کے خیالات جان کر افسوس ہوا ہے' یعنی آپ نے مجھے اس قدر گھٹیا نیچر کا سمجھا ہے'' اس کا ملال کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

''مجھے کیا پتا تھا کہ تم اپنی ساس کے معاملے میں اتنی حساس ہو'' مہد نے اس کی ناک ہولے سے دبائی۔

''اماں میرے لیے کیا ہیں۔ یہ میں آپ کو لفظوں میں نہیں بتا سکتی۔ اماں کے لیے میرے دل میں بہت عقیدت ہے بہت محبت ہے۔ میں ابھی تک حیران ہوں کہ چند سطروں کے ایک خط کو پڑھ کر اماں نے اتنا بڑا فیصلہ کرلیا تھا تائی جی اماں کی سہیلی تھیں مگر کیا کوئی دوستی میں اتنا

بڑا قدم اٹھا سکتا ہے۔ اپنے وجیہہ سے بیٹے کے لیے ایک عام سی لڑکی کا انتخاب کرنا۔ یہ بہت اعلیٰ ظرفی کی بات ہے۔ اماں جتنا چاہے مرضی غصہ کرلیں مگر انہوں نے کبھی مجھے یہ نہیں جتایا کہ وہ کسی احسان کے بدلے میں مجھے لے کر آئی تھیں۔ میں تو'' شدت جذبات میں اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ اور ادھر مہد کو اسے ستانے کا ایک اور موضوع مل گیا۔

''اچھا تو تم نے تسلیم کرلیا ہے کہ میں بہت وجیہہ ہوں اور تم عام سی ہو''

''بہت وجیہہ نہیں صرف وجیہہ اور میں تو بہت ہی زیادہ خوبصورت ہوں، آپ کو سننے میں غلطی ہوئی ہے'' ملشہ بھی صاف مکر گئی۔

''اتنا بڑا سفید جھوٹ'' مہد نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

''آہستہ بولیے شفق اٹھ جائے گی'' اس نے کسمساتی شفق کو ہولے سے تھپکتے ہوئے کہا۔

''پہلی بہو دیکھی ہے جسے ساس سے کوئی شکوہ نہیں، شکایت نہیں'' وہ اسے چھیڑنے سے باز نہیں آیا۔

''خاموشی سے سونے کی تیاری کریں۔ صبح دفتر سے ہمیشہ لیٹ ہو جاتے ہیں''

''تم آؤ تو سہی، بقول اماں کے جورو کے بغیر نیند کہاں آتی ہے'' مہد نے شرارت سے کہا تو ملشہ اسے گھورتی رہی تو پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

☆☆☆

''ماما! نومی نے مجھے پھر سے مارا ہے'' روتی بسورتی شفق اس کے دوپٹے کا پلو تھام کر منمنائی۔

''آپ کیوں اوپر گئی تھیں۔ میں نے منع کیا ہے نا نومی کے ساتھ نہیں کھیلنا'' ملشہ نے شفق کو بری طرح ڈپٹا تو وہ اور شدت سے رونے لگی۔

''میں کس کے ساتھ کھیلوں؟''

''باربی کے ساتھ کھیلو'' ملشہ نے پچکارا۔

''باربی گندی ہے۔ میں بھاگتی ہوں تو مجھے پکڑتی بھی نہیں'' شفق بسوری'' مجھے نومی جیسا بھائی چاہیے''

''لو اور سن لو'' اماں تخت پر لیٹی ہوئی تھیں۔ وہیں سے چمک کر بولیں'' اماں باوا سے کہو۔ تمہیں نہ جانے کیسے آٹھ سالوں میں پیدا کر دیا ہے''

''مہد بے چارا ہی اولاد نرینہ سے محروم ہے۔ باقی سب کے تو بیٹے ہی بیٹے'' نادیہ

بھابھی قریب سے گزرتے ہوئے استہزائیہ بولی تھیں پھر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر چلی گئیں۔ ان کے رنگ بھی کھلنے لگے تھے۔ ملشہ دل میں اٹھتی غصے کی لہریں دباتی شفق کو نوڈلز بنا کر دینے لگی۔ پیپسی، نوڈلز اور چپس کھانے کے بعد بھی اس کی ضد ہنوز وہ ہی تھی۔

''مجھے بھائی چاہیے''

''لادیں گے بھائی بھی'' وہ اسے بہلا پھسلا کر نہلانے لگی۔

''کب؟'' وہ مچلی۔

''بابا شہر سے لادیں گے'' ملشہ نے اسے ٹالا۔ مگر وہ تو گویا مہد کے انتظار میں بیٹھی تھی بار بار کچن میں اس سے آکر پوچھتی۔

''ماما! ٹائم کیا ہوا ہے؟'' ''بابا کب آئیں گے''

''سات بجے آئیں گے''

''سات کب بجے گے؟'' وہ بے قراری سے بولی۔

''جب کلاک نے میوزک بجایا''

''پہلے بھی تو میوزک سنا تھا میں نے''

''اس وقت چھ بجے تھے'' وہ زچ ہو کر پلٹی ''چلو تم کتابیں لے کر آؤ''

''میں نہیں پڑھوں گی''

''میں چاکلیٹ بھی نہیں دوں گی'' ملشہ نے اسے دھمکایا۔

''بابا لادیں گے'' اسے کون سا پروا تھی۔

''چاچی! ماما کہہ رہی ہیں کھانا تیار ہے تو دے دیں'' قاسم کچن کے دروازے میں کھڑا تھا۔ ملشہ نے ڈونگے میں سالن ڈالا۔ رومال میں روٹیاں لپیٹ کر ٹرے میں رکھیں اور فریج میں سے کھیر کا باؤل بھی نکال کر دیا۔ باری باری سب ہی اپنا کھانا لے کر چلے گئے تھے اتنی توفیق نہیں ہوتی تھی کہ نیچے آکر ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھالیں۔ اور ادھر منہب ابھی تک شاک میں مبتلا تھا رات کو اس کا فون آیا تو اس کے پوچھنے پر ملشہ نے صاف صاف بتا دیا۔ وہ حیران تھا۔

''ابھی تک ایک ہی کچن میں سب کا کھانا بنتا ہے اور آپ ہی یقیناً بناتی ہوں گی کمال کرتی ہیں آپ چاچی! اماں سے بات کریں کہ ان سب کے کچن الگ کر دیں۔ اپنا علیحدہ کھانا بنایا کریں کب تک آپ ان سب کو ٹرے میں سجا سجا کر دیتی رہیں گی''

ملشہ اسے کیا بتاتی کہ اپنی کم ہمتی کی وجہ سے وہ اماں تو کیا بڑی جیٹھانیوں سے بات نہیں کر سکتی تھی اور وہ سب اسے بے دام کا غلام سمجھ کر حکم چلاتی رہتی تھیں۔

''سونیا بھابھی نے بھی کئی مرتبہ اسے احساس دلانے کی کوشش کی تھی'' کب تک ان کی خدمتیں کرتی رہو گی''

''مگر وہ پھر بھی مہد سے علیحدگی کے بارے میں بات نہیں کر سکی تھی۔ لاشعوری طور پر وہ اماں بی کو کسی ملال میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ نہ ہی وہ یہ چاہتی تھی کہ اماں کو اپنے انتخاب پر پچھتانا پڑے۔ کل کو یہی جیٹھانیاں اماں کو طعنے تشنے دیں یہ تو اسے کبھی بھی گوارا نہیں تھا وہ تائی جی کا فون سن کر باہر آئی تو شفق دھواں دھار رو رہی تھی اس کے ماتھے پر اتنا بڑا گومڑ دیکھ کر وہ دھک سے رہ گئی۔

''کیا ہوا ہے؟'' اس نے بے ساختہ روتی، چلاتی شفق کو خود سے لپٹا کر پوچھا۔

''نومی اور فہد نے مارا ہے''

''چاچی! یہ جھوٹ بول رہی ہے'' فہد اور نومی صاف مکر گئے تھے۔ شور کی آواز سن کر نائلہ بھابھی اور نادیہ بھابھی بھی نیچے اتر آئیں اپنی اور اپنے بچوں کی غلطی تو انہوں نے کبھی تسلیم ہی نہیں کی تھی۔ ان دونوں نے چلا چلا کر پورا گھر سر پر اٹھالیا۔

''موثق اور مسکان تو چلے گئے ہیں۔ اس کا دل ہے ہم بھی مکان خالی کر کے کرایوں پر دھکے کھائیں اس کی بچی کہاں کی مہارانی ہے۔ نہ کھیلا کرے ان کے ساتھ'' اماں بی ایسے موقع پر دانستہ گونگے کا گڑ کھا کے خاموشی کی بکل اوڑھ لیتی تھیں۔ وہ دونوں خوب گرج گرج کر اوپر چلی گئی تھیں۔ ملشہ نے دھول مٹی میں اٹی شفق کا منہ ہاتھ دھلا کر کپڑے بدلے۔ پھر ماتھے پر دوائی لگائی۔ شفق بہت سہم گئی تھی سسکاریاں بھرتے ہوئے اس سے چمٹ کر روتے روتے سو گئی۔ سونے سے پہلے اس نے ایک مرتبہ پھر التجا کی تھی۔

''شفق کو بھائی لادیں ماما! نومی اور فہد گندے ہیں شفق ان کے ساتھ نہیں کھیلے گی''

اب وہ شفق کی اس فرمائش کو بھلا کہاں سے پورا کرتی۔ خود بھی سوچتے سوچتے نیند کی وادی میں اتر گئی تھی۔ جب اٹھی تو مہد گھر آچکا تھا لاؤنج سے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

''بچے تو لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں ساتھ کھیلنے سے چوٹ بھی لگ جاتی ہے کسی نے جان بوجھ کر شفق کو دھکا تو نہیں دیا ایسی بھی کیا ناراضی کہ ملشہ نے کھانا نہیں کھایا۔ نائلہ نادیہ نے بازار سے روٹی منگوائی تھی۔ بسمہ میکے چلی گئی ہے رہ گئی میں، تو کسی کو کاہے کی پروا دوا کھانی تھی۔

پیٹ میں درد بھی تھا۔ رات سے بخار میں پھنک رہی ہوں میں۔ مگر کسی کو کیوں احساس ہونے لگا''
اماں جلے کٹے لہجے میں بھناتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ملشہ ناگواری اور غصہ دبائے باہر نکل آئی۔

''اماں کو کھچڑی بنا کر دی تو انہوں نے غصے کے اظہار کے طور پر کھانے سے انکار کر دیا۔ ملشہ اس طرح کے رویوں کی بارہ سالوں میں عادی ہو چکی تھی جانتی تھی کہ آدھا گھنٹہ مزید اصرار کروانے کے بعد اماں بی کھچڑی کھا کر اس پر احسان عظیم کر ہی دیں گی مہد روٹی اور مسور کی دال کھاتے ہوئے اماں کے غصے کا پس منظر پوچھ رہا تھا۔

''شفق کو سلاتے ہوئے آنکھ لگ گئی تھی میری'' اس نے دو لفظوں میں گویا بات سمیٹ دی تھی وہ بدمزگی نہیں چاہتی تھی وہ بات کو طول دینا نہیں چاہتی تھیں مگر پھر بھی وہ کچھ ہو گیا تھا جو ان کے گمان میں بھی نہیں تھا اور جس کی ''وجہ'' سے ملشہ کے ہاتھوں سے زنجیریں لپٹ گئی تھیں۔

☆☆☆

وہ دن بھی اتوار کا تھا اور ہمیشہ کی طرح بڑی بھابھیوں نے نچلے پورشن کے مشترکہ صحن کی صفائی دھلائی میں اس کا ہاتھ نہیں بٹایا تھا چونکہ چک کی شادی کے بعد ملشہ نے کوئی ملازمہ نہیں رکھی تھی کہ وہ لوگ اب کام والی کی تنخواہ افورڈ نہیں کر سکتے تھے البتہ بڑی بھابھیوں کے ہاں دو دو نوکرانیاں کام کرتی تھیں۔

وہ معمول کے مطابق کوڑے والا ڈرم خالی کروا کے صحن دھونے لگی تھی وائپر لگا کر پائپ سمیٹ کر وہ اوپر چلی گئی سب سے اوپر برآمدے میں واشنگ مشین رکھی تھی سب کے کپڑے اوپر ہی دھلتے تھے ابھی وہ مشین میں پانی ڈال رہی تھی جب شفق کی دردناک چیخوں نے اسے دہلا کر رکھ دیا وہ تقریباً بھاگتے ہوئے منڈیر تک آئی تھی۔

نیچے صحن میں جھانکا تھا اس کا کلیجہ گویا حلق میں آ گیا۔ شفق کا خون میں لت پت چھوٹا سا وجود صحن کے عین وسط میں پڑا جھٹکے کھا رہا تھا نومی سائیکل پر بیٹھا چیخ رہا تھا شاید شفق سائیکل سے گری تھی۔

لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ پلٹ کر سیڑھیاں اترنے لگی تھی دو دو سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اس کے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

''اتنا خون، اتنا خون، ہائے میری شفق'' وہ بے ساختہ چیخ رہی تھی جب نجانے کیسے اس کا پاؤں رپٹا اور وہ منہ کے بل ستائیس سیڑھیوں سے گرتی چلی گئی۔

اس کے سر پر شدید چوٹ لگی تھی۔ مگر خون کا ایک قطرہ نہیں گرا تھا۔ ڈاکٹرز کہتے تھے اگر بلیڈنگ ہو جاتی تو یقیناً ملشہ کا نروس سسٹم متاثر نہیں ہوتا۔ اس کے دماغ کی کسی وین میں خون منجمد ہو گیا ہے ڈاکٹرز کہتے تھے کہ آپریشن سے وہ بالکل ٹھیک ہو سکتی ہے۔ مگر آپریشن کے لیے کم از کم آٹھ نو لاکھ روپے کی ضرورت تھی۔

ادھر اماں دہائیں دے رہی تھیں کہ ''دماغ کا آپریشن تو نرا رسک ہے۔ یہ اب ٹھیک نہیں ہونے والی۔ پیسہ ضائع کرو گے اور وقت بھی''

شفق بھی ہسپتال میں تھی۔ اس کی تین جگہ سے ٹانگ ٹوٹ گئی تھی وہ سائیکل سے گری تھی اور فہد نے اس کے سر پر بیٹ مارا تھا بچی درد کی شدت سے بے ہوش ہو گئی تھی شفق کو ڈیڑھ ماہ بعد ڈسچارج کر دیا گیا تھا البتہ ملشہ ابھی تک ہسپتال میں تھی چھ مہینے ہسپتال میں رکھنے کے باوجود اس کا ذہن ٹھیک نہیں ہوا تھا۔

ڈاکٹرز اس کا ایک ہی حل آپریشن بتاتے تھے مہد ان دنوں بہت پریشان تھا۔ دفتر کی طرف سے اسے صرف اسی ہزار قرض ملا تھا یہ رقم بھی آہستہ آہستہ خرچ ہو چکی تھی شفق اب بغیر سہارے کے چل لیتی تھی پہلے کی طرح بھاگتی دوڑتی تھی مگر ملشہ کا ذہن گویا ایک نقطے پر ٹھہر چکا تھا۔

وہ کسی کو بھی پہچانتی نہیں تھی۔ حتی کہ شفق کو بھی نہیں۔ دورے کی حالت میں کئی کئی گھنٹے چیختی رہتی کمرے کی حالت ابتر کر دیتی۔ شفق کو بری طرح پیٹنے لگتی۔ یہ کیسی خود فراموشی تھی۔ یہ کیسی دیوانگی تھی۔ یہ کیسی آزمائش تھی۔ مہد رات رات بھر جاگتا رہتا تھا اس نے موٹر سائیکل، زیورات وغیرہ بیچ دیا تھا مگر پھر بھی آپریشن کے لیے رقم کا بندوبست نہیں ہو سکا تھا۔

بڑے بھائیوں سے بات کی تو انہوں نے اپنی اپنی مجبوریوں کی ایسی ایسی داستانیں سنائیں کہ مہد نے پھر سے بات کر کے گنوانے سے توبہ کر لی۔ موثق برطانیہ میں مقیم تھا اس نے خود ہی فون کر کے بتا دیا تھا کہ کلینک اسٹیبلش کرنے کی وجہ سے وہ بالکل کنگال ہو چکا ہے سونیا بھابھی نے تین لاکھ کا چیک دیا تھا جو کہ ملشہ کو چھ مہینے ہسپتال رکھنے کی وجہ سے دوائیوں کے بل، ڈاکٹرز کی فیس اور دیگر ضروریات پر خرچ ہوتے چلے گئے۔

سونیا بھابھی کبھی کبھار اس کی خیریت دریافت کرنے کی غرض سے آ جاتی تھیں۔ ان کے میکے والے پیرس سیٹل ہوئے تو وہ بھی فیملی سمیت باہر چلی گئیں۔

یہ گھر وحشت کدہ بنتا جا رہا تھا ملشہ کی چیخوں میں پوشیدہ نوحے گھر کے مکینوں کو سنائی

نہیں دیتے تھے وہ اس پاگل عورت کی دیوانگی سے بے زار ہو چکے تھے یہ بے زاریت نفرت کی شکل اختیار کر چکی تھی ان خود غرض لوگوں پر وہ اپنا خلوص اور قیمتی وقت برباد کرتی رہی تھی۔

''ہمارے بچے نیچے آنے سے خوفزدہ رہنے لگے ہیں۔ خدا کے لیے اماں! مہد سے کہیں اسے یہاں سے لے جائے ورنہ ہم لوگ ہی دفعان ہو جائے گے'' اب ملشہ کا وجود انہیں کھٹکنے لگا تھا۔

بسمہ کہتی ''میرے بچوں کو رات بھر نیند نہیں آتی'' ان کی زبانیں شعلے اگلتیں، کبھی یہ سب ملشہ کی خوشامد میں منہ سے شیرینی ٹپکاتی تھیں۔ نائلہ کے بچے بھی ذہنی توڑ پھوڑ کا شکار ہو رہے تھے ملشہ اب کمرے میں بند نہیں رہتی تھی بلکہ باہر بچوں کے درمیان آ کر بیٹھ جاتی۔ پھر وہ انہیں پیٹنا شروع کر دیتی تھی جس کی وجہ سے بچے ہر وقت سہمے رہتے تھے۔

ایک روز اماں نے مہد سے کہا۔

''تیرا انتظار لاحاصل رہے گا۔ بیٹے! یہ اب ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ تم نازنین سے شادی کر لو تیری خاطر ابھی تک جوگ لیے بیٹھی ہے۔ ملشہ سے تمہاری مزید اولاد بھی نہیں ہو سکتی میری بات مان لے مہد!''

مہد عجیب وحشت بھری نظروں سے ماں کو دیکھتا رہا تھا اس کی آنکھوں کی سرخیاں گہری ہونے لگیں۔

''وہ جو میرے مشکل وقت کی ساتھی ہے آج آزمائش اور تکلیف میں اسے چھوڑ دوں کس قدر خود غرض ہیں اماں آپ۔ ملشہ اب آپ کے کسی کام کی نہیں رہی تو اسے بے کار سامان کی طرح پھینک دوں۔

وہ میری بیٹی کی ماں ہے یہ مت بھولا کریں۔ مجھے امید ہے وہ ایک دن ضرور ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹ آئے گی''

''خوش فہمی ہے تمہاری'' اماں نے تنک کر کہا۔

''دادو! ملشہ چاچی کو کسی اسائیلم میں چھوڑ آئیں'' یہ فہد تھا۔

''چاچی گندی ہیں۔ ہر وقت شور کرتی رہتی ہیں۔ سونے بھی نہیں دیتیں'' سحر نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

بڑی بھابھیوں نے مشترکہ فیصلہ کر کے اماں بی کی راتوں کی نیندیں اڑا دیں۔

''ہم لوگ یہاں سے کہیں اور شفٹ کر جاتے ہیں دو گھڑی سکون بھی نہیں رہا اس گھر

میں'' اب ملشہ واقعی ان کے کام کی نہیں تھی۔ اس کی محبتوں اور بے لوث خدمتوں کا یہ صلہ تھا۔

''تم لوگ کیوں اپنا گھر چھوڑ کر جاؤ گے۔ میں اسے ہی نہ چلتا کروں'' اماں نے گویا فیصلہ کر لیا تھا۔ ملشہ نے آج سالن کا دیگچہ الٹ دیا تھا۔ اکثر وہ کچن میں گھس کر کوئی نہ کوئی نقصان کر دیتی تھی۔ جس کی وجہ سے بڑی جیٹھانیاں سیخ پا ہو جاتیں۔

کبھی کھیر میں نمک الٹ دیتی۔ کبھی چائے میں مرچیں ڈال دیتی۔ ایک دن اس نے اماں کے کپڑے جلا دیئے تھے۔ اس کے بعد اسے زنجیریں پہنا دی گئی تھیں۔ وہ کمرے تک محدود ہو گئی تھی۔ وہ سارا سارا دن بھوکی رہتی تھی اور بھوک کی وجہ سے چلاتی رہتی اس نے پورے تین ماہ خود کو اذیت دی تھی پھر اسے اپنے اوپر نہیں مہد یار پر ترس آ گیا تھا حالانکہ ابھی وہ اس خود ساختہ پاگل پن میں ان رشتوں کو اور بھی ''پرکھنا'' چاہتی تھی۔ مگر وہ مہد یار کو مزید دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ جو اس کی زندگی کا ساتھی تھا۔ وہ جو اس کے سر کا سائیں تھا وہ جو کڑی دھوپ میں رحمت کا بادل تھا۔ وہ کیسے مہد یار کو بے سکون کیے رکھتی۔ وہ کیسے اسے مزید اذیت میں مبتلا رکھتی۔

☆☆☆

دریا کے اس پار سے مجھے قمر سلطانہ اپنے لائق فائق اور خوبصورت بیٹے سے بیاہ کر لے آئیں۔ بجوات سے اس روشنیوں کے شہر میں آنے تک کا فاصلہ میں نے نیند اور خواب کے عالم میں طے کیا تھا۔ میں اس خواب کی کیفیت سے نکلنا چاہتی ہی نہیں تھی۔ بارہ سال میں نے نیند کی حالت میں گزار دیئے تھے میں نے رشتوں کو نہ سمجھا نہ پرکھا اور بے لوث اپنے انمول جذبات لٹاتی چلی گئی۔

صرف اس خوف کے زیر اثر کہ کوئی تیسرا فریق اماں کو جتا نہ دے کہ ان کا انتخاب غلط تھا اور یہ کہ وہ ان کی ساری بہوؤں میں سے سب سے زیادہ کم رو ہے۔

دیکھا جائے تو اماں بی نے اس نئے تجربے میں ناکامی کا منہ نہیں دیکھا تھا وہ شہر کی لڑکیوں کے رنگ ڈھنگ دیکھ چکی تھیں اسی لیے اک نیا تجربہ کرنا چاہتی تھیں۔ ان پڑھ اور اجڈ سی بھولا نے کی خواہش اماں بی کو بجوات لے آئی تھی اور میرے چہرے پر گنوار پن کی شاید اتنی گہری چھاپ تھی کہ اماں بی کو خبر نہ ہو سکی کہ میں کچھ تعلیم یافتہ بھی ہوں۔

میری تعلیم ان کے لیے اچھے خاصے دھچکے کا باعث بنی تھی وہ جس غرض اور مقصد کے تحت مجھے لے کر آئی تھیں میں نے ان کے اس مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ٹھان لی یعنی کہ بے غرض اور بے لوث خدمت کرتی رہی میں ان کی پسند کے سانچے میں ڈھل گئی۔

میرے لیے سب سے اہم اماں بی اور مہد کی ذات تھی اور میں ان کی خوشی کے لیے کچھ بھی کرسکتی تھی سو میں نے اپنے فرائض میں قطعاً کوتاہی نہیں کی۔

حالانکہ اس گھر میں آنے کے کچھ ہی عرصے بعد بڑی بھابھیوں نے میرے اندر شکوک وشبہات کو ہوا دینی چاہی تھی۔

''مہد تو نازنین سے شادی کرنا چاہتا تھا بڑا دھواں دھار عشق چلا تھا دونوں کے درمیان۔ مگر اماں بی کے مجبور کرنے پر اسے ماننا ہی پڑا''

مجھے مہد کے رویے سے ایک دن بھی کھوٹ اور بے ایمانی کی مہک نہیں آئی تھی۔ وہ خالصتاً میرا تھا اگر ان میں پہلے کوئی بات تھی بھی تو اب ختم ہو چکی تھی۔ مہد نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ بھابھیوں کی خواہش پوری نہیں ہو سکی تھی۔

''زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ ہمیں بھی معاشی مسائل سے گزرنا پڑا۔ مسلسل کوشش، جدوجہد اور انتھک محنت نے ہمیں کبھی کسی بھی مقام پر مایوس نہیں کیا تھا۔ مگر ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب اماں بی نے مہد پر دوسری شادی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔

''اس کم ذات اور غربت کی ماری کو دفعان کرو'' انہیں میرے خالی ہاتھ آنے کا بھی دکھ تھا۔ اماں بی نے مجھے بانجھ تک کے طعنے دے دیئے تھے مگر کون سی چیز تھی جو مہد کے قدم کسی بھی مقام پر ڈگمگانے نہیں دیتی تھی یہ وہ محبت تھی جو میری خدمتوں کے عوض مہد کے دل میں موجزن تھی یہ وہ یقین تھا جو اسے اپنی ماں کے خالص جذبوں پر تھا۔ خالص نیت پر تھا۔

وہ اکثر مجھے کہا کرتا تھا کہ ''اماں زبان کی کڑوی ہیں مگر دل کی بری نہیں ورنہ سہیل کے ایک معمولی خط کو پڑھنے کے بعد وہ اتنا بڑا فیصلہ نہ کر لیتیں''

میں خاموشی سے مسکراتی رہتی تھی میں خود بھی اماں کے جذبات کی قدر کرتی تھی۔ بارہ سال تک میں اسی قسم کی خوش فہمیوں کا شکار رہی تھی۔ پھر ایک دن چوچک بڑے سالوں بعد ملنے چلی آئی۔ اس نے مجھے کہا تھا۔

''باجی! آپ تو میرے سے ہر وقت خفا رہتی تھیں۔ آپ کو مجھ پر شک رہتا تھا کہ میں چوری وغیرہ کرتی ہوں مگر قسم سے باجی سوائے فلموں کی سی ڈیز کے میں نے اس گھر میں سے کچھ بھی نہیں چرایا۔ الماری میں سے شیمپو، صابن، سرف اور کھانے پینے والی چیزیں تو اوپر والے وقتاً فوقتاً چرا کر لے جاتے تھے سچی بتاؤں باجی! اماں بی کو بڑا ہی ارمان تھا، مہد بھائی جان کی کسی گاؤں کی لڑکی

سے شادی کرنے کا۔ انہوں نے میری اماں کو پورے دو ہزار روپے دیئے تھے اور کہا تھا کہ کسی سیدھی سادی، دبو سی لڑکی کا رشتہ لا دو۔ پھر بھلا ہو اس خط کا۔ اماں بی کی جھٹ پٹ خواہش پوری ہو گئی تھی۔

بڑی بہوؤں نے کبھی پوچھا تک نہیں اور آپ پر خواہ مخواہ کے رعب جھاڑتی ہیں۔ آپ جیسی بہو تو انہیں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتی مگر سچی بات ہے اسی کو ناشکرا پن کہتے ہیں'' میں نے چوچک کو ڈپٹ کر خاموش کروا دیا تھا حالانکہ میں اس کی ہر بات کی دل ہی دل میں قائل ہو چکی تھی۔ اماں بھی ایک مفاد پرست خاتون تھیں یہ تو میں جان ہی چکی تھی۔

ان سب کی خودغرضانہ سوچ آہستہ آہستہ مجھ پر کھل چکی تھی اسی لیے تو میں دھیرے دھیرے منہب، منیم اور ملت کے ساتھ ساتھ سونیا بھابھی سے بھی بدگمان ہو چکی تھی میں پہلے کی طرح ان کے لیے کھانے پینے کا اہتمام نہیں کرتی تھی وہ کافی دیر بیٹھی رہتیں اور میں اپنے کاموں میں مصروف یہ ظاہر کرتی کہ میرے پاس وقت نہیں ہے۔

انہیں مجھ سے بہت ہمدردی محسوس ہوتی تھی۔ اسی طرح منہب بھی ہر وقت مجھے بغاوت پر اکساتا رہتا تھا۔

مگر میرا ان سب رشتوں سے دل اچاٹ ہو رہا تھا شاید میرے اندر پکا یہ لاوا پھٹ ہی پڑتا جب شفق کے ساتھ وہ حادثہ پیش آ گیا۔

میں چھ ماہ تک ہوش وخرد سے بے گانہ رہی تھی چھ ماہ کے طویل عرصے بعد میرے نروس سسٹم میں تبدیلی رونما ہونا شروع ہوئی میں نے چہروں کو پہچاننا، تھوڑا تھوڑا بولنا بھی شروع کر دیا تھا مگر اس دوران میں بہت کچھ طے کر چکی تھی۔

مجھے کبھی بھی مہد کی محبت پر شک نہیں ہوا تھا مگر میں ان خودغرض رشتوں کو پرکھنا چاہتی تھی۔ میری یہ ''پرکھ'' بہت سے رشتوں کو محبت سے دور کرتی چلی گئی۔

اول تو میری تائی جی تھیں۔ جنہوں نے بچپن میں مجھے گود لے لیا تھا میرے باپ کے مرنے کے بعد دوسری جگہ میری ماں کا نکاح پڑھا کر قانونی طور پر میرے باپ کے حصے کی تمام زمینیں اپنے نام کروانے کے بعد بیچ باچ کر وہ لوگ واہ کینٹ شفٹ ہو گئے تھے ابا کا مکان اور جانوروں میں تین عدد بھینسیں بھی انہوں نے بیچ دی تھیں تائی کو اپنے بھانجے سے بہت محبت تھی۔ سو اس کا مستقبل انہوں نے ہر طرح سے محفوظ کر کے پہلے بھانجے کو باہر سیٹل کیا پھر خود بھی چلی گئیں میری بیماری کا سن کر انہوں نے بھی مہنگائی کا رونا رو کر آنکھیں بدل لی تھیں۔

پھر مہد کے یہ رشتے تھے اس کے بہت اپنے اس کے بہت خاص اور پیارے رشتے مہد کی ماں، اس کے یتیم بھتیجے بھتیجیاں، جنہیں میں نے اپنی اولاد کی طرح محبت دی تھی اپنی اندر ممتا کی اس کمی کو میں نے ملت اور مانیہ کے وجود سے پورا کرنے کی کوشش کی تھی۔

آٹھ سال کے اس ساتھ کو منہب نے توڑ دیا تھا وہ باہر چلا گیا ملت اور منیم بھی چلے گئے ان دنوں مشکلات کا بڑا کٹھن دور تھا مگر مہد کی خودداری کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ اپنی زبان سے سوال کرتا۔ کسی سے مدد مانگتا۔

انہوں نے تو جانا ہی تھا کہ اچھے مستقبل کی خواہش ہر ایک کی آنکھ کا خواب ہوتی ہے اصل صدمہ تو مجھے مانیہ کی ان باتوں سے ہوا تھا جب کراچی سے واپس آنے کے بعد وہ نادیہ بھابھی کے پورشن میں بیٹھی زور و شور سے میری ذات کے بخیے ادھیڑ رہی تھی۔ اس پل اسے بھول چکا تھا کہ اس کی شادی پر لیا جانے والا قرض کس طرح میں نے اور مہد نے رات دن کی پروانہ کرتے ہوئے انتھک محنت کر کے اتارا تھا۔

''کالی بھجنگ'' ذرا بھی تو چاچو کے ساتھ سوٹ نہیں کرتیں۔ چاچو کے تو نصیب ہی پھوٹ گئے ہیں نازنین آنٹی کس قدر حسین ہیں۔ چاچوں کے ساتھ تو انہی کا جوڑ بنتا تھا'' مانیہ میجر سے کرنل کی بیوی بن کر بڑی مغرور ہو چکی تھی۔ ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں اور چہرے پر خوشحالی کی چمک لیے وہ بڑے تفاخر سے بیٹھی تھی میرے سینے میں اسی دن سے توڑ پھوڑ ہونے لگی۔

ایک دیوار تھی جو گر چکی تھی ان بچوں کو ''پرکھنے'' میں بھی مجھ سے غلطی ہوئی تھی اور اس غلطی کا خمیازہ کل کی اس بچی کے ہاتھوں توہین کی صورت میں میرے حصے میں آیا تھا میرا خلوص، محبت اور وہ رات دن ان کی فکر میں ہلکان ہونا۔ یوں لگ رہا تھا زندگی بھر میں کسی سے خلوص اور ''چاہ'' کا رشتہ نہ نبھا سکوں گی۔

شفق کو لگنے والی چوٹ تو ایک بہانہ تھی۔ میں نے ستائیس سیڑھیوں سے گرنا ہی تھا میری آنکھیں اسی طرح کھلنا تھیں مجھے اس طرح ''ٹھوکر'' لگنی تھی۔

رشتوں سے محبتوں سے میرا اعتبار اسی وقت اٹھ گیا تھا۔ جب چھ ماہ بعد میں نے پہلی مرتبہ آنکھیں کھول کر زندگی کو محسوس کرنا چاہا تھا وہ دو نرسیں تھیں جن کی نائٹ ڈیوٹی میرے کمرے میں تھی وہ دونوں ساری رات باتیں کرتی رہی تھیں۔ موضوع گفتگو مہد کی پرسنالٹی اور میری ذات تھی وہ مہد کو سراہ رہی تھیں اس کی تعریف کر رہی تھیں کہ کس طرح وہ مجھ جیسی بیوی کے لیے خوار

ہو رہا ہے پھر انہوں نے اچانک موضوع بدل دیا میں نے آنکھیں جان بوجھ کر موند لی تھیں تا کہ انہیں احساس نہ ہو کہ میں ہوش میں آ چکی ہوں۔

مجھے محسوس ہوا کہ کمرے میں کوئی اور بھی موجود ہے۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ پھر دو خواتین آپس میں بات چیت کرنے لگی۔ یہ دونوں نادیہ بھابھی اور بسمہ تھیں۔ نرسیں شاید کمرے سے جا چکی تھیں۔ تبھی یہ دونوں مطمئن سی باتیں کرنے لگیں۔

''اب مہد کو دکھانے کے لیے دن میں ایک مرتبہ تو ضرور ہی آنا پڑتا ہے'' یہ نادیہ.

بھابھی تھیں۔

''تو اور کیا دنیا داری کے تقاضے پورے کرنے کہاں آسان ہیں'' بسمہ بے زاری سے بولی۔

''نہ جانے یہ ٹھیک ہوتی بھی ہے کہ نہیں۔ ڈاکٹر نے تو دماغ کا آپریشن بتایا ہے یہ کام تو بڑا رسکی ہے میری کزن تو دوران آپریشن ہی مرگئی تھی'' نادیہ بھابھی نے مصنوعی آہ بھر کے کہا یہ وہ ہی مطلبی عورت تھی جو کام کروانے کی غرض سے ہر وقت میری خوشامد کے لیے تیار رہتی۔

''اس کے بھی بچنے کے چانسز کم کم ہی نظر آتے ہیں'' بسمہ نے لمبی سی جمائی لی۔

''رات کو مہد کچھ پیسے مانگ رہا تھا۔ میں نے تو صاف صاف جتا دیا ہے اتنے اخراجات ہیں اوپر سے بڑھتی ہوئی مہنگائی۔ ہمارے پاس کون سا خزانے دفن ہیں''

''سونیا نے تین لاکھ کا چیک دیا'' بسمہ کو اچانک خیال آیا تو پوچھنے لگی۔

''اونہہ۔ نری شو بازی'' نادیہ بھابھی نے تنفر سے کہا کہ کسی کی اچھائی ان کے نزدیک شو بازی تھی۔

''ویسے اماں بی تو مہد کے لیے نئی دلہن لانے کے چکروں میں ہیں'' بسمہ معنی خیزی سے بولی۔

''اس بڑھیا کی ملشہ سے زیادہ خدمت کوئی کر سکے گا۔ نجانے مائی کے دماغ میں کیا خناس بھرا ہے'' نادیہ بھابھی کے لہجے میں کڑواہٹ تھی۔ (بس اتنی سی عزت تھی اماں بی کی ان کی بہوؤں کے دلوں میں)

''ایک لحاظ سے تو بہتر ہی ہے اب ملشہ تو نجانے کب ٹھیک ہوگی۔ اماں بی جیسی نکتہ چیں عورت ہمارے تمہارے بس میں کہاں ہے کہ انہیں دو چار دن ساتھ رکھ لیا جائے۔ کھانے میں اعتراض، پہننے اوڑھنے میں اعتراض'' بسمہ تلخی سے کہنے لگی۔ ''خبطی بڑھیا'' وہ بڑبڑائی۔

''ہوں، بات تو تمہاری دل کو لگتی ہے پھر نازنین ہی مہد کی دلہن بن کر آئے گی بے چاری ابھی تک کنواری بیٹھی ہے ملشہ کے مرنے کا انتظار کر رہی ہے''

نادیہ کی تمسخرانہ ہنسی گونجی۔ ڈاکٹر کی آمد کے ساتھ ہی وہ دونوں اٹھ کر چلی گئی تھیں اور میں نے بھی گہری سانس کھینچ کر آنکھیں کھول لیں۔ ڈاکٹر یاسر حیران رہ گئے تھے پھر میں نے نجانے کیسے انہیں قائل کیا تھا بہر حال وہ میرے ڈرامے میں شریک ہو گئے۔ اگلے تین مہینے تک ''محبوب منزل'' والوں کا امتحان شروع ہو چکا تھا۔

میں نے ان سب کو ناکوں چنے چبانے کی پلاننگ کر رکھی تھی۔ میرا منصوبہ ابھی تک کامیاب تھا اور اس خود ساختہ پاگل پن کی لپیٹ میں میری پیاری بیٹی شفق بھی آ چکی تھی۔

دراصل میں انہیں شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی سو ان سب کو ذہنی طور پر ڈسٹرب کر کے میں مطمئن تھی۔ ان خود غرضوں کے لیے اس سے بڑی سزا میرے اختیار میں نہیں تھی مگر پھر اس چلچلاتی دوپہر میں مجھے مہد پر ڈھیروں پیار کے ساتھ ساتھ کچھ ترس بھی آ گیا۔

وہ تھکا ہارا نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتے گھر آیا تھا اور آتے ہی میرے دورے کی خبر نے اسے اور بھی مرجھا کر رکھ دیا تھا پھر ننھی شفق کے بال بناتے، اس کو کھانا کھلاتے دیکھ کر میرے دل میں مہد کے لیے عقیدت، محبت اور چاہتوں کا طوفان امڈ آیا تھا۔ سو مزید ایکٹنگ ممکن ہی کہاں تھی اسی لیے میں دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کے قریب دوزانوں کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

''مہد! آئی لو یو'' میرے ہاتھ اس کے ہاتھوں پر تھے۔

''ملشہ! تم، تم، ٹھیک ہو تم نے مجھے پہچان لیا ہے۔ یہ بتاؤ یہ کون ہے؟'' مہد نے خوشی سے چور آواز میں کہتے ہوئے شفق کو میرے سامنے کیا۔

''میری بیٹی'' محبت کے اس مظاہرے پر میری آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔

''آئی لو یو ٹو، تھری، فور'' مہدی نے بے ساختہ مجھے بانہوں کے حصار میں لے لیا۔

''میری ماما ٹھیک ہو گئی ہیں'' شفق قلانچیں بھرتی باہر کی طرف بھاگی تھی اسی اثناء میں پورے گھر کے لوگ ہمارے کمرے میں جمع ہو گئے تھے سب حیران تھے۔ ششدر تھے۔ گویا انہیں میرے تندرست ہونے کی قطعاً امید نہیں تھی۔

میری صحت مندی کی خوشی میں مہد نے ایک بہت بڑی ضیافت کا اہتمام کیا تھا اس دعوت میں نازنین اور مامی نے بھی شرکت کی تھی۔ سب سے بڑا سرپرائز منہب، ملت اور منیم کی

آمد کی صورت میں ملا تھا منہب ہمارے لیے بحرین کے ویزے لایا تھا بقول منہب کے کہ وہ لوگ مہد چاچو کی فیملی کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

ڈاکٹر یاسر کو میں نے بطور خاص انوائٹ کیا تھا۔ بہر حال میں ان کی شکر گزار تھی کہ رشتوں کو جانچنے، پرکھنے میں انہوں نے میرا بہت ساتھ دیا تھا۔

نازنین، مہد سے جھگڑ رہی تھی کہ اس نے میرے ساتھ ہونے والے حادثے کی خبر اسے کیوں نہیں دی ادھر منہب بھی اسی بات پر روٹھا بیٹھا تھا شفق، ملت کی گود میں خوب چہک رہی تھی ''آپ نے ہمیں بھی ان لوگوں جیسا سمجھ رکھا تھا'' منہب ناراضی سے کہہ رہا تھا اوپر والی ساری بھابھیاں بمعہ فیملیز کے نیچے موجود تھیں مگر اب میں ان کے ظاہر باطن کو اچھی طرح سے جان چکی تھی تبھی ان کے اور اپنے درمیان میں اک خاصی ''حد'' مقرر کر لی تھی۔ اماں بی بھی شرمندہ شرمندہ سی بڑی بہوؤں کے درمیان بیٹھی تھیں۔ انہیں اب اپنی انہی بہوؤں کے درمیان ہمیشہ رہنا تھا کیونکہ مہد نے منہب کی آفر کو قبول کر کے بحرین جانے کا فیصلہ کر لیا تھا تین دن بعد ہماری فلائٹ تھی اور اماں بی کی کھسیانی سی مسکراہٹ دراصل میں ان مسکراہٹوں کے مفہوم کو بھی جان گئی ہوں ہر ایک مسکراہٹ واقعی ''مسکان'' نہیں ہوتی بعض مسکراہٹیں غرض اور مطلب کے لبادوں میں لپٹی ہوتی ہیں جیسا کہ بھابھیوں اور اماں بی کی التجا کرتی مسکان ان سب کی خواہش تھی کہ میں رک جاؤں۔ بحرین جانے کے فیصلے کو بدل دوں مگر میں ان سب مطلبی، خوشامدی اور خود غرض لوگوں میں رہنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

ادھر ڈاکٹر یاسر مامی کے پاس کھڑے تھے اور نازنین کے ساتھ کے لیے التجا کر رہے تھے بے چارے کیوپڈ کے تیر کا شکار ہو گئے تھے مہد کی سفارش اور میری درخواست پر ثریا مامی نے غور کرنے کے بارے میں فیصلہ کر لیا تھا۔

جاتے جاتے انہوں نے نازنین اور ڈاکٹر یاسر کی منگنی کا دھماکہ کر دیا۔

ایک اور بات میں نے مہد کو اس خود ساختہ دیوانگی کے متعلق نہیں بتایا کچھ باتیں مصلحتاً چھپانی پڑتی ہیں امید ہے آپ بھی اس راز کو لیک آؤٹ نہیں کریں گے اپنی شادی شدہ زندگی کو بچانے کے لیے مجھے بہت سے کٹھنائیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ جیت ہمیشہ سچائی، خلوص اور خالص جذبوں کی ہوتی ہے خالص رشتوں کو کھو کر صرف ملال باقی رہ جاتا ہے ایسا ہی ملال اماں بی کے چہرے پر کھنڈا مجھے صاف دکھائی دے رہا ہے ان کے پوتوں اور بہوؤں کے پاس ان کے لیے چند پل بھی نہیں ہیں۔ انہیں مزید احساس دلانے کے لیے میرا یہاں سے جانا ضروری ہے۔

سسرال الجبرے کے کسی مشکل ترین اور پیچیدہ سوال کی مانند ہے اسے معاملہ فہمی، ذہانت اور عقلمندی سے بہتر طریقے سے حل کیا جا سکتا ہے۔ اور میتھ تو میرا فیورٹ سجیکٹ تھا خیر میں بھی کن فضول سوچوں میں الجھ رہی ہوں۔ ابھی مجھے سب کے لیے گرین ٹی بنانا ہے۔ پھر اپنی اور منہب لوگوں کی شاپنگ کرنی ہے۔ وہاں اس کا ایک پیارا سا بیٹا ہے۔ اس کے لیے کرتے اور شلواریں لینی ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے موبی کے لیے سویٹر بننے ہیں۔ قمیضوں پر کڑھائی کرنی ہے اور بھی بہت سے کام ہیں۔ ملت کے لیے کھجور کا حلوہ بنانا ہے۔ منیم کے لیے برفی منگوانی ہے اور اماں بی کو سوپ بنا کر دینا ہے۔ جب تک یہاں ہوں ان کی خدمت میرا فرض ہے۔ پھر میں اپنی اس بارہ سالہ پرانی پختہ ہو چکی عادت کا کیا کروں۔ اور ادھر شفق میرے ڈوپٹے کا پلو تھام کر ''بھائی چاہیئے'' کی گردان کر رہی ہے اسے بھائی کا ''لارا'' لگا کر بحرین لے کر جانا ہے۔ جہاں سچ مچ اس کے لیے ایک عدد گورا چٹا بھائی موجود ہے اور ادھر مہد بیڈ روم میں کھڑے آوازیں دے رہے ہیں اور میں اک نئی ترنگ اور نئے ولولے کے ساتھ اپنے بیڈ روم کی طرف جا رہی ہوں۔

مہد کو شدید نیند آ رہی ہوگی اور بقول اماں بی کے انہیں میرے بغیر نیند بھلا کیسے آئے گی۔ اماں بی نے اپنے ''مفاد'' کو مدنظر رکھ کر اپنی سہیلی سے کیے گئے وعدے کو نبھایا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میں ان کی توقعات پر پورا اترنے کے متعلق ٹھان چکی تھی۔ انہیں کھرے اور کھوٹے کی پہچان نہیں تھی۔ افسوس اس بات کا نہیں تھا کہ اماں بی نے میرے ساتھ کبھی بھی اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ دکھ صرف یہ تھا کہ انہوں نے مجھے چوچک جتنی اہمیت بھی نہیں دی تھی۔ وہ مجھے مہد کی بیوی نہیں اس گھر کے لیے اور اپنی بہوؤں کے لیے ''باندی'' بنا کر لائی تھیں جو کہ ان کی اور ان کی بہوؤں کی خدمت میں چوبیس گھنٹے جتی رہتی۔ اگر وہ انصاف سے کام لیتیں تو ہمارے کچن بھی الگ کر سکتی تھیں۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ ان کے لاشعور میں ایک بات ہمیشہ زندہ رہی تھی کہ میں ان کے بیٹے کی جوڑ کی نہیں ہوں اور جوان کے بیٹوں کی جوڑ کی تھیں آج وہ اماں بی کے پاس دو گھڑی ٹھہر کر حال احوال پوچھنے کی زحمت گوارا بھی نہیں کرتی تھیں۔

سونیا بھابھی نے ٹھیک کہا تھا کہ امابی ''بدنیت'' ہیں اور نیت جب تک خالص نہ ہو کبھی بھی ''مراد'' نہیں پوری ہوتی۔ رنگ، نسل، ذات پات پر ''تقویٰ'' کو فوقیت اسی لیے دی گئی ہے تاکہ ثابت قدم رہیں ہم۔ ظاہری چمک دمک پر فریفتہ نہ ہوں اور وہ اماں بی جیسے بدنصیب لوگ ہوتے ہیں جو ہاتھ آئی نعمتوں کی قدر نہیں کرتے اور پھر ملال اور پچھتاوے کے گرداب میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

دوسرا پہر

قائداعظم سٹریٹ ! یکم جنوری۔

آج صبح سے موسم ابر آلود تھا...... مغرب کی طرف سے کالی گھٹائیں اُمڈ اُمڈ کر آ رہی تھیں۔ مگر دور دور تک بارش کا کوئی امکان نہیں تھا بادل جھلک دکھلا کر کسی اور سمت نکل جاتے تھے بادلوں کی آنکھ مچولی نے کئی دنوں کے جمع شدہ کاموں کی فہرست میں اضافہ کر دیا تھا۔

بل وغیرہ جمع کروا کے اس نے لگے ہاتھوں یوٹیلٹی اسٹور سے کچن کا راشن بھی خرید لیا تھا۔

''ساشی!'' نوش نہ جانے کس دوکان میں گھسی تھی اور نجانے کب اس کی ساشا پر نظر پڑی تھی دوسرے ہی پل وہ لدی پھندی اس کے سامنے تھی۔

''تم'' ساشی کو رکنا ہی پڑا۔

''آنا تھا تو کم از کم بتا کر آتیں...... میں تنہا ماری ماری پھر رہی ہوں اور اوپر سے یہ بھاری بھرکم شاپر'' نوشی ہانپ ہانپ گئی اور کمال پھرتی سے اپنے ہاتھوں اور کندھوں کا بوجھ اس پر لاد کر گہرے گہرے سانس لینے لگی تب ہی رکشہ والا قریب آ کر رکا تھا۔

''میرا شاپر کہاں ہے۔ کم از کم اسے ہی پکڑ لو'' وہ شاپروں اور تھیلوں کی پہاڑی میں دب چکی تھی۔

''وہ میں نے رکشے والے کے پاس رکھوا دیا ہے۔ ذرا سر اونچا کر کے دیکھو'' نوشی نے کمال اطمینان سے کہا۔

''کس قدر منحوس گھڑی تھی جب تمہاری نظر مجھ پر پڑی''

ان دونوں کے گھر ایک ہی لین میں ایک ہی کالونی میں تھے نوشی کی فیملی تو پچھلے تیس

سالوں سے یہاں قیام پذیر تھی تاہم ساشا اور اس کی امی حال ہی میں یہاں شفٹ ہوئے تھے عارضی طور پر قیام کی وجہ ان کا زیر تعمیر گھر تھا۔ جسے بھیا اب نہ صرف مکمل کروانے بلکہ فرنشڈ کروانے پر بہت اصرار کر رہے تھے اور ان ہی کے اصرار پر امی کرائے کے مکان میں رہنے کے لیے رضا مند ہوئی تھیں۔ گھر کی تعمیر زور و شور سے جاری تھی۔ بھیا اپنی نگرانی میں کام کروا رہے تھے۔

مسئلہ تھا تو کسی اچھے علاقہ میں گھر لینے کا تھا اور یہ مسئلہ چٹکیوں میں بھیا کی سسرالی فیملی نے حل کر دیا تھا یعنی نوشی کی فیملی نے۔ اپنے گھر کے کچھ فاصلے پر کسی چودھری حیات سرور کی کوٹھی کرائے پر لے دی۔ امی اور بھیا کو انیکسی پسند آگئی تھی۔ سامان وغیرہ بھی شفٹ کر دیا تھا مگر جب ساشا نے گھر میں قدم رنجہ فرمایا اور نوشی کے ہمراہ اردگرد کا جائزہ لیا تو اسے کم از کم اردگرد کی لوکیشن ہرگز نہیں بھائی تھی۔ وجہ صرف یہ تھی۔

ان کے گھر سے صرف چار قدم کے فاصلے پر چوہدریوں کا خاندانی قبرستان تھا اردگرد تین پلاٹ خالی تھے پھر بیگ صاحب کا گھر تھا اور اس سے آگے نوشی کا گھر۔ گلی کے آخری کونے میں یہ اداس ویران کوٹھی اور اس سے چار قدموں کے فاصلے پر شہر خموشاں۔ جس کی چار دیواری خاصی بلند تھی۔ لوہے کا پھاٹک بھی موجود تھا مگر ٹیرس پر کھڑے ہوں یا گیٹ سے باہر، قبرستان ہمیشہ نظروں کے سامنے رہتا تھا شہر خموشاں میں تیرہ یا چودہ قبریں تھیں اور یہ قبریں صرف ان کے آباؤ اجداد کی تھیں۔

مسئلہ یہ ہی نہیں تھا کہ قبرستان کوٹھی کے قریب کیوں ہے اصل پرابلم تو یہ تھی کہ شہر خموشاں میں موجود ایک کونے میں تازہ تازہ بنائی گئی دو قبریں۔ ان دو قبروں کے سرہانے کی طرف سیمنٹ سے بنایا گیا دل۔ جس کے عین وسط میں جلی حروف میں لکھا تھا ''مسز قائلہ توصیف، چودھری توصیف احمد'' یہ ان دونوں کی آخری آرام گاہ تھی ان کے حوالے سے جو داستان سامنے آئی تھی اسے سن کر ساشا کا دل ہل کر رہ گیا تھا۔

اس کے لیے غیر ارادتاً بھی ان دو قبروں کی طرف دیکھنا کسی امتحان سے کم نہیں تھا مگر پھر بھی ان دو قبروں کو دیکھنا اس کا معمول بن گیا تھا وہ اکثر ان قبروں پر جاتی۔ ان کی مغفرت اور بخشش کے لیے دعا کرتی دو محبت کرنے والوں کی المناک موت نے اسے بے حد متاثر کیا تھا۔

''بی بی! گھر کا پتا بتاؤ'' رکشے والے کی کھردری آواز اسے سوچوں کے سمندر سے کھینچ لائی۔ نوشی فر فر پتہ سمجھانے لگی تھی کہ رکشے والے نے بات کاٹ کر کہا۔

''یوں بولو نا۔ حیات کالونی جانا ہے''

''جی ہاں'' نوشی نے جھٹ اثبات میں سر ہلایا۔ وہ علاقہ حیات کالونی کے نام سے ہی مشہور تھا۔

رکشہ پہلے نوشی کے مکان کے سامنے رک گیا تھا۔ وہ سامان سمیٹ کر اتری۔

''تم بھی آجاؤ نا'' نوشی اصرار کر رہی تھی۔

''رات کو بھیا کے ساتھ آؤں گی۔ ابھی امی انتظار کر رہی ہوں گی'' اس نے رکشے والے کو آگے چلنے کے لیے کہا تھا ایک منٹ بعد رکشہ پھر سے رک گیا رکشے والے نے کرایہ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

''یہ کوٹھی آپ نے خرید لی ہے؟''

''نہیں کرائے دار ہیں...... کوٹھی کا ایک حصہ کرائے پر لیا ہے'' نجانے کیوں اس نے بغیر جان پہچان کے بتا دیا تھا۔

''چودھری صاحب کی بیگم زندہ ہیں یا چل بسیں؟''

رکشے والے کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں اور وہ قبرستان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''ان ہی نے انیکسی کرائے پر دی ہے اس نے شاپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ رکشہ والا متاسف سی آواز میں بولا۔

''بڑا صدمہ دیکھا تھا چودھری صاحب نے، صرف دو ہفتے ہی جی پائے تھے خود بھی اس قبرستان کا حصہ بن گئے...... زندگی میں ان کے لیے بچا ہی کیا تھا بڑے خدا ترس انسان تھے ان کی تو نسل ہی ختم ہو گئی''

''آپ جانتے ہیں چودھری حیات سرور کو؟'' وہ بلا ارادہ ہی پوچھ بیٹھی۔

''انہیں کون نہیں جانتا اخباروں میں کئی دن تک خبریں لگتی رہی تھیں۔ بڑے نیک آدمی تھے ان کے بیٹے اور بہو کی ناگہانی موت نے شہر بھر کو رلا دیا تھا۔ نجانے کہاں کہاں سے لوگ توصیف احمد کا آخری دیدار کرنے آئے تھے کرکٹ کے دیوانے تھے کالج کی طرف سے کھیلا کرتے تھے چودھری صاحب کے اکلوتے چشم و چراغ...... رج رج کے سوہنے۔ یوں لگتا تھا، رب رحیم نے بڑے پیار سے اس کا ایک ایک نقش سنوارا ہے اتنا گھبرو جوان، اتنا قابل، مٹی کی ڈھیری کے نیچے سو رہا ہے۔''

وہ ادھیڑ عمر آدمی کہہ رہا تھا اور ساشا کھڑی اس آدمی کی سرخ آنکھوں سے بہنے والے

آنسوؤں کو دیکھ رہی تھی۔

''آپ نے بہت قریب سے دیکھا ہے توصیف احمد کو؟''

''ان ہاتھوں نے اسے پروان چڑھایا تھا یہ ہاتھ باؤلنگ کروایا کرتے تھے میں اس کیساتھ کھیلا کرتا تھا فٹ بال، کرکٹ...... اسے سکول چھوڑ کر آتا...... لے کر آتا...... جاتا...... لطیفے سناتا، ہنستا...... اور وہ ہنستے ہنستے تھم جاتا، رک جاتا اور کہتا'' مجھے آپ مت بولا کریں بابا! آپ بڑے ہیں' آپ کا احترام میرا فرض ہے'' اتنی میٹھی باتیں کرتا کہ جی چاہتا، بولتا رہے۔ میں سنتا رہوں میں چودھری صاحب کا باورچی بھی تھا۔ ڈرائیور بھی تھا، ضرورت کے وقت گیٹ کیپر بھی بن جاتا'' اب وہ بوڑھا آدمی آنسو پونچھ رہا تھا۔

''چودھری صاحب اور ان کے بیٹے کے مرنے کے بعد میرا دل اچاٹ ہو گیا۔ میں یہاں سے چلا گیا مگر اب بھی یہاں آتا رہتا ہوں کبھی فاتحہ پڑھنے، کبھی کسی سواری کو لے کر۔ آپ دونوں کو باتیں کرتا سن کر میں خود آپ کے قریب چلا آیا تھا۔ اس کالونی سے بڑی یادیں وابستہ ہیں میری''

وہ آدمی اب قبرستان کے پھاٹک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ رکشہ اسی جگہ کھڑا تھا۔ جبکہ ساشا علیم دم بخود کھڑی تھی۔

علیم قریشی محکمہ تعلیم میں ذمہ دار پوسٹ پر فائز تھے۔ ساری زندگی رزق حلال کمایا تھا عمر بھر کی پونجی ایک واحد مکان تھا اچھے وقتوں میں زمین خرید کر گھر تعمیر کروالیا تھا جو بعد میں ان کی بیوہ اور یتیم بچوں کے کام آیا۔ سر چھپانے کے لیے ٹھکانہ تو تھا ہی۔ روزینہ بیگم نے ایک اسکول میں نوکری کر کے گھر کی گاڑی کو گھسیٹ گھسیٹ کر بالآخر چلا ہی لیا۔

کنبہ مختصر تھا ایک بیٹا حسیب اور اس سے چھوٹی ساشا بچوں کی تعلیم و تربیت پر انہوں نے خصوصی توجہ دی تھی حسیب نیک طینت اور ذہین نوجوان تھا' ایک کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھا آفس کی طرف سے اسے کافی سہولیات ملی تھیں سیونگ کی رقم کو اس نے محفوظ کر رکھا تھا جو گھر کی تعمیر کے کام آرہی تھی اور کچھ ساشا کی شادی کے لیے بینک میں محفوظ تھی۔

بیوگی کے بعد روزینہ بیگم کو نوشی کی والدہ نے بہت سہارا دیا تھا ان کی محبتوں اور خلوص کی بدولت ان کا بہت اچھا وقت گزرا تھا اب جبکہ حالات سنورنے پر آئے تھے تو روزینہ بیگم نے حسیب کے لیے سب سے پہلے نوشی کو ترجیح دی۔

وہ برے وقت کی سہیلی، کزن اور غم گسار ساتھی ریحانہ بیگم کے دل میں چھپی خواہش کو

جانتی تھیں کہ ریحانہ بیگم حسیب کو اپنا داماد بنانا چاہتی ہیں۔

ساشا بے حد حساس طبیعت رکھتی تھی یہاں دونوں قبریں دیکھیں پھر حیات سرور کی زوجہ نیر حیات سے ملنے کے بعد اور نوشی کی زبانی قائلہ اور توصیف کی داستان سن کر تو وہ بہت متجسس ہو گئی تھی۔

وہ اس کہانی کے تیسرے کردار سے بھی ملنا چاہتی تھی اسے دیکھنا چاہتی تھی اور اس تیسرے کردار تک پہنچنا اسی وقت ممکن تھا جب وہ نیر حیات کو اچھی طرح سے جان لیتی، سمجھ لیتی۔

نیر حیات کون تھیں؟ حیات سرور کی بیوہ، توصیف احمد کی ماں، قائلہ توصیف کی خالہ اور اس تیسرے کردار سے ان کا کیا رشتہ تھا۔

نیر حیات، اپنے خول میں بند ایک خاموش، گم صم، اداس چلتی پھرتی لاش تھیں۔ ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا۔ شہر خموشاں میں چراغاں کرنا، دیے جلانا، قرآن خوانی کرنا۔

ساشا کا خیال تھا کہ جس غم کے فیز سے وہ گزر رہی ہیں۔ یا پھر جس طرح اردگرد کے لوگ ان کی خاموشی اور تنہائی کے متعلق مختلف تبصرے کرتے تھے ساشا کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ ان کے ساتھ اس قدر مہمان نوازی سے پیش آئیں گی تین دن تک ناشتہ، کھانا وہ اپنے ہاتھوں سے بنا کر بھیجتی رہی تھیں اس کے علاوہ وہ امی سے بھی خود ملنے کے لیے آتی تھیں۔ وہ بہت کم گو اور سنجیدہ مزاج تھیں ساشا نے بہت کم انہیں مسکراتے دیکھا تھا اور صرف کچھ ہی دنوں میں وہ ان کے اتنا قریب آچکی تھی۔

وہ جاننا چاہتی تھی کہ توصیف اور قائلہ کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا۔

وہ اس بند داستان کے حرف حرف سے آگاہ ہونا چاہتی تھی یہ جانے بغیر اس بات سے بے خبر کہ وہ اس داستان کا حصہ بننے جا رہی ہے۔ شاید ہمیشہ کے لیے

دو جنوری!

''امی آج کوٹھی کی واحد مکین نیر حیات سے ملنے چلی گئی تھیں۔ وہ چپکے سے نوشی کی طرف آ گئی۔ نوشی اپنے ہمیشہ والے مشغلے میں مصروف تھی یعنی فون کان سے لگا تھا اور اس کی کتر کتر زبان چل رہی تھی۔

''کس سے بات کر رہی ہو؟'' ساشا نے چھوٹتے ہی پوچھا تھا۔

''جانتی تو ہو'' وہ آنکھ دبا کر بولی۔

''بے شرم! ہر وقت میرے بھائی کے کان کھاتی رہتی ہو'' ساشا نے اسے لتاڑا۔

''مائینڈ اٹ! تمہارا بھائی میرے کان کھاتا ہے'' اس نے جلدی جلدی گفتگو کو سمیٹا تھا

''پکی نند ہو...... غلط موقع پر انٹری دی ہے''

''واپس چلی جاتی ہوں'' ساشا بھنائی اور دھپ سے صوفے میں دھنس گئی۔

''اونہہ...... جانے دوں گی بھلا۔ یہ بتاؤ، آنٹی کہاں ہیں'' وہ قالین پر پھسکڑا مارے بیٹھ گئی۔

''نیر آنٹی کی طرف گئی تھیں'' اس نے کارنر ٹیبل سے نوشی کا فائکرا اٹھالیا۔

''اچھا...... اچھا'' نوشی نے سر ہلایا ''نیر آنٹی کہاں آتی جاتی ہیں۔ جب سے ان کے ساتھ حادثہ ہوا ہے۔ اپنی ذات میں قید ہو کر رہ گئی ہیں''

''تمہاری تیاریاں ٹھپ کر دی ہیں۔ یہ سراسر تمہارے بھائی کا قصور ہے۔ عین ڈیٹ فکس کے دنوں میں مکان کی از سر نو تعمیر کا بھوت سوار کر لیا ہے سر پر'' نوشی سخت جلی بیٹھی تھی۔

''بہت بے چینی ہے۔ ہمارے گھر میں آنے کی'' اس نے نوشی کو چھیڑا۔

''تو اور کیا'' نوشی نے بھنا کر کہا ''ساری شاپنگ کا مزہ کرکرا ہو کر رہ گیا ہے'' اسے ڈبوں میں بند کپڑے دیکھ دیکھ کر تاؤ آتا تھا۔

''اور تمہیں شاپنگ کا زیادہ ہی شوق ہے۔

''سچ کہہ رہی ہو...... میرا بس چلے تو شاپنگ کے علاوہ کوئی تیسرا کام کبھی نہ کروں''

''میرے بھائی کی جیب کا تو کباڑا کر دو گی'' وہ غم زدہ سی ہو کر بولی ''بھیا تو مقروض ہو کر رہ جائیں گے''

''ہم حکمرانوں کی طرح پیر پکڑ کر قرض معاف کروالیں گے'' نوشی شان بے نیازی سے بولی۔

''تمہاری بک بک تو چلتی رہے گی ایک کپ چائے تو بنا کر لاؤ''

''وہ سامنے کچن ہے پتی اور چینی بھی سامنے ہی رکھی ہے۔ ذرا ہمت پکڑو ایک کپ کے بجائے دو کپ بنالاؤ'' نوشی نے کمال سستی سے پیر پسارے۔

''بڑی ہی کمینی چیز ہو تم نوشی! کم از کم ہونے والی نند کا ہی خیال کر لو''

''تمہیں آج پتا چلا ہے''

''جانتی تو ہوں مگر ہر دفعہ دھوکا کھا جاتی ہوں'' اس نے کھا جانے والی نظروں سے

اکلوتی دوست پلس بھابھی کو دیکھا۔

''چائے بنانی ہے نہاری پکانے کے لیے تو نہیں کہہ دیا اتنا سا کام نہیں کر سکتیں''

''اتنا کام تم ہی کر لو ہڈ حرام، کام چور، اناج کی دشمن'' وہ پھنکاری۔

''بڑی بھابھی ہوں تمہاری، ہائے اللہ! ایسے القابات۔ اتنی ہی عزت ہے تمہاری نظر میں میری'' نوش نے جھوٹ موٹ کے آنسو پونچھے۔

''زیادہ ہوشیاری مت دکھاؤ'' اس نے وارننگ دی ''اٹھتی ہو یا لگاؤں دو ہاتھ''

''مجھ مریض کو اٹھا کر تمہیں کیا ملے گا'' اس نے مسکینی سے کہا۔

''ایک گرما گرم کپ چائے کا'' اس نے گویا خوب ہی لطف لیا ''میں تم سے گن گن کر بدلے لوں گی'' نوشی نے اسے دھمکایا۔

''یعنی بھابھی بن کر'' اس نے تصدیق چاہی۔

''ہاں'' نوشی نے شد و مد سے سر ہلایا۔

''میں بھی پکی نند بن جاؤں گی۔ پھر کیا کرو گی تم؟''

''تمہارے بھائی کو لے کر الگ ہو جاؤں گی''

''نوشی! تیرے ارادے خاصے خطرناک ہیں۔ میں اپنا ارادہ بدل لیتی ہوں'' اس نے آنکھ میچ کر پر سوچ انداز میں کہا۔

''کیسا ارادہ'' نوشی ٹھٹکی۔

''تمہیں بھابھی بنانے کا''

''ہائے ظالم! یہ ظلم مت کرنا'' نوشی نے دردناک چیخ ماری ''میں کیا کروں گی''

''زہر کھا لینا'' اس نے اطمینان سے مشورہ دیا۔

''یا خودکشی کرو گی یا چائے بناؤ گی'' ساشا بھی دھاڑی۔

''اگر کچھ بھی نہ کروں تو؟''

''تو میں اس شادی کو جس کی پچھلے ایک سال سے تیاریاں جاری و ساری ہیں روک دوں گی'' اس نے گویا اعلان کیا۔

''ظالم سماج! نوشی نے منہ بنایا ''اس شادی کو رکوانے کا انجام اچھا نہیں ہوگا''

''اٹھتی ہو یا حسیب بھیا کو کروں فون''

''اٹھ رہی ہوں۔ بن گئی ہونا نند...... بیمار بھابھی کا ذرہ بھر خیال نہیں'' نوشی اچھل کر اٹھ گئی۔

''بیمار بھابھی ایک ''جن'' کے قابو میں ہی آسکتی ہے۔ آخر ترپ کا یہ پتا میں نے پہلے کیوں نہیں پھینکا'' ساشا خود کو داد دے رہی تھی۔

''کباب فریزر میں ہوں گے۔ فرائی کر لینا'' اس نے صوفے پر لیٹ کر اطمینان سے آرڈر دیا۔

''زہر نہ لا دوں تمہیں'' نوشی نے کچن کی کھڑکی میں سے گولا چھوڑا۔

''چاٹ مسالے کی جگہ زہر چھڑک لانا'' اسے کون سا پروا تھی۔

''میں تمہارے خودغرض خون سے اپنے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتی'' وہ فرائنگ پین میں تیل ڈال رہی تھی۔

''اب تو خودغرضی کے طعنے ہی دو گی۔ مطلب جو نکل گیا ہے''

''کیسا مطلب؟''

''میرے بھائی پر ڈورے ڈال کر انہیں قابو تو کر چکی ہو اب مجھ جیسی بے چاری نند تمہیں کھٹکے گی تو ضرور''

ان کی کھٹی میٹھی لڑائیاں کبھی ختم نہیں ہو سکتی تھیں وجہ یہ تھی وہ دونوں بچپن کی سنگی ساتھی تھیں۔ ساشا کی امی اور نوشی کی امی دونوں کزنز تھیں ایک دوسرے کے گھر شروع سے آنا جانا تھا بی اے کے بعد ان دونوں نے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا تھا حسیب کی جاب لگتے ہی امی نے نوشی کو بھیا کے لیے مانگ لیا تھا پچھلے سال ان دونوں کی دھوم دھام سے منگنی کر دی گئی تھی شادی کی ڈیٹ طے کرنے کے بعد حسیب کو خیال آیا تھا کہ کیوں نہ اوپر والا پورشن بھی تعمیر کروا لیا جائے بس اسی شوق اور مجبوری کے پیش نظر وہ گھر بدر تھیں اور نوشی کے گویا وارے نیارے ہو گئے تھے کہ ساشا سے روز ملاقات کا بہانہ ہاتھ آ گیا تھا۔

''تمہارے گھر آنے کے فوراً بعد تمہیں ٹھکانے لگانے کا کام کروں گی''

''تو پھر جلدی آؤ نا...... دیر کس لیے'' ساشا نے بے تابی دکھائی۔

''کرتی ہوں آنٹی سے بات۔ پہلے تمہیں فارغ کریں تو یہ اتنی بے صبری'' نوشی نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''خود منگنی کروا کر شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو۔ اکلوتی سہیلی کا کچھ خیال نہیں''

''منگنی کے لیے مری جا رہی ہو'' نوشی نے ٹرے تقریباً پٹخنے کے انداز میں میز پر رکھی۔

''نہیں'' وہ کباب اور چائے کی طرف متوجہ ہو گئی ''شادی کے لیے'' اس نے کیچپ میں کباب کو ڈبویا ''میں منگنی کے جھنجٹ میں پڑنا نہیں چاہتی'' اس کھلی بے شرمی کے مظاہرے پر نوشی کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

وہ چائے کا کپ اٹھانے لگی تھی جب نوشی کے ہاتھ میں لہراتے جوتے کو دیکھ کر اوپر کی طرف بھاگی۔

☆☆☆

چار جنوری!

نیر آنٹی کو اتنے دن بعد اس نے پہلی مرتبہ باغیچے میں بیٹھا دیکھا تھا وہ اخبار سامنے پھیلائے کسی گہری سوچ میں گم تھیں ان کا دھیان اخبار کی طرف نہیں تھا۔

''السلام علیکم آنٹی!'' ساشا نے گلا کھنکار کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا ''نیر آنٹی! میں یہاں بیٹھ جاؤں؟''

''ہوں......'' وہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

''تم......!''

''میں ساشا ہوں'' اس نے ان کی مشکل آسان کر دی۔

''روزینہ کی بیٹی'' انہوں نے ساشا کی امی کا نام لے کر تصدیق کرنا چاہی۔ ساتھ کرسی کی طرف اشارہ بھی کیا۔

''جی'' ساشا ان کا اشارہ سمجھ کر بیٹھ گئی تھی۔

''ماشاءاللہ بہت خوبصورت ہو''

''شکریہ'' وہ کچھ شرما سی گئی۔

''پڑھتی ہو؟''

''نہیں پڑھ چکی ہوں'' ساشا نے مسکرا کر بتایا۔ ''گریجویشن کیا ہے''

''اچھا...... تو ماسٹرز کیوں نہیں کیا؟''

''بس موڈ نہیں بنا'' اسے آنٹی کے چھوٹے چھوٹے بے ضرر سوال بہت اچھے لگ رہے تھے۔

‘‘قائلہ بھی بی اے کے بعد پڑھنے سے توبہ کر چکی تھی اس کی ماں کی بڑی خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر بنے مگر اس نے اعلان کر دیا تھا کہ میرا موڈ نہیں۔ آج کل کے بچوں کے موڈ نجانے کیا چیز ہیں پہلے وقتوں میں یہ موڈ نہیں ہوتے تھے’’

آنٹی نے خود بخود اس موضوع کو چھیڑ دیا تھا۔ جس کے بارے میں ساشا تذبذب کا شکار تھی۔

‘‘قائلہ کون؟’’ اس نے انجان بن کر پوچھا۔

‘‘میری بہو، میری سب سے چھوٹی بہن کی اکلوتی بیٹی’’ انہوں نے گہرا طویل سانس کھینچ کر بتایا تھا۔

‘‘اب کہاں ہیں آپ کی بہو؟’’ اس نے ایک اور زخم ادھیڑنے والا سوال پوچھ لیا۔

‘‘اس جگہ، جہاں سے کوئی واپس نہیں لوٹتا’’

‘‘آئم سوری آنٹی!’’ ساشا کو افسوس سا ہونے لگا تھا کہ اس لیے بھی کہ آنٹی کی آنکھوں سے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے وہ خود کو ملامت کرنے لگی۔

‘‘آپ اس گھر میں اکیلی رہتی ہیں؟’’ ازالے کے طور پر اس نے موضوع ہی بدل دیا۔

‘‘گھر کے مکین سامنے والا احاطہ بسا چکے ہیں۔ کیا کروں، یہ تنہائی میرا نصیب ہے’’ ان کے لب کپکپا رہے تھے۔

‘‘آپ کے کتنے بچے ہیں آنٹی!’’ وہ نوک زباں پر مچلتے اس سوال کو روک نہیں پائی تھی۔

‘‘چار...... تین بیٹیاں اور ایک بیٹا توصیف احمد’’ غم کی شدت سے ان کے چہرے پر زردی چھا گئی تھی۔

‘‘بیٹیاں کہاں ہیں؟’’ اس نے دانستہ توصیف کے بارے میں پوچھنے سے گریز کیا۔

‘‘تینوں شادی ہو کر لندن چلی گئیں۔ روزانہ فون آتے ہیں ایک کا فون سن کر ہٹتی ہوں تو دوسری کا آ جاتا ہے پھر تیسری کا دن میں کئی کئی مرتبہ فون کرتی ہیں میری طرف سے فکر مند رہتی ہیں’’ بیٹیوں کے ذکر نے بھولی بسری سی ایک مسکان پھر سے لبوں پر سجا دی۔

‘‘آپ ان کے پاس کیوں نہیں چلی جاتیں؟’’ ساشا نے مخلصانہ مشورہ دیا۔

‘‘کیسے چلی جاؤں؟’’ انہوں نے بے بسی سے کہا۔ ‘‘توصیف اور قائلہ کو چھوڑ کر...... دن کی شروعات ہی ان کی آرام گاہوں کو دیکھنے کے بعد کرتی ہوں’’

‘‘اور آپ کے باقی رشتہ دار وغیرہ’’

‘‘سب لندن میں ہوتے ہیں۔ چودھری صاحب کے عزیز و اقارب تو کوئی تھے نہیں۔ ہم تین بہنیں تھیں۔ قائلہ کی ماں بھی لندن میں ہی ہوتی ہے اور سب سے بڑی نور آپا بھی وہیں رہتی ہیں ان کی بھی تین بٹیاں اور ایک بیٹا ہے’’ وہ کھوئے ہوئے انداز میں بول رہی تھیں۔

‘‘قائلہ کی والدہ تنہا ہوتی ہیں اب؟’’

‘‘نہیں...... بہو اور بیٹے کے ہمراہ رہتی ہے۔ خیر سے کچھ دنوں بعد دادی بھی بن جائے گی نویلہ’’ ان کی آنکھیں لحہ بھر کو مسکرائیں۔

‘‘رشتے میں ہم بھی تو دادیاں ہوں گی نور آپا اور میں؟’’ وہ ساشا سے پوچھ رہی تھیں۔

اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

‘‘تم لوگوں کے آنے سے رونق ہو گئی ہے مگر یہ رونق بھی عارضی ہو گی۔ خیر سے تعمیر کا کام مکمل ہو۔ روزینہ بتا رہی تھیں کہ پھر حسیب کی اور تمہاری شادی ایک ساتھ کریں گی’’

‘‘جی...... یہ بات تو امی نے میرے ساتھ شیئر نہیں کی’’ اس نے بے تکے پن سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

‘‘جھلی! یہ بات تم سے شیئر کرنے والی ہے بھی نہیں’’ ساشا نے آنٹی کو کھل کر مسکراتے دیکھ کر سر کو جنبش دی۔

‘‘میں اتنی جلدی امی کو چھوڑ کر جانے والی نہیں’’

‘‘سب بیٹیوں کو جانا ہی پڑتا ہے’’ آنٹی نے اداسی سے کہا۔

‘‘مگر کیوں؟’’ اس نے احتجاجاً اخبار رول کر کے لوہے کی میز پر مارا’’ یہ دستور کس نے ایجاد کیا’’

‘‘کم از کم نیر نے تو نہیں کیا’’ امی نجانے کب باغیچے میں چلی آئی تھیں۔

‘‘آپ کب آئیں’’ وہ امی کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔

‘‘کب سے آپ کا سر کھا رہی ہے’’ امی اب آنٹی سے مخاطب تھیں۔

‘‘ارے کہاں...... ساشا بیٹی تو بہت پیاری باتیں کرتی ہے۔ میرا تو دل باغ باغ ہو گیا ہے’’ آنٹی کے تعریفی جملے نے ساشا کو بے ساختہ خوشی سے ہمکنار کر دیا۔

‘‘سچی آنٹی!’’ وہ جذبات میں آنٹی سے لپٹ گئی تھی’’ میں روزانہ آپ کو کمپنی دینے

آجایا کروں گی''

''کیوں نہیں ...... مجھے انتظار رہے گا'' آنٹی اب امی سے باتوں میں مصروف ہوگئی تھیں۔

''تم جاؤ...... کچن کو دیکھو جا کر، ہانڈی چڑھالو۔ خود سے ذرا بھی خیال نہیں۔ حسیب آنے والا ہے''

امی نے اسے ڈپٹ کر اٹھادیا تھا۔ وہ بسورتی ہوئی انیکسی کی طرف آگئی۔

☆☆☆

پچیس جنوری!

''ساشی! ساشی کی بچی کہاں ہو'' نوشی چلاتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔

''ٹیرس پر ہوں۔ ادھر ہی آجاؤ۔ ماسی مصیبت'' وہ نرم گرم دھوپ سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''مصیبت کسے کہا؟'' نوشی دھڑ دھڑ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگئی۔

''تمہیں اور کسے''

''ساشا علیم صاحبہ!'' وہ اس کے قریب رکھی بید کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے چبا چبا کر کہنے لگی۔

''جی محترمہ نوشین قادر صاحبہ'' ساشا نے بھی اس کے انداز میں نقل اتاری۔

''میں اس وقت کیوں آئی ہوں'' نوشی نے پھاڑ کھانے والے انداز میں پوچھا۔

''میرا بھیجہ کھانے''

''میرا ٹیسٹ اس قدر برا نہیں ہوسکتا'' نوشی بھنائی۔

''تو پھر...... حسیب بھیا کو دیکھنے کے لیے آئی ہو؟ مگر افسوس وہ فاروق کالونی جا چکے ہیں'' اس نے گویا ہاتھ جھاڑ کر اطلاع دی۔

''میں گرما گرم خوشبو اڑاتی چکن بریانی لے کر آئی ہوں۔ مگر تم جیسی کمینی ہستی کے لیے نہیں۔ اپنی ساسو ماں اور ہونے والے ''ان'' کے لیے''

''ہائے میری پیاری نوشی!'' اس نے اچھل کر نوشی کو بانہوں میں بھینچا۔

''خبردار، اپنے مطلبی ہاتھوں سے مجھے چھوا خوشامدی عورت'' نوشی ناراضی سے دور ہٹی۔

''عورت کسے کہا'' ساشا اچھل کر دور ہٹی۔

''تمہیں'' نوشی نے گویا دانتوں میں اسے پیسا۔

''مجھے...... یعنی اپنی اکلوتی نند کو'' ساشی کو گویا ہارٹ اٹیک ہونے لگا'' یہ بتاؤ بریانی کا ڈونگا کہاں رکھا ہے''

''تمہیں تو ہرگز میرے ہاتھ کی بریانی نہیں ملے گی''

''تو کسے کھلاؤ گی اپنے ہاتھ کے لذیذ کھانے'' ساشا کے منہ میں پانی بھر آیا۔ بہرحال نوشی کی کوکنگ اس کی کوکنگ سے سوگنا اچھی تھی۔

''آنٹی اور حسیب کو''

''بریانی کہاں ہے'' اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

''ہمارے کچن میں'' نوشی نے اس کی امید پر پانی پھیرا۔

''دفع ہو جاؤ'' وہ دوبارہ کرسی سنبھال کر بیٹھ گئی'' جہاں سے منہ اٹھا کر آئی ہو۔ وہیں دفع ہو جاؤ''

''ساشی......'' نوشی نے مصنوعی رعب لہجے میں بھرا'' میں تمہاری بڑی بھابھی ہوں۔ احترام کیا کرو میرا''

''تمہاری شکل ہی ایسی ہے کیا کروں'' احترام کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا'' وہ ہنسنے لگی۔

''کاش میرا بھی کوئی بھائی ہوتا'' نوشی نے مصنوعی آہ بھرلی'' پھر میں تمہیں بھابھی بنالیتی پھر گن گن کر بدلے لیتی''

''وہ تو تم اب بھی لے سکتی ہو'' اس نے ہمدردی سے کہا۔

''تم پر ترس آجاتا ہے۔ صورت ہی ایسی مسکین سی ہے'' نوشی نے اسے چڑایا'' یتیمی برستی ہے۔ غریبی ٹپکتی ہے۔ کیا کروں دل نہیں مانتا''

''بڑی رحم دل ہونا'' ساشا نے تڑخ کر کہا۔

''تو اور کیا۔ چڑیا جتنا دل ہے میرا''

''چڑیا سے بھی چھوٹا۔ چڑیا پھر سائز میں بڑی ہوتی ہے۔ تمہارا دل تو اتنا سا ہے۔ چاول کے دانے جتنا کمینہ دل'' وہ جل بھن کر بولی۔

''میں نے کب کمینگی دکھائی ہے'' نوشی کا حیرت سے منہ کھل گیا'' میری قرمزی ساڑھی، جیولری باکس، میک اپ کٹ تو ہتھیا چکی ہو، پھر بھی کمینگی کا طعنہ''

''تو اور کیا۔ کچھ غلط تو نہیں بولا'' اس کے اطمینان میں قطعاً فرق نہیں آیا تھا'' کمینگی تو

ثابت ہو چکی ہے۔ خود بریانیاں کھاتی ہو اور ہم جو تمہاری کالونی میں مہمان ہیں انہیں خالی خولی سوکھی محبت پر ٹرخا رکھا ہے۔ کنجوس اس حد تک ہو ایک تعریفی جملہ میری شان میں نہیں بول پائیں۔"

"کیا مطلب؟"

"اندھی ہو گیا۔ میرا نیا نکور سوٹ نہیں دکھائی دے رہا۔ جو میں نے زیب تن کر رکھا ہے" ساشا نے تنگ آ کر شو آف کرنے والی خواتین کی طرح جتا ہی دیا۔

"یہ تمہارا نیا سوٹ ہے مگر دیکھا دیکھا لگ رہا ہے" نوشی نے ذہن پر زور ڈالنا شروع کیا۔

"اب میرا دل مت جلانا" یہ کہہ کر کہ بیگ صاحب کی بہو نے پچھلے سال پہنا تھا یا پھر تمہاری فلانی فلانی کزن نے تمہیں گفٹ کیا تھا، آج سے بیس سال پہلے"

"نوشی ہنس ہنس کر دوہری ہو گئی۔

"میں بریانی ہی نہیں...... رس ملائی بھی لائی ہوں...... فریج میں رکھی ہے" وہ اٹھتے ہوئے بولی تھی۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟" ساشا اس کے پیچھے لپکی۔

"میں ذرا نیر آنٹی سے ملنے جا رہی ہوں" وہ جاتے جاتے پلٹ کر بولی۔

"رکو تو...... میں بھی آتی ہوں"

"تمہیں میرے بغیر چین پڑتا ہے بھلا" نوشی نے مصنوعی تلملاہٹ کا اظہار کیا تھا۔

پھر وہ دونوں آگے پیچھے بھاگتی ہوئی باڑھ پھلانگنے لگی تھیں۔ جو انیکسی کے حصے کو الگ کرنے کے لیے بنائی گئی تھی شاید۔

☆☆☆

"السلام علیکم آنٹی! ان دونوں نے بیک زبان سلام جھاڑا تھا۔

"وعلیکم السلام" آنٹی کے لبوں پر ان دونوں کو دیکھ کر مسکان پھیل گئی۔

"ساشا بیٹی تو روزانہ میری خیریت پوچھنے آتی ہے" انہوں نے سویٹر کے ڈیزائن دیکھتی ساشا کو پیار سے دیکھا۔

"میں ہی بھیجتی ہوں اسے" نوشی نے کمال اطمینان سے کہا تھا۔

"کیا کہہ رہی ہو جھوٹی!" ساشا نے اس کے کندھے پر دھموکا جڑا "میں خود آنٹی کی محبت میں کھینچی چلی آتی ہوں"

"آنٹی! بتایئے اسے، میں آپ کی خیریت معلوم کرنے روزانہ آیا کرتی تھی نا" نوشی آنٹی سے تائید چاہ رہی تھی۔

"تو اب کیوں نہیں آتیں" اس نے جلبلا کر پوچھا۔

"آنٹی! بتا دوں اس ڈفر، بونگی کو آپ کے پاس نہ آنے کی پاورفل وجہ" نوشی نے آنٹی سے اجازت محض اسے چڑانے کے لیے چاہی۔

"بتا بھی چکو" ساشا کے صبر کی انتہا بس یہیں تک تھی۔

"کالونی والوں کے خوف سے ان کی باتوں کے ڈر سے"

"کیسا خوف؟ کیسا ڈر؟" تم ڈرنے والی ہو کسی سے" ساشا نے بھنا کر کہا۔

"ڈرنا پڑتا ہے بہنا! بیگ صاحب کی بیگم پوری کالونی میں نشر کر دیں گی کہ میں بھاگ بھاگ کر یہاں اس لیے آتی ہوں کہ میرے سسرالیوں کا ادھر قیام ہے بلکہ انہوں نے صاف کہا ہے کہ میں حسیب کے لیے آتی ہوں" نوشی نے سنجیدگی سے وضاحت کی۔

"تو کہتی رہیں...... ہماری بلا سے" اس نے تنک کر کہا "اپنے گریبان میں لوگ نہیں جھانکتے۔ دوسروں پر فوراً انگلی اٹھا لیتے ہیں"

"دنیا دو دھاری تلوار ہے" نوشی نے کسی بڑی بی کی نقل اتاری۔

"اپنی بیٹی "پھٹ پھٹی" (بائیک) پر چڑھی ہوتی ہے منگیتر کے ساتھ نجانے کہاں کہاں پھر کر آتی ہے ادھر ادھر جھانکنے کے بجائے ہاتھوں سے نکلتی بیٹی پر نظر رکھیں" ساشا نے اپنے ازلی بااعتماد لہجے میں کہا۔

"ساشا تو مجھے قائلہ جیسی لگتی ہے" آنٹی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تھا۔ ساشا اور نوشی دونوں ٹھٹک گئیں۔

"قائلہ کی طرح ہنستی ہے...... قائلہ کی طرح بولتی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ میری قائلہ پلٹ آئی ہے۔ لوٹ آئی ہے میرے ارد گرد، میرے آس پاس" وہ کھوسی گئی تھیں۔

"آنٹی! اسے آپ اپنے پاس رکھ لیں" نوشی نے ماحول پر چھائی کثافت کم کرنا چاہی۔

"اگر میرا کوئی اور بیٹا ہوتا تو ضرور رکھ لیتی" وہ نم آنکھوں سے مسکرا دیں۔

"آنٹی! آپ کے پاس قائلہ اور توصیف کی تصویریں ہیں" ساشا ان کے ہاتھ نرمی سے دباتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''اتنے بے شمار البمز ہیں......نوشی! میرے کمرے کی الماری سے اٹھا کر لے آؤ''

''ابھی لائی''نوشی سر ہلا کر اٹھ گئی۔

''یہ نکاح کا البم ہے۔قائلہ پاکستان آئی تھی آخری مرتبہ جیتی جاگتی، تب نکاح کا فریضہ ادا کر دیا تھا نویلہ کا ارادہ تھا، رخصتی لندن میں کریں گے۔توصیف کے پیپرز بننے میں کچھ وقت باقی تھا۔تب ہم نے بہت دھوم دھام سے نکاح کر دیا'' آنٹی نے البم کھول کر ساشا کے سامنے کر دیا اور وہ تو اس بے حد خوبرو لڑکے کے پہلو میں بیٹھی سجی سجائی چینی کی گڑیا کو دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی۔

''اللہ، اتنا حسن''

''یہ نویلہ ہے، قائلہ کی ماں، میری چھوٹی بہن'' آنٹی نے ایک اور تصویر پر انگلی رکھی تھی۔

''یہ قائلہ کا بھائی ہے''وہ ایک ایک تصویر اس کے سامنے رکھتی جا رہی تھیں۔

''میری بڑی آپا نور بانو......زیب کی ماں'' اس تصویر کو انہوں نے بغیر دیکھے ایک طرف رکھ دیا تھا۔

وہ پورا البم دیکھ چکی تھی نوشی، توصیف کے بچپن کے البم دیکھ رہی تھی اور آنٹی ساری تصویریں اسے تھما کر فون سننے کے لیے اٹھ گئی تھیں جو کہ کب سے بج رہا تھا وہ ایک ایک تصویر کو البم میں لگا رہی تھی۔ جب البم میں موجود کچھ تصویریں پھسل کر اس کی گود میں آ گریں۔تصویروں کے دوسری طرف کچھ لکھا ہوا تھا۔ساشا نے پڑھا کچھ نظمیں اور شعر تھے، مٹی مٹی سی تحریر تھی۔

ڈر ہے کہ بچھڑ نہ جائے وہ شخص مجھ سے محسن
زمانہ ہماری جدائی کا طلب گار بہت ہے

یہ تصویر قائلہ کی تھی ہنستی مسکراتی تصویر۔جس کے پیچھے یقیناً توصیف نے شعر لکھا تھا۔

ساشا نے دوسری تصویر اٹھائی۔یہ بھی قائلہ کی تصویر تھی مگر اس کے ساتھ ایک نوجوان کھڑا تھا کھرے سے نقوش والا۔ساشا نے تصویر پلٹ کر تحریر پڑھی۔

''قائلہ! مائی لو''

''اس نے نیچے بڑی خوبصورت رائٹنگ میں طویل نظم لکھی تھی۔بڑی ہی ترنگ کے عالم میں لکھی گئی تھی یوں لگتا تھا گویا نظم کے لفظ لفظ میں جذبوں کے شعلے لپک رہے ہیں۔

مجھے معاف کر، میرے ہم سفر
تجھے چاہنا، میری بھول تھی

کسی راہ پر جو اٹھی نظر
تجھے دیکھنا، میری بھول تھی
کوئی نظم ہو یا کوئی غزل
کہیں رات ہو یا کہیں سحر
وہ گلی گلی، وہ شہر شہر
تجھے ڈھونڈنا، میری بھول تھی
میرے غم کی کوئی دوا نہیں
مجھے تجھ سے کوئی گلہ نہیں
میرا کوئی تیرے سوا نہیں
یہ سوچنا، میری بھول تھی

نظم کے نیچے بریکٹ میں بڑے واضح الفاظ میں لکھا تھا

''تمہیں چاہنا میری بھول ہرگز نہیں ہو سکتی۔قائلہ''

(زیب حسن)

''مائی گاڈ! یہ کون ہو سکتا ہے؟'' ساشا نے بے صبری سے تصویر نوشی کے سامنے کر دی۔نوشی نے تصویر کو دیکھا، کچھ سوچا اور بولی۔

''یہ آنٹی نور بانو کا بیٹا ہے۔زیب حسن''

''یعنی قائلہ اور توصیف کی بڑی خالہ کا بیٹا''

''ہاں''نوشی پھر سے البم دیکھنے میں مگن ہو گئی تھی۔

ساشا نے کچھ اور تصویریں سفید لفافے میں سے نکال لیں۔اس کا ارادہ تھا کہ انہیں بھی البم میں لگا دے گی مگر ان تصویروں کو دیکھ کر تو ساشا تھرا کر رہ گئی تھی ایک کے بعد دوسری نظر ڈالنے کو یہ حساس سا دل ہرگز تیار نہیں تھا وہ ایک دم پسینہ پسینہ ہو گئی تھی۔''نوشی! یہ دیکھو'' ساشا نے ساری تصویریں اس کے سامنے کر دیں۔

'' قائلہ اور توصیف ہے'' اس نے افسردگی سے بتایا تھا ''یہ تصویریں لندن میں بنائی گئی تھیں اس وقت انہیں تابوت میں بند نہیں کیا گیا تھا ڈھیروں پھولوں کی چادر کے نیچے ان کے خاموش وجود اور گہری نیند میں سوئے بند آنکھوں والے چہرے۔

قائلہ کی تصویر کے پیچھے ایک شعر لکھا تھا

نکلے تھے اس لیے کہ ڈھونڈ لیں گے تجھے
تیری اک تلاش نے ، عمر بھر کا مسافر بنادیا

قائلہ ہاشم علی کے نام

(زیب حسن)

''نوشی! گھر چلیں'' اس نے ساری تصویریں لفافے میں ڈال دی تھیں دل ایک دم ہی ہر شے سے اچاٹ ہو گیا تھا اسی پل آنٹی بھی چلی آئیں۔ وہ بے حد بجھی بجھی لگ رہی تھیں۔

''خیریت آنٹی!'' نوشی البم سمیٹتے ہوئے بولی۔

''ہوں'' وہ کسی گہری سوچ کے زیر اثر تھیں۔

''نازلی کا فون تھا نا''

''ہوں'' آنٹی نے پھر سے ہنکارا بھرا۔

''کیا کہہ رہی تھی'' نوشی نے پوچھ ہی لیا۔

''میری بہن پاکستان آرہی ہے'' انہوں نے بے دلی سے بتایا۔

''قائلہ کی امی''

''نہیں......نور بانو آپا''

''آپ کے لیے چائے لاؤں آنٹی!'' ساشا نے نرمی سے پوچھا۔

''ارے......میں بھی کیسی بھلکڑ ہوں، اوون میں کھجور کا حلوہ رکھ کر آئی تھی سوچا تھا، چائے بھی بناتی ہوں۔ میری بیٹیاں کافی دن بعد آئی ہیں۔ سوکھے منہ جاتی اچھی لگتیں۔ بس نازلی کے فون نے الجھا کر رکھ دیا'' آنٹی خود کو ملامت کرتی اٹھنے لگی تھیں جب ساشا فوراً بولی۔

''چائے میں بنالاتی ہوں''

''ضرور، ضرور' آنٹی! یہ بہت اچھی چائے بناتی ہے'' نوشی نے لہک لہک کر کہا۔

''آنٹی کے لیے اور اپنے لیے بنا کر لاؤں گی۔ تمہیں زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں'' ساشا اسے چڑاتے ہوئے بولی تھی۔ آنٹی کا دھیان کچھ دیر کے لیے ہی سہی بٹ ضرور گیا تھا اور وہ ان کی نوک جھونک سے محظوظ ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

تیس جنوری!

''آنٹی جی! ایک مشورہ دوں۔ اگر برا نہ لگے'' ساشا چند ہی دنوں میں نیر حیات کے کتنے قریب آگئی تھی۔ دن میں کئی کئی مرتبہ ادھر آ ٹپکتی اگر وہ کھانا پکا رہی ہوتیں تو یہ ان کی مدد کے خیال سے تیز تیز ہاتھ چلانے لگتی آنٹی کو دو ایک مرتبہ زبردستی اپنے ساتھ بازار لے گئی تھی۔ انہیں پارک لے جاتی۔ نیر حیات کو لگتا تھا کہ ان کی زندگی پر چھایا جمود دھیرے دھیرے ٹوٹ رہا ہے۔

''کیوں نہیں'' وہ خوش دلی سے بولیں۔

''آنٹی! میں سوچ رہی تھی کہ یہ اتنی بڑی کوٹھی ہے آپ انیکسی والے حصے کو بچوں کی نرسری یا ڈے کیئر سنٹر کیوں نہیں بنا لیتیں'' اس کا انداز کافی پرسوچ تھا۔

''آئیڈیا تو بہت اچھا ہے مگر انیکسی فی الحال خالی کہاں ہے'' وہ مسکرانے لگیں۔

''عنقریب خالی ہو جائے گی ہم بہت جلد یہاں سے جانے والے ہیں۔ مگر آپ نے ایک وعدہ تو مجھ سے کرنا ہوگا'' وہ بہت دنوں سے ارادہ باندھ رہی تھی کہ آنٹی سے یہ بات ضرور کرے گی۔

''کیسا وعدہ؟''

''آپ مجھ سے ملنے آیا کریں گی'' ساشا نے محبت بھری دھونس سے کہا۔

''اور میرا دل تو ابھی سے بجھ رہا ہے کہ تم اپنے گھر چلی جاؤ گی'' آنٹی نے مصنوعی افسردگی سے کہا۔

''جانا تو ہے نا۔ پھر نوشی کو بھی دھوم دھام سے لے کر جانا ہے۔ اپنے گھر جائیں گے تو شادی ہوگی'' وہ ان کی بات کا مفہوم نہیں سمجھی تھی۔

''میں اس گھر کی نہیں، اس گھر کی بات کر رہی ہوں''

''کیا مطلب؟'' ساشا سمجھ کر چلائی۔

''تمہاری امی، حسیب کے ساتھ ہی تمہیں بھی منگنی یا شادی کے بندھن میں باندھ دیں گی''

''ہائے نہیں'' اس نے فلمی انداز میں چیخ ماری۔ ''امی نے آپ سے کچھ کہا ہے؟''

''کچھ نہیں، بہت کچھ......تمہارے دو تین پرپوزل آئے ہیں'' انٹی نے اسے معلومات پہنچائی تھیں۔ یقیناً امی نے ہی آنٹی سے کہا تھا کہ اسے شادی کے لیے رضامند کریں۔ کیونکہ ساشا

علیم شادی کے نام سے ہی بھاگتی تھی۔

"آپ کا کیا خیال ہے کہ میں کسی ظالم ساس، جلاد ٹائپ نندوں اور دیو کی شکل جیسے خاوند کے قبضے میں چلی جاؤں اور فل ٹائم ہاؤس کیپر، دھوبن، درزن اور جمعدارن بن جاؤں۔ نہیں، آنٹی! کبھی نہیں" اس نے پھر سے ڈائیلاگ جھاڑا۔

"ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ سوئے اتفاق تینوں پرپوزل ایسے لڑکوں کے ہیں جو فیملیز سمیت باہر سیٹل ہیں" آنٹی نے اسے حیران کر دیا "مگر روزینہ کچھ متامل سی ہے"

"کیوں؟" اس نے بے صبری سے پوچھا

"تمہیں اتنی دور بھیجنا نہیں چاہتی"

"یہ کیا بات ہوئی۔ اب ہی تو ڈھنگ کے پرپوزل آئے ہیں...... اور پھر آپ کی تینوں بیٹیاں بھی تو باہر ہیں" وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

"یعنی تمہیں کوئی اعتراض نہیں" آنٹی نے مسرت سے پوچھا۔

"نہیں" اس نے سر کو دائیں بائیں ہلایا "لیکن فی الحال میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی "میں جاب کرنا چاہتی ہوں"

"میری بیٹی نازلی کے خیالات بھی تمہارے جیسے تھے" وہ ماضی کے کسی لمحے میں کھو گئیں۔

"آپ نے بھی اپنی تینوں بیٹیاں پردیس میں بیاہ دیں آنٹی! کسی ایک کو تو اپنے پاس رکھ لیتیں"

"یہ تو ازل سے دستور ہے بیٹیوں کو ایک دن بھیجنا تو ہوتا ہی ہے"

"اچھا، یہ بتائیں...... ہمارے جانے کے بعد کیا کریں گی" اس نے گفتگو کا رخ بدل دیا تھا۔

☆☆☆

آٹھ فروری!

"کیا کر رہی ہو؟" ساشا نے ابھی ڈائری کھول کر قلم ہاتھ میں لیا ہی تھا جب نوشی دھاڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

"کبھی اس ڈائری کی جان چھوڑ بھی دیا کرو" جوں ہی نوشی کی نظر ڈائری پر پڑی تھی، وہ جلبلا اٹھی۔

"میرے ساتھ چلو" نوشی ڈائری اچکنے کے چکر میں تھی۔ ساشا نے اسے گھور کر ڈائری پیچھے ہٹا لی۔

"کہاں جانا ہے؟"

"روما کی طرف" نوشی نے اپنی کسی دوست کا نام لیا۔

"میں نہیں جا رہی" اس نے جھٹ سے انکار کر دیا نوشی پندرہ بیس منٹ تو خوشامدیں کرتی رہی تھی اس پر اثر ہوتا نہ دیکھ کر پاؤں پٹختے ہوئے "بھاڑ میں جاؤ" کہتی دروازہ دھاڑ سے بند کر کے چلی گئی تھی۔

ساشا نے ڈائری کی چکنی جلد پر ہاتھ پھیرا اور قلم اٹھا کر لکھنا شروع کیا۔

"سبز پتوں کا شجر خزاں کی آمد کے ساتھ ہی برہنہ ہو رہا تھا۔ رات کی سیاہی نے جب کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لیا...... تو اچانک"

قلم اس کے ہاتھ میں لرز کر رہ گیا تھا اور وہ کل رات کے اس منظر کو سوچ رہی تھی ہمیشہ کی طرح ڈائری لکھنے کی خواہش انگڑائی لے کر جاگ اٹھی تھی وہ رات کے دوسرے پہر گرم بستر کو چھوڑ کر اٹھ بیٹھی۔ لکھنے سے پہلے تازہ دم ہونے کے لیے گرما گرم چائے کا ہونا ضروری تھا۔ سو وہ چپی پیروں میں پھنسا کر کچن کی طرف آ گئی چائے بنانے کے ساتھ ساتھ اس نے نگٹس بھی فرائی کر لیے تھے۔

کمرے میں آ کر اس نے سب سے پہلے گلاس ونڈو سے بھاری پردے کھینچ کر لان میں اتری گہری رات کا نظارہ کیا اور پھر نجانے کیا سوچ کر اس ٹھٹھرا دینے والی سردی میں ٹیرس کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی ہاتھ میں گرما گرم چائے کا مگ پکڑ رکھا تھا شدید سرد ہوا نے استقبال کیا اردگرد غیر ارادی نظر دوڑاتے، جوں ہی اس نے شہر خموشاں کی طرف دیکھا گویا ایک برقی لہر پورے وجود میں دوڑ کر گئی۔

قبرستان کا پھاٹک جو عموماً بند ہی رہتا تھا۔ آج بھی ہمیشہ کی طرح بند تھا۔ موٹا سا تالا اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں دور سے ہی دکھائی دے رہا تھا احاطے کے اندر روشنی کا انتظام کیا گیا تھا۔ چاروں کونوں میں بڑے بڑے گلوب نصب تھے سر شام ہی لائٹس آن کر دی جاتی تھیں۔ کم از کم ساشا نے یہاں آنے کے بعد اتنے دنوں میں یہی معمول دیکھا تھا ان روشنیوں کی وجہ سے ہر قبر کا کتبہ بھی روشن ہو رہا تھا ٹیرس کا فاصلہ قبرستان سے نہ ہونے کے برابر تھا ساشا جس جگہ

کھڑی تھی سامنے کا منظر اسے صاف دکھائی دے رہا تھا اور اس کی آنکھوں نے اس شب بڑا ہی عجیب منظر دیکھا۔

نجانے وہ کون تھا کہاں سے آیا تھا اور اس کا ان دو قبروں سے کیا رشتہ تھا ساشا بالکل بھی نہیں سمجھ پائی تھی۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کے دماغ میں کوندا سا لپکا تھا اور وہ ہاتھ میں پکڑا مگ وہیں رکھے تقریباً بھاگتے ہوئے سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئی شال کو اچھی طرح ارد گرد لپیٹے اس نے بغیر سوچے سمجھے قبرستان کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے۔

پھاٹک بند تھا۔ ساشا کچھ دور پڑے دیوار کے قریب موجود پتھر کو دیکھ کر ادھر آ گئی۔ یقیناً وہ اجنبی اس پتھر پر پاؤں رکھ کے دیوار پھلانگ کر احاطے میں اترا تھا۔

کچھ سوچ کر ساشا نے بھی پتھر پر پاؤں رکھا اور دھیرے دھیرے سر اٹھا کر احاطے کے اندر جھانکا۔ اس کا دل گویا اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ صرف چار قدم دور قائلہ اور توصیف کی قبریں تھیں۔ قبروں کے سرہانے سیمنٹ سے بنا دل جگمگا رہا تھا اور وہ عین اس دل کے قریب کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹ ہل رہے تھے اور وہ کسی وجد کے عالم میں تھا۔

ساشا کو اس اجنبی کی آنکھوں سے نکلنے والے ان آنسوؤں نے دنگ کر دیا تھا آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ آنسوؤں کے قطرے اب پھسل پھسل کر شاید قبر کے اوپر گر رہے تھے اور وہ قبر توصیف کی تھی نجانے کتنے پل وہیں کھڑے کھڑے بیت گئے تھے۔

ساشا کو اس وقت ٹھٹھرا دینے والی سردی تک محسوس نہیں ہو رہی تھی اس کا پورا وجود ہولے ہولے کپکپا رہا تھا۔ ٹھنڈ کی وجہ سے نہیں۔ اس خوف کی وجہ سے جو دھیرے دھیرے اسے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔

اجنبی کا چہرہ واضح تھا۔ تاہم وہ اچھی کاٹھی رکھنے والا مضبوط نوجوان تھا۔

ساشا نے اک اور منظر دیکھا تھا۔ اجنبی دھیرے دھیرے چلتا قائلہ کی قبر کے قریب آیا پھر وہ گھٹنوں کے بل دوزانوں بیٹھ گیا۔

وہ کتبے پر لکھے کچھ شعر پڑھ رہا تھا جو کہ ایک مرتبہ ساشا کے پوچھنے پر آنٹی نے بتایا تھا کہ توصیف کو یہ پنجابی نظم بہت پسند تھی یہ نظم اس نے فریم کروا کے اپنے بیڈروم میں بھی لگوا رکھی تھی اور یہی نظم اب اس کی قبر کے کتبے پر کندہ تھی۔

ساشا تک اس اجنبی کا درد میں ڈوبا لہجہ اور آواز با آسانی پہنچ رہی تھی۔

کج شوق سی یار فقیری دا
کج عشق نے در در رول دیا
کج سجنا حاجت نہیں چھوڑی
کج زہر رقیباں گھول دتا
کج ہجر فراق دا رنگ چڑھیا
کج درد ماہی انمول دتا
کج سڑ گئی قسمت ساڈی
کج پیار اچ دھوکا یار دیتا

....

(کچھ فقیری کا ہمیں شوق بھی تھا
کچھ عشق نے دردر رول دیا
کچھ سجنا نے حاجت نہیں چھوڑی
کچھ زہر رقیبوں نے گھول دیا
کچھ ہجر و فراق کا رنگ چڑھا
کچھ محبوب نے درد انمول دیا
کچھ ہماری قسمت ہی خراب تھی
کچھ پیار میں دھوکا یار نے دیا)

اب وہ قائلہ کے قدموں میں بیٹھا رو رہا تھا، ہچکیوں کے ساتھ، ساشا ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹی تھی اور پھر بھاگتی ہوئی انیکسی کے گیٹ کی طرف بڑھ گئی اپنے کمرے میں جا کر بھی وہ وقفے وقفے سے گلاس ونڈو سے دیکھتی رہی تھی۔ وہ اجنبی ابھی تک قبرستان کے احاطے میں موجود تھا۔ پو پھٹنے سے کچھ دیر پہلے جب مؤذن نے اذان دی تھی تب وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتا دیوار پھلانگ کر اندھیرے میں گم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اٹھارہ فروری!

امی رات سے نجانے ساشا سے کیا بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ کئی دفعہ انہوں نے گفتگو کا

آغاز کرنا چاہا تھا مگر پھر نجانے کیوں موضوع ہی بدل دیتیں۔

اس وقت بھی وہ امی کو دیکھ رہی تھی جو کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔

''کیا سوچ رہی ہیں'' اس نے لاڈ سے ان کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔

''سوچ رہی ہوں۔نوشی کو اب گھر لے آؤں اور تمہیں بھیجنے کی تیاری کروں'' امی نے پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

''کیا'' اس نے چونک کر امی کی طرف دیکھا۔وہ بے حد سنجیدہ تھیں۔

''میں نے تمہارے لیے آئے پر پوزل میں سے ایک کو پسند کرلیا ہے۔حسین کو بھی سب کچھ پسند آیا ہے اپنے تئیں اس نے کچھ معلومات بھی کروالی ہیں میں چاہ رہی ہوں...... اپنے گھر شفٹ ہونے کے بعد ان لوگوں کو انوائٹ کروں''

''پہلی دو منگنیاں ٹوٹنے کے بعد اب تیسری منگنی......'' ساشا زچ سی ہو اٹھی۔یہ ٹریجڈی بھی ساشا کے ساتھ ہی ہونا تھی۔آج سے تین سال پہلے امی نے کسی رشتے کروانے والی دو نمبر مائی کی باتوں میں آکر کسی انجینئر سے ان کی زبانی کلامی منگنی کردی تھی بھیا نے خفیہ طریقے سے چھان بین کروائی تو پتا چلا، جناب کسی ورکشاپ میں ملازم ہیں۔دوسری مرتبہ اس سے برعکس واقعہ رونما ہوا۔

ہوا کچھ یوں کہ یہ محترم مسیحائی کے پیشے سے وابستہ تھے یعنی ڈاکٹر تھے اچھی خاصی پرسنالٹی تھی بھیا اور امی دونوں کو جناب خاصے پسند آچکے تھے گھر بار بھی مناسب...... مختصر سی فیملی، امی تو ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتی تھیں یعنی جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ۔مگر امی کے سارے ارمان دھرے کے دھرے رہ گئے تھے منگنی خاصی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔مگر شادی تک بات جا ہی نہیں سکی۔پتا چلا کہ محترم کسی نرس کی زلف کے اسیر ہیں اور منگنی توڑنے پر کمر بستہ بھی۔

اب کوئی جناب سے پوچھتا، پہلے کیا نیند میں تھے یا عالم بے ہوشی میں۔خیر اس منگنی کا انجام بھی خاصا دردناک تھا امی کا دل بھی کھٹا ہو چکا تھا تب ہی کچھ عرصہ تک راوی نے چین ہی چین لکھا۔مگر گھر کی تعمیر کے ساتھ ہی امی کی خفیہ سرگرمیاں ساشا کی نظر سے مخفی نہیں رہ سکی تھیں۔

تاہم وہ منگنی کا تیسرا تجربہ ہرگز نہیں کرنا چاہتی تھی وہ شادی کے نام سے ہی چڑنے لگی تھی۔

''مجھے منگنی نہیں کروانی۔کبھی بھی نہیں'' اس نے بچوں کی طرح ٹھنک کر کہا۔

''منگنی نہیں...... میں تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں...... پھر نہ کہنا، بتایا نہیں۔اپنا مائینڈ میک اپ کرلو'' امی نے تو آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں اور یوں لگتا تھا کہ انہوں نے بالا ہی

بالا سارے معاملات طے کررکھے ہیں اسے بتا کر محض فارمیلٹی نبھا رہی تھیں امی کو اٹھتا دیکھ کر وہ پکارتی ہی رہ گئی تھی جبکہ امی اسے کچن کے متعلق ہدایات دینے کے بعد چادر اوڑھے کہیں جانے کے لیے تیار تھیں۔

''آپ کہاں جارہی ہیں؟'' اس سے رہا نہیں گیا تھا' اسی لیے بے صبری سے پوچھنے لگی۔

''میں ریحانہ کی طرف جارہی ہوں خبردار، میرے پیچھے آئیں تو...... چاول پکالو، اور آٹا بھی گوندھ لینا۔روٹی میں آکر بنالوں گی'' وہ اپنا چشمہ اٹھا کر باہر نکل گئی تھیں جبکہ ساشا نے کپڑوں کے ڈھیر کو بری طرح سے گھورا۔

''روٹی میں ہی بنالوں گی...... آٹا گوندھنا مشکل ہے یا روٹی بنانا...... مگر پہلے ان کپڑوں کے ڈھیرے سے تو نبٹ لوں''

وہ تن فن کرتی اٹھ گئی تھی۔پورے دو گھنٹے کی مشقت کے بعد کپڑے استری ہوکر اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئے تھے پھر وہ بھیا کے جوتے پالش کرنے بیٹھ گئی تھی اور یہ اس کا لڑکپن سے معمول رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ یہ ساری ذمہ داریاں عنقریب نوشی سنبھال لے گی پھر اس کی بھلا کیا مصروفیت ہوگی۔

یہی بات سوچتے سوچتے اس کی ذہنی رو بہک گئی تھی اور وہ اپنے گھر جیسے ایک اور گھر کے متعلق سوچنے لگی تھی ایسی ہی بہت ساری ذمہ داریاں اس کی منتظر ہوں گی وہ گھر جو اس کا اپنا ہوگا اور وہ شخص جسے امی اور بھیا اس کے لیے پسند کریں گے۔

نجانے وہ کیسا ہوگا؟ کس نیچر کا ہوگا؟ بھیا جیسا نرم مزاج ہوگا یا پھر اکھڑ مزاج؟ چلو، جان ہی لیں گے، محترم کے مزاج کو...... شادی کے بعد اچھے بھلے لوگوں کے مزاج ٹھکانے پر آجاتے ہیں''

آٹا گوندھ کر تسلے میں رکھا ہی تھا جب فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ساشا کو سو فیصد یقین تھا کہ نوشی کا فون ہوگا سو وہ اطمینان سے اچھی طرح ہاتھ دھوتی رہی۔پھر اسی اطمینان سے تولیے کو اٹھایا ہاتھ خشک کیے فریج میں سے بوتل نکالی دو گلاس بھر کے پانی پیا اور پھر دانت کچکچا کر بجتے فون کی طرف دیکھا۔نوشی کے علاوہ کوئی ایسا ڈھیٹ ابھی تک اس کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔

وہ نپے تلے قدم اٹھاتی فون تک آئی اور پھر صرف نوشی کو چڑانے اور ستانے کے لیے بڑے اسٹائل سے ہیلو کہا تھا مگر دوسری طرف سے آنے والی مردانہ آواز کو سن کر اس کے چودہ طبق

روشن ہو گئے پہلا خیال یہی آیا کہ یقیناً بھیا کے آفس سے فون ہو گا سو اس نے لہجے کو فوراً بدل لیا۔

"کون صاحب بات کر رہے ہیں؟" وہ بڑی شائستگی سے پوچھ رہی تھی۔

"جو بھی ہوں، تمہیں اس سے مطلب نہیں ہونا چاہئے۔ مجھے تم سے صرف اتنا کہنا ہے...... جو کچھ پرسوں رات تم نے دیکھا تھا۔ اس کا تذکرہ کسی سے بھی نہیں ہونا چاہئے۔ کسی سے بھی نہیں" اس کے دھیمے لہجے میں عجیب سی پھنکار تھی۔

"میں نے کیا دیکھا ہے؟" اس نے ہونق پن سے پوچھا۔ سچ تو یہ تھا، لمحہ بھر کے لیے وہ یکسر بھول چکی تھی کہ اس نے پرسوں رات کچھ دیکھا بھی تھا۔

"انجان بننے کی اداکاری مت کرو" مقابل کی آواز میں شعلوں کی سی لپک تھی۔ پل بھر کے لیے تو ساشا کپکپا کر رہ گئی "اگر تم نے کسی سے ذکر کیا تو انجام اچھا نہیں ہو گا"

"کیا کر لو گے تم؟" وہ دھاڑ کر بولی "میں ان دھمکیوں سے ڈرنے والی نہیں"

"آئندہ کبھی قبرستان کے اردگرد مت دکھائی دینا، رات کے دوسرے تیسرے پہر، انڈر اسٹینڈ" اس کا لہجہ اب بھی دھیما مگر سخت تھا۔

"کیا تم آئندہ بھی قبرستان میں آنے کا ارادہ رکھتے ہو؟" ساشا کا ازلی اعتماد لوٹ آیا تھا اتنا تو اسے پتا چل چکا تھا کہ یہ فون کرنے والا وہی شخص ہے جسے اس نے قبرستان میں دیکھا تھا۔

فون کھٹاک سے بند کر دیا گیا تھا۔ ساشا نے ریسیور رکھ کر کندھے اچکائے اور گنگناتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔ تاہم ذہن ابھی تک فون کال میں ہی الجھ رہا تھا۔

☆☆☆

چھبیس فروری!

آج وہ پورے دو دن بعد نیر آنٹی کی طرف آئی تھی وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو ہمیشہ کی طرح سناٹوں نے استقبال کیا۔ وہ دبے پاؤں کچن میں جھانکنے کے بعد آنٹی کے کمرے میں آ گئی۔ مگر کمرے میں بکھرے سامان کو دیکھ کر اسے جھٹکا لگا تھا۔ بیڈ پر صوفے پر حتیٰ کہ کارپٹ پر بھی کپڑے، جوتے، بیگ اور نجانے کیا کچھ بکھرا پڑا تھا۔ آنٹی کمرے میں نہیں تھیں۔ ساشا کپڑوں کے ڈھیر پھلانگتی ہوئی صوفے پر جگہ بنا کر بیٹھ گئی۔

"آنٹی کہاں جا رہی ہیں؟" وہ حیرت زدہ سی سوچنے لگی۔

"ارے ساشا! تم کب آئی ہو" آنٹی سٹور روم سے باہر نکل رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ

میں کپڑوں کی گٹھڑی تھی جسے انہوں نے کارپٹ پر رکھ دیا۔

"ابھی چند لمحے پہلے" اس نے خوش دلی سے بتایا "یہ ساز و سامان کس لیے بکھیرا ہے کس کا جہیز ہے یہ؟" وہ ہمیشہ کی طرح شگفتگی سے بولی تھی۔ آنٹی کے سامنے تو وہ کچھ زیادہ ہی خوش دلی کا مظاہرہ کرتی تھی۔

"یہ قائلہ اور توصیف کے کپڑے ہیں۔ آٹھ سال ہو گئے ہیں آج تک ہمت اور حوصلہ ساتھ نہیں دیتا تھا کہ ان کپڑوں کو نکال کر دیکھتی کل ماسی بتا رہی تھی کہ اس کی بیٹی کی شادی ہے۔ وہ کچھ کپڑوں کا کہہ رہی تھی۔ بری اور جہیز کے سارے کپڑے، جوتے ادھر ہی رکھ کر قائلہ چلی گئی تھی۔ توصیف نے کہا تھا۔ امی! میں اسے لے کر چند ہی دنوں میں واپس آ جاؤں گا۔ یہ نویلہ کی ضد تھی کہ رخصتی لندن میں ہو۔ میرے بیٹے نے اپنے قول کا بڑا پاس رکھا چند دن کا کہا تھا دوسرے دن رات دو بجے ہی لندن سے واپس آ گیا قائلہ کو ساتھ لے کر، تابوت میں بند خاموش، ساکت، بے جان بھلا ایسے بھی کوئی کرتا ہے" وہ لرزتی آواز میں کہہ رہی تھیں ان کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔

"یہ آپ نے بہت اچھا سوچا ہے کسی ضرورت مند کا بھلا ہو جائے گا" اس نے ماحول کی کثافت کم کرنا چاہی۔

"ہوں...... یہ دیکھو تو سہی" وہ بڑے شوق سے ایک ایک جوڑا بند ڈبوں میں سے نکال کر دکھا رہی تھیں۔ نجانے کتنے ارمانوں سے کتنے چاؤ سے انہوں نے بری کی تیاری کی تھی اسی پل ماسی آ گئی۔

ساشا کا دل ایک دم ہر شے سے گویا اچاٹ ہو گیا۔

وہ چپکے سے اٹھی اور عقبی صحن میں نکل آئی۔ وہ کل رات کا منظر سوچ رہی تھی۔

"کون ہے وہ اجنبی!" زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے نوشی سے قبرستان کے اس اجنبی کا ذکر نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

بارہ مارچ!

یہ ان دنوں کی بات تھی جب حسیب بھیا سامان وغیرہ اپنے گھر میں شفٹ کروا رہے تھے امی اور نوشی ایک دفعہ پھر سے شاپنگ کے لیے میدان میں اتر آئی تھیں۔ جس دن وہ لوگ اپنے اجلے اجلے نئے نکور گھر میں شفٹ ہوئے وہ دن بھی بڑا ہی یادگار تھا۔

امی نے قرآن خوانی کا اہتمام کروایا تھا نیر آنٹی نے بطور خاص شرکت کی تھی۔ وہ ساشا اور نوشی کے لیے بڑے خوب صورت سوٹ لائی تھیں اسی مبارک دن حسیب اور نوشی کی شادی کی تاریخ پکی کردی گئی تھی اور اسی رات ساشا کی متوقع ساس اسے انگوٹھی پہنا گئیں۔

دونوں طرف شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ امی اکلوتے بیٹے کی شادی دھوم دھام سے کرنا چاہتی تھیں مگر بھیا بے جا اسراف کے حق میں نہیں تھے اور امی بیٹے سے کم ہی اختلاف کرتی تھیں۔

جس دن نوشی اور بھیا کا نکاح ہونا تھا یہ اس سے چار روز پہلے کی بات تھی۔ جمیلہ آنٹی (جنہوں نے ساشا کا رشتہ طے کروایا تھا ان کی اچانک آمد نے امی کو بوکھلا کر رکھ دیا جمیلہ آنٹی کی آمد کا عقدہ بھی جلد ہی کھل گیا تھا نوشی کی زبانی ساشا تک بھی تازہ تازہ بریکنگ نیوز پہنچ رہی تھیں نوشی نے بتایا تھا کہ اس کی ساس ساشا کی بھی رخصتی چاہتی ہیں امی اور بھیا کو کوئی اعتراض نہیں تھا ان لوگوں کو جہیز وغیرہ کی ضرورت نہیں تھی مگر امی نے بالا ہی بالا بہت کچھ بنا رکھا تھا۔

پھر نوشی اور بھیا کے ولیمہ میں اس کی رخصتی سادگی سے کردی گئی تھی دوسری طرف سے سادگی سے نکاح کرنے کی ڈیمانڈ پر خاصا زور دیا گیا تھا سب کچھ اس قدر جلدی میں ہوا تھا کہ ساشا کو ہمیشہ کی طرح نکتہ چینی کرنے اور اعتراضات کی بوچھاڑ کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا امی کو اس کی کیڑے نکالنے والی عادت سے اچھی طرح سے آگاہی تھی تب ہی تو انہوں نے اس کی کسی بھی بات پر کان نہیں دھرے تھے حالانکہ وہ صرف اتنا چاہتی تھی کہ اس کی شادی بھیا کی شادی سے ایک ہفتہ بعد کی جائے تاکہ وہ اچھی طرح سے انجوائے تو کر سکے۔ مگر امی نے اس معاملے میں اس کی ایک نہیں سنی تھی پکڑ کر مایوں بٹھا دیا اس نے بھیا تو کیا اپنی بھی شادی کی کسی رسم کو انجوائے نہیں کیا تھا۔

جب نکاح کی رسم ادا ہو چکی اور اسے اسٹیج پر لے جا کر بٹھایا گیا تو اسے شدت سے احساس ہوا تھا کہ نیر آنٹی اردگرد کہیں بھی نہیں۔ وہ سخت بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ نوشی کے علاوہ کسی اور سے پوچھنا بھی محال تھا مگر نوشی بھی ولیمہ کی دلہن تھی اور اس وقت تو کسی اور ہی جہان میں پہنچی ہوئی تھی لبوں پر شرمیلی مسکراہٹ، گالوں پر گلابیاں بھیا کی محبت نے ایک رات میں ہی اسے کیسا نکھار بخش دیا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں نوشی کی نظر اتاری۔ مبادا اس کی اپنی ہی نظر نوشی کو نہ لگ جائے۔

بارات میں مختصر سے لوگ تھے صرف فیملی کے افراد، دولہا کے چند دوست، ان کی

بیویاں اس کی ساس، ایک نند اور بس۔

ساشا کو اتنی بھی سادگی کی توقع نہیں تھی ان کے گھر میں تو خاصا ہنگامہ تھا امی کا حلقہ احباب کافی وسیع تھا بھیا کے دوست وغیرہ امی کی کولیز، ان کی فیملیز مگر یہاں اس گھر میں سناٹوں نے گویا اس کا استقبال کیا تھا لگ ہی نہیں رہا تھا کہ نئی دلہن کی آمد ہوئی ہے چہار سو خاموشی اور مہیب سناٹا۔

اس کی نند روبی بیڈروم تک رہنمائی کر کے گئی تھی کافی سنجیدہ مزاج لڑکی تھی بلکہ اس کی ساس بھی بہت سنجیدہ مزاج رکھتی تھیں کم از کم ساشا نے منگنی اور شادی کے انتہائی مختصر دنوں میں ایک مرتبہ بھی اپنی ساس کے لبوں پر مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی اور نجانے حسن کا مزاج کیسا تھا۔

کمرے کی سجاوٹ میں بھی سادگی کی جھلک تھی گویا مکین کو کمرے کی خوبصورتی، سجاوٹ سے قطعاً دلچسپی نہیں تھی۔

کافی دیر کے انتظار کے بعد باہر کھٹکے کی آواز سنائی دی تھی ساشا نے تھکن سے بھرپور سانس خارج کی تھی کمرے کا دروازہ کھل چکا تھا ساشا سمٹ کر رہ گئی کچھ دیر پہلے کے تمام خیالات بھاپ بن کر اڑ گئے۔

حسن اس کے قریب بیٹھا تو ساشا کچھ اور خود میں سمٹ کر رہ گئی۔

''کافی انتظار کرنا پڑا ہے۔ اس کے لیے معذرت'' وہ اس کے قریب بیٹھ چکا تھا۔

اس کا سر مزید جھک گیا تھا اسے کوفت ہرگز محسوس نہیں ہوئی تھی تاہم گھر والوں کے رویے نے اسے اچھا خاصا الجھا دیا تھا روبی کمرے میں دوبارہ دکھائی نہیں دی تھی اور ممی تو اسے گھر لا کر نجانے کس کونے میں جا چھپی تھیں۔

ساشا نے سر اٹھا کر چور نظر سے حسن کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا حسن اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ وہ تو کسی طرف بھی نہ دیکھ رہا تھا اس کی نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر تھیں یوں لگتا تھا کہ وہ ذہنی طور پر حاضر نہیں۔

ساشا کا ہاتھ حسن کے ہاتھ کے نیچے دب کر رہ گیا تھا وہ سمجھ رہی تھی حسن ذہنی طور پر حاضر نہیں مگر اس کا خیال غلط تھا۔

''ایک بات کا تمہیں پتا ہے؟'' وہ بہت نرمی سے ساشا کی طرف بغیر دیکھے پوچھ رہا تھا۔

''کون سی بات؟'' ساشا کے لبوں نے حرکت کی تھی۔

''مجرم اور ملزم میں کیا فرق ہے؟'' ساشا ساکت ہو کر رہ گئی۔

''یہ حسن کیسی باتیں کر رہا ہے بہکی بہکی سی، کیا اس نے پی رکھی ہے۔ یا اللہ! میرے حال پر رحم فرما۔'' دل ہی دل میں اپنے رب کے حضور گڑگڑائی تھی۔

''بتاؤ نا، ساشا! یہ سوال مشکل تو نہیں'' حسن نے نرمی سے اس کے دونوں گالوں پر ہاتھ رکھ کے اصرار کیا تھا۔

''ملزم وہ ہوتا ہے جس پر الزام لگایا جائے اور مجرم اسے کہتے ہیں۔ جس کا جرم ثابت ہو چکا ہوتا ہے مگر یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' دھیرے دھیرے اس کا ازلی اعتماد بحال ہو ہی گیا تھا۔

''یہ بتاؤ، میں ملزم ہوں یا مجرم؟'' وہ بڑی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

''میں سمجھی نہیں''

''تم کیسے سمجھ پاؤ گی۔ میں بھی نجانے کیا فضول بکواس کر رہا ہوں۔ دفعہ کرو، یہ بتاؤ کہ میں تمہیں کیسا لگا؟'' حسن نے شاید مسکرانے کی کوشش کی تھی جبکہ اس کی آنکھوں نے اس مسکراہٹ کا ہرگز ساتھ نہیں دیا تھا۔

''اگر یہی سوال میں آپ سے پوچھوں'' ساشا نے بھرپور اعتماد سے پوچھا۔

''تو میں کہوں گا تم بہت خوبصورت ہو'' اس نے بے ساختہ اس کے ہاتھ چومے تھے۔

''اور میں اس تعریف کے بدلے میں کچھ تعریف کر دوں گی'' ساشا ہولے سے مسکرائی۔

''تم اچھی باتیں کرتی ہو'' وہ مسکرایا۔

''آپ نے میری باتیں کہاں سنی ہیں'' وہ حیرانی سے بولی۔

''زندگی رہی تو سنتا رہوں گا۔ ابھی میں نماز پڑھ لوں'' حسن نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے تھے۔

''کون سی نماز؟'' ساشا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''دو رکعت نماز...... اللہ تعالیٰ سے آئندہ زندگی کے لیے بہتری اور بھلائی مانگنا ہے۔ پھر آپ کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز......'' وہ مسکرایا تھا۔ ساشا اس کی ذو معنی بات کا مفہوم سمجھ کر شرم سے سر جھکا کر رہ گئی اور وہ ساتھ والے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

حسن اس کے لیے بہترین شوہر ثابت ہوا تھا بے حد خیال رکھنے والا، بے حد چاہنے والا۔ وہ تقریباً روزانہ ہی امی کی طرف آ جاتی تھی ڈیڑھ، دو گھنٹے نوشی کی ہمراہی میں گزارتی

اور پھر حسن کے ساتھ ہی واپس بھی آ جاتی۔ اس معاملے میں اس کی ساس کچھ نہیں بولتی تھیں بلکہ وہ تو کسی بھی معاملے میں نہیں بولتی تھیں۔ ان کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزرتا تھا وہ بیڈ روم سے بہت کم کم ہی نکلتی تھیں کھانا بھی اکثر اپنے کمرے میں منگوا لیتیں۔

یہ ہی حال روبی کا بھی تھا عجیب موڈی سی لڑکی تھی جس طرح سے وہ اور نوشی ایک دوسرے سے بے تکلف تھیں ایسی دوستی روبی کے اور اس کے درمیان نہیں ہو سکی تھی وہ اپنے آپ میں مگن رہتی تھی موڈ ہوتا تو باہر نکل آتی۔ دل چاہتا تو اس سے بات کر لیتی، ورنہ اس کی اپنی بے شمار مصروفیات تھیں۔

ممی کا ارادہ یو کے واپس جانے کا نہیں تھا وہ اپنی باقی زندگی اپنے ملک میں گزارنا چاہتی تھیں دو بیٹیاں لندن میں خوش گوار ازدواجی زندگی گزار رہی تھیں حسن تین فرانچائز کا اونر تھا یعنی وہ بھی مستقل پاکستان میں ہی رہنا چاہتا تھا یہ خبر روزینہ بیگم اور ساشا کے اطمینان کے کافی تھی۔

اس دن بھی حسن اسے امی کی طرف چھوڑ گیا تھا نوشی اسے دیکھ کر خوش ہو گئی تھی اور فوراً ہی کچن میں جا گھسی تھی۔

''کن کاموں میں الجھنے لگی ہو'' ساشا بھی بولتے ہوئے کچن میں داخل ہوئی ''یار! میرے لیے تردد مت کرنا، میں مہمان تھوڑی ہوں''

''مہمان نہیں ہو، مگر مہمانوں کی طرح سے آتی ہو'' نوشی پر تکلف چائے کا اہتمام کرنے لگی تھی۔

''تم سمجھتی کیوں نہیں ہو یار! آج میں اور حسن باہر ڈنر کریں گے''

''اب پھوٹی ہو'' نوشی نے مصنوعی خفگی سے کہا تھا ''بہر حال، چائے تو پینا پڑے گی میں اپنے اور امی کے لیے بنا رہی تھی'' ساشا حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی ہمیشہ کی ست الوجود نوشی نے اپنی ساری ذمہ داریاں اچھی طرح سے سنبھال لی تھی وہ امی کا بے حد خیال رکھتی تھی ساس، بہو میں کمال کی بے تکلفی تھی میکے کا خوشگوار ماحول ساشا کے لیے طمانیت کا باعث تھا۔

''تم سناؤ، روبی اور آنٹی تمہارا خیال تو رکھتی ہیں؟'' نوشی نے وہ سوال پوچھ ہی لیا تھا جس سے ساشا بچنا چاہ رہی تھی۔

''ہوں'' اس نے محض ہنکارا بھرا ''یار نوشی! میں ممی اور روبی کے مزاج کو سمجھ نہیں پائی ہوں عجیب سرد سے رویے ہیں ان کے خود سے بلاؤں تو بولیں گی ورنہ تو انہیں یاد ہی نہیں ہوتا کہ

گھر میں ایک نئے فرد کا اضافہ ہو چکا ہے'' کچھ سوچ کر اس نے نوشی سے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر ہی لیا تھا۔

''اور حسن بھائی کا کیسا رویہ ہے؟ اپنی ماں اور بہن کے ساتھ'' نوشی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''یہ ہی بات تو مجھے الجھا کر رکھ دیتی ہے کہ ان تینوں میں غیر ضروری تو کیا انتہائی ضروری بات بھی نہیں ہوتی اتنے دنوں میں آج تک میں نے روبی، ممی یا حسن کو ایک دوسرے سے بولتے نہیں دیکھا۔ نہ جانے ان کے ساتھ مسئلہ کیا ہے'' وہ سخت الجھن کا شکار تھی اور اس الجھن کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا۔

''حسن بھائی تمہارے ساتھ بہت اچھے ہیں۔ خواہ مخواہ خود کو مت الجھاؤ'' نوشی نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تھا'' کیا خبر، ان کے مزاج ہی ایسے ہوں''

''نوشی! کچھ تو انہونا ضرور ہے۔ میری چھٹی حس کچھ اور ہی کہہ رہی ہے'' ساشا کا انداز پرسوچ تھا ان ہی چھوٹی چھوٹی باتوں کے درمیان وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا تھا شام کے سائے بڑھنے لگے تھے حسن نے سات بجے اسے لینے کے لیے آنا تھا مگر اس وقت آٹھ بج رہے تھے اسے فطری سی پریشانی نے گھیر لیا۔ وہ بار بار حسن کے نمبر پر ٹرائی کر رہی تھی، مگر نہ جانے نیٹ ورک میں کوئی پرابلم تھی یا پھر حسن نے سیل فون آف کر رکھا تھا۔

اب تو امی اور نوشی کو بھی تشویش ہو چلی تھی حسیب بھیا بھی گھر آچکے تھے اسے پریشان دیکھ کر نرمی سے کہنے لگے۔

''کیا خبر، وہ مصروف ہو یا کسی کام میں پھنس گیا ہو۔ میں چینج کر لوں، پھر تمہیں چھوڑ آتا ہوں''

وہ اسے تسلی دے کر اٹھ گئے تھے حسن ایسا لاپروا تو ہرگز نہیں تھا کم از کم ایک فون ہی کر دیتا نہ جانے کون سی مصروفیت نے روک رکھا تھا ایک امکان تو یہ بھی تھا شاید وہ گھر آچکا ہو ان ہی سوچوں کے درمیان وہ الجھی بیٹھی تھی، جب حسن کا فون آگیا۔ ساشا کب سے خوف زدہ بیٹھی تھی اس کی آواز سنتے ہی گویا پھٹ پڑی۔

''کہاں ہیں آپ؟''

''میں گھر میں ہوں'' حسن نے اطمینان سے کہا تھا۔

''گھر میں؟'' وہ حیران رہ گئی'' مجھے لینے کے لیے کیوں نہیں آئے؟ میں کب سے

انتظار کر رہی ہوں''

''آج شاید میں نہ آسکو۔ کچھ مصروف ہوں۔ تم رات وہیں رک جاؤ، صبح تمہیں لینے آجاؤں گا ویسے بھی شادی کے بعد تم میکے میں ایک رات بھی نہیں ٹھہری ہو۔ آنٹی بھی کیا سوچتی ہوں گی میں نے ان کی بیٹی پر قبضہ کر رکھا ہے'' حسن اگرچہ ہلکے پھلکے لہجے میں کہہ رہا تھا تاہم ساشا کو محسوس ہو رہا تھا اس کے لہجے میں شگفتگی مفقود ہے۔

''میں بھیا کے ساتھ آجاتی ہوں''

''ارے، انہیں کیوں زحمت دے رہی ہو۔ کہا تو ہے، صبح لینے آجاؤں گا۔ بھئی اتنی بے قراری'' وہ شاید مسکرایا تھا یا پھر مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

''زحمت کیسی؟'' ساشا نے بمشکل ناگواری دبائی۔

''میں آج رات کہیں جا رہا ہوں اگر تم گھر آنا چاہتی ہو تو شوق سے آجاؤ، تمہاری تنہائی کے خیال سے کہہ رہا تھا ممی اور روبی تمہیں کمپنی دیں گی، یہ تو تم کبھی خواب میں بھی مت سوچنا، بہرحال میں ابھی گھر سے نکل رہا ہوں۔ اللہ حافظ'' حسن نے مزید کچھ سنے بغیر فون رکھ دیا تھا ساشا اور بھی الجھ کر رہ گئی۔

''آج کی رات یہ کہاں جائیں گے'' وہ سوچوں کے تانوں بانوں میں الجھ رہی تھی

''کوئی کام ہوگا، میں بھی نہ جانے کیا کیا سوچتی رہتی ہوں'' ساشا خود کو ڈپٹ کر نوشی کو آوازیں دیتی کچن میں چلی گئی۔

☆☆☆

تیس مارچ!

دوسرے دن اس کا ذرا بھر ارادہ نہیں تھا گھر جانے کا وہ تھوڑی بہت ناراضی حسن پر جتلانا چاہتی تھی اپنے پروگرام کے تحت دن بھر اس نے اور نوشی نے خوب شاپنگ کی تھی نوشی اسے اپنی کسی سہیلی کے گھر لے گئی تھی واپسی پر نوشی نے سوچا کہ کیوں نہ حیات کالونی کا چکر لگا لیا جائے۔ وہ اپنی امی سے ملنا چاہتی تھی اور ساشا بھی نیر آنٹی سے ملنے کے لیے بے تاب ہو گئی تھی بہرحال ان لوگوں کا اچھا وقت ان کی انیکسی میں گزر رہا تھا اور ساشا کو تو آنٹی کسی اور حوالے سے بھی بہت عزیز ہو گئی تھیں۔

ماسی نے اسے دیکھتے ساتھ ہی گیٹ کھول دیا تھا یہ ان کی گھریلو خاندانی ملازمہ تھی

رات کو بھی آنٹی کے پاس ہی سوتی تھی ماسی کے بیٹے اور بہو سرونٹ کوارٹر میں رہائش پذیر تھے۔

ماسی کی ہمراہی میں وہ آنٹی کے بیڈروم تک آئی تھی وہ بیڈ پر نیم دراز تھیں اور چہرے سے کچھ بیمار بھی لگ رہی تھیں اسے دیکھتے ساتھ ہی گویا کھل اٹھیں۔

''میری بیٹی آئی ہے'' انہوں نے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر چوما تھا۔

''میں آپ سے سخت ناراض ہوں'' وہ ان کے قریب بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''میں ضرور جاننا چاہوں گی کہ آپ میری شادی میں کیوں نہیں آئی تھیں''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی'' صاف نظر آرہا تھا کہ وہ ٹالنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

''شادی کے بعد ہی آجاتیں آپ میرے گھر بھی نہیں آئیں حسن سے بھی نہیں ملیں میں حسن کو آپ سے ملوانے کے لیے یہاں لے کر آؤں گی''۔

''حسن تمہارے ساتھ خوش ہے؟'' انہوں نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں پوچھا عجیب سا سوال تھا اور عجیب انداز بھی۔

''جی...... بہت خوش ہیں، اور مجھے بہت خوش رکھتے ہیں'' وہ بغیر ان کی بات کا مفہوم سمجھے بولی ''اللہ تم دونوں کو ہمیشہ خوش رکھے۔ سلامت رہو، شاد و آباد رہو، تمہیں حسن کی طرف سے کوئی دکھ نہ ملے'' نہ جانے کیوں ان کی آنکھیں نم سی ہو گئیں۔

''حسن بہت اچھے ہیں آنٹی! میرا بہت خیال رکھتے ہیں مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں'' وہ کسی اور ہی جہان میں گم تھی۔

''اس کا دل بدل گیا ہے شاید، چلو، اچھا ہوا اس کی شخصیت کے بگاڑ سنور گئے'' ان کی آواز سرگوشی نما تھی۔

''میں سمجھی نہیں آنٹی!'' ساشا نے ان کی سرگوشی نما آواز سن لی تھی اور اسے گویا جھٹکا سا لگا۔

''کک...... کچھ نہیں'' وہ گھبرا گئیں۔

''آپ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں'' ساشا نے وثوق سے کہا۔

''نہیں، کچھ بھی تو نہیں''

''آنٹی! کیا آپ مجھے اپنی بیٹی نہیں سمجھتیں، آپ مجھے'' وہ لب کچلتے ہوئے ان گھٹنوں پر ہاتھ رکھے بول رہی تھی۔ جب دروازہ کھول کر نوشی چلی آئی۔ نوشی کی آمد کے ساتھ گفتگو کا موضوع بدل گیا تھا۔ وہ کچھ دیر مزید بیٹھی تھیں امی کی بار بار کالز آرہی تھیں اسی لیے جلد

ہی اٹھ گئیں حالانکہ ساشا ابھی نیر حیات سے کچھ اور بھی پوچھنا چاہتی تھی، مگر پھر کسی اور وقت پر ٹال کے نوشی کے پیچھے چلی گئی۔

وہ گھر آئی تو حسن کو موجود پا کر حیران ہی رہ گئی۔

''آپ کب آئے؟''

''کچھ دیر پہلے'' وہ اسے دیکھتے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا تھا ''چلیں؟''

''کھانا تو کھالیں'' نوشی جو پرس پھینک کر کچن کی طرف بھاگ گئی تھی، انہیں اٹھتا دیکھ کر چلائی۔

''مجھے کام سے جانا ہے، دیر ہو جائے گی'' حسن نے شائستگی سے معذرت کر لی تھی گھر آنے کے بعد حسن کو بیڈ پر لیٹتے دیکھ کر وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی ''آپ نے شاید کہیں باہر جانا تھا؟''

''نہیں'' وہ بیڈ پر لیٹ چکا تھا ''کام تو ہے، مگر گھر سے باہر نہیں'' وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

''کیسا کام؟'' ساشا چادر تہہ کرتے ہوئے بولی۔

''تمہیں دیکھنے کا، تم سے باتیں کرنے کا''۔

''فرصت مل گئی ہے آپ کو، مجھے دیکھنے کی اور مجھ سے باتیں کرنے کی'' اس نے طنزیہ کہا تھا۔

''تمہارے لیے تو فرصت ہی فرصت ہے'' حسن نے اسے اشارے سے اپنی طرف بلا رہا تھا اس نے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا۔

''یہ مکالمے بازی میرے ساتھ مت کیجیے''۔

''تو کس سے کروں؟'' وہ بڑی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

''جس کے پاس رات گزار کر آئے ہیں'' اصل غصہ بس اسی بات پر تھا۔

''بھلا کس کے پاس'' حسن کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

''ہو گی کوئی، آپ کی ہوتی سوتی'' اس نے مصنوعی ناراضی سے جتایا۔

''ارے ارے اتنا غصہ!'' حسن نے اسے بازو سے کھینچ کر اپنے پاس بٹھالیا۔

''چھوڑیں مجھے''

''نہ چھوڑوں تو'' وہ جان بوجھ کر اسے تاؤ دلا رہا تھا۔

''تو میں شور مچا دوں گی''

''یہ کر کے بھی دیکھ لو افسوس، تمہاری مدد کو کوئی نہیں پہنچے گا'' حسن نے مصنوعی تاسف کا اظہار کیا۔

''کیوں! ممی اور روبی ہیں نا''

''ان سے امیدیں وابستہ مت کرو'' حسن نے لاپرواہی سے کہا ''ممی اور روبی ہمارے معاملے میں ہرگز نہیں بولیں گی''

''ممی کا رویہ ایسا کیوں ہے؟'' ساشا تو کب سے بے چین تھی حسن سے ممی کے مزاج پر گفتگو کرنے کے لیے۔ آج تو خوش قسمتی سے حسن نے خود ہی اس موضوع کو چھیڑ دیا تھا۔

''کیسا رویہ؟'' حسن چونکا۔

''یہی کہ ممی تو کسی معاملے میں نہیں بولتیں سارا گھر میرے سپرد کر کے بری الذمہ ہو چکی ہیں ممی نے ایسا کیوں کیا؟''

وہ حیران تھی، شادی کے تیسرے روز ممی نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا تھا وہ بہت سنجیدہ تھیں یا پھر ہمیشہ سے ہی ان کا مزاج ایسا تھا سرد، خاموش اور اجنبی سا، انہوں نے اس کے سلام کے جواب میں محض سر ہلایا تھا نہ پیار کیا، نہ بیٹھنے کو کہا۔ دوٹوک بات کی، صرف تین سیکنڈ میں۔ دراز میں سے گھر کی چابیاں نکال کر اس کی طرف بڑھا دیں۔

''یہ گھر آج سے تمہارا ہوا سیاہ و سفید کی مالک ہو۔ جو چاہو کرو، جیسے چاہو برتو، کچن بھی کھلا پڑا ہے اپنی مرضی سے جو دل چاہے پکاؤ، کھاؤ...... اپنی زندگی جیسے مرضی چاہے گزارو۔ کہیں آنے جانے کے لیے مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں یہ گھر، یہ گھر ہستی اب تمہاری ذمہ داری ہے۔ ہم نے ریٹائرمنٹ لے لی نہ جانے کتنے سالوں سے دل اچاٹ ہو گیا ہے دنیا سے، اور اس دنیا کے جھمیلوں سے۔ اب تو سانسیں گن رہے ہیں۔ اب تم جاؤ، ہمیشہ خوش رہو، آباد رہو، نیک ماں، باپ کی اولاد ہو۔ خوش قسمتی سے ہمارے نصیب میں آئیں''

یہ گفتگو ممی کی طرف سے پہلی اور آخری تفصیلی گفتگو تھی۔ اس کے بعد ساشا نے نہ انہیں بولتے دیکھا تھا نہ سنا تھا حتیٰ کہ روبی سے بھی وہ کم کم ہی بولتی تھیں۔

روبی کا کردار بھی عجیب تھا شوہر سے ناراض ہو کر آئی تھی۔ ابھی تک یہ ناراضی ختم نہیں ہوئی تھی سو فی الحال اس کا قیام میکے میں ہی تھا۔ البتہ حسن کی یہ ضرور خواہش تھی کہ روبی اپنے شوہر

کے پاس یو کے چلی جائے اور اس موضوع پر دونوں بہن، بھائی میں اکثر بات چیت ہوتی تھی۔

''تمہیں روایتی ساس نہیں ملی۔ شکر ادا کیا کرو'' حسن نے پیار سے اس کے گالوں پر جھولتی لٹ کھینچا۔

''لیکن ان کا رویہ آپ سے بھی اتنا روڈ کیوں ہوتا ہے بے حد سرد اور اجنبی۔ کیا وہ آپ کی اسٹیپ مدر ہیں؟'' اس نے بے حد سنجیدگی سے اپنی الجھن کو رفع کرنا چاہا تھا مگر حسن کو ہنستے دیکھ کر وہ مصنوعی خفگی سے قدرے دور ہٹ گئی۔

''میں نے کافی سنجیدہ سوال پوچھا ہے؟''

''میں بھی سنجیدہ ہوں ویسے یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟'' وہ مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائے پوچھ رہا تھا۔

''کیا یہ سچ ہے؟'' ساشا بے حد حیران ہوئی۔

''ارے نہیں'' وہ بے اختیار ہنس پڑا ''ممی میری حقیقی والدہ ہیں''

''مگر ان کا رویہ'' ساشا پھر سے الجھی۔

''تمہیں ان کے رویے سے کیا لینا دینا خوش رہا کرو، خواہ مخواہ دوسروں کے مزاج سمجھنے میں خود کو ہلکان مت کرو۔ میری طرف دھیان دو، کچھ فائدہ بھی ہوگا'' وہ پھر سے اسے اٹھتا دیکھ کر شرارت سے بولا۔

''میں ایسے فائدے سے بے فائدہ ہی بھلی'' ساشا نے ننھی سی ناک چڑھائی۔

''ڈنر نہیں کرنا؟'' وہ اسے لالچ دے رہا تھا۔

''کھانا تیار ہے'' ساشا کہاں باتوں میں آنے والی تھی۔

''میں اس دیسی مینیو کی بات نہیں کر رہا۔ سیون اسٹار میں ڈنر پکا۔ ذرا اس دل کے بہلانے کا سامان تو کرو''

''آپ کے دل کا کوئی بھروسہ نہیں۔ موڈ کی طرح بدلتا ہے'' ساشا نے نرم الفاظ میں بہت کچھ جتا دیا تھا سچ تو یہ تھا کہ وہ اس گھر کے تینوں افراد کو قطعاً سمجھ نہیں پائی تھی۔ حسن اس کے لیے بہت اچھا تھا خیال رکھتا تھا محبت کرتا تھا مگر اس کے باوجود کچھ تو تھا ہی جو غیر واضح تھا مبہم تھا۔ پوشیدہ تھا۔

حسن کی شخصیت میں بہت توازن تھا وہ سلجھا ہوا بے حد شفاف سوچ رکھنے والا انسان

تھا اور ساشا حیران ہوتی تھی کہ کیا یو کے میں پیدا ہونے والا اور وہیں کے ماحول میں پوری زندگی گزارنے والے سب ہی حسن کی طرح ہوتے ہیں۔ نمازی، پرہیزگار۔ اس میں ذرہ بھر دکھاوا نہیں تھا بے حد خاموش طبع، سنجیدہ مزاج، قانع اور عجز وانکساری کا پیکر۔

اور یہ ہی بات ایک دفعہ اس نے نوشی سے شیئر کر لی تھی نوشی نے اس کی توقع کے عین مطابق پہلے تو بری طرح گھورا تھا اور پھر ہمیشہ کی طرح سمجھانے لگی۔

''تم بے کار کے خدشات پال رہی ہو۔ آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟''

''مسئلہ میرے ساتھ نہیں۔ حسن اور اس کی فیملی کے ساتھ ہے اور تم مان جاؤ ان لوگوں کا آپس کا بی ہیویر بھی نارمل نہیں'' وہ سنجیدہ تھی، بے حد سنجیدہ۔

''خواہ مخواہ شک میں پڑ رہی ہو۔ حسن بھائی تمہارے ساتھ اچھے ہیں۔ تمہیں اور کیا چاہئے'' نوشی کا انداز ناصحانہ تھا۔

''پرابلم حسن کے ساتھ بھی ہے'' ساشا سمجھ نہیں پارہی تھی کہ کیسے نوشی سے اپنے خدشات کا ذکر کرے۔

''کیا مطلب'' نوشی چونکی۔

''کچھ نہیں'' اس نے پھر سے بات ٹال دی تھی۔ اب تک تو وہ خود عجیب تذبذب کا شکار تھی کیونکہ حسن نے سچ مچ اسے ''شک'' میں مبتلا کر دیا تھا۔

☆☆☆

رات کا دوسرا پہر شروع تھا جب کھٹکے کی معمولی سی آواز سے ساشا کی نیند ٹوٹ گئی اس نے مندی مندی آنکھیں کھول کر دیکھا حسن اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔

''آپ سوئے نہیں؟'' وہ بمشکل نیند کو بھگاتے ہوئے بولی۔

''کچھ کام تھا میں اسٹڈی روم میں ہوں، تم سو جاؤ'' اس کے ہاتھ میں فائلیں تھیں اور وہ ہمیشہ کی طرح رات کے دوسرے پہر اسٹڈی روم میں شاید آفس کا کچھ کام کرنے جا رہا تھا کمرے کی لائٹ وہ اس لیے نہیں جلاتا تھا کہ ساشا کی نیند میں خلل نہ پڑے۔ ساشا جانتی تھی کہ دو، چار گھنٹے کی نیند لینے کے بعد دوبارہ نہیں سوتا۔ کمپیوٹر کے ساتھ مصروف رہتا ہے یا پھر فائلوں میں۔ دوبارہ وہ کمرے میں فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد ہی آتا تھا تب تک ساشا سوئی ہوتی تھی۔ یہ ہی اس کا معمول تھا شادی کے بعد سے لے کر اب تک، اور ساشا اس معمول کی عادی تھی مگر

اب اسے یہ معمول بھی خاصا کھٹک رہا تھا۔

''آفس کا کام گھر میں لانے کی ضرورت نہیں۔ فائلیں اٹھا کر لے آتے ہیں۔ دفتری کام وہیں ختم کر کے آیا کریں''

وہ سخت تپ رہی تھی کیونکہ رات کو پھر سے وہ فائلیں اٹھا کر اسٹڈی روم میں گھس گیا تھا ساشا کو حد درجہ غصہ آیا وہ بغیر سوچے سمجھے دروازہ کھٹکھٹانے لگی تھی۔ مگر مجال ہے جو حسن نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی ہو۔ اصل غصہ تو اسے لاک لگانے پر آیا تھا۔ اتنی دفعہ دستک دینے کے باوجود حسن نے دروازہ نہیں کھلا تھا اور اس کا ماتھا تو بہت پہلے سے ہی ٹھنک گیا تھا مگر اب کچھ اور باتیں واضح ہو رہی تھیں اور بہت سی باتیں وضاحت طلب تھیں۔ صبح حسن کے بیڈروم میں داخل ہونے سے پہلے وہ نہ صرف اٹھ چکی تھیں بلکہ مزاج بھی خاصا برہم تھا۔

''صبح صبح انگارے کیوں چبا رہی ہو'' وہ اپنی بے حد سرخ اور سوجے پپوٹوں والی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے دبا رہا تھا۔

''رات رات بھر جاگنے کا یہ ہی انجام ہوتا ہے نیند پوری نہ ہو تو صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی'' اسے اپنے لہجے کو نرم کرنا پڑا تھا کیونکہ مقابل کا انداز ہی اس قدر نرم اور میٹھا ہوتا تھا۔

''مگر میں تو نیند پوری لیتا ہوں یہ ہی میرا معمول ہے دو چار گھنٹوں سے زیادہ مجھے نیند نہیں آتی'' اس کا انداز پہلے کی طرح سادہ تھا ''ناشتا ملے گا'' بات بدلنے میں بھی اسے کمال حاصل تھا۔

''ناشتا تو ملے گا، مگر یہ تو بتایئے، میں نے اتنی مرتبہ ناک کیا تھا، آپ نے دروازہ کیوں نہیں کھولا؟ آوازیں بھی دیں'' ساشا نے کمبل تہہ کرتے ہوئے شکوہ کر ہی دیا۔

''تم نے'' حسن کو اس نے واضح ٹھٹکتے دیکھا۔

''تم نے ناک کیا؟''

''تو اور کیا..... مگر آپ تو لگ رہا تھا گویا گھوڑے بیچ کر سو گئے ہیں'' وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

''ہاں، میں واقعی سو گیا تھا۔ سر میں درد تھا سو ٹیبلٹ لے کر سو گیا تھا'' حسن نے مزید اس کی جرح سے بچنے کے لیے واش روم کی طرف قدم بڑھا دیے تھے اور ساشا سچ مچ ٹھٹک گئی۔

☆☆☆

گیارہ اپریل!

آج موسم بہت خوشگوار تھا جاتی سردیوں کے دن تھے دھوپ میں خاصی تپش اور چبھن محسوس ہونے لگی تھی مگر رات بھر ہونے والی بارش نے ہر شے کو شادابی بخشی تھی اور آج تو ساشا کو حیرتوں کے جھٹکے لگ رہے تھے کیونکہ ممی اور روبی بھی لان میں آ کر بیٹھ گئی تھیں سو اسی حساب سے ساشا نے چائے پر کافی اہتمام کر لیا تھا۔

جوں ہی وہ چائے لے کر لان میں پہنچی، دونوں ماں، بیٹی نے اسے دیکھتے ساتھ ہی گویا لب سی لیے، مگر ساشا نے بھی ٹھان رکھی تھی کہ آج تو ضرور ہی ان کے درمیان بیٹھے گی پہلے پہل وہ ان کے سرد رویے کو دیکھ کر خود ہی پیچھے ہٹ گئی تھی مگر اب ان الجھی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے اسے خود سے ہی کوئی قدم اٹھانا تھا۔

''حسن نہیں آیا؟'' وہ جو گفتگو کی شروعات کے لیے مناسب الفاظ سوچ رہی تھی۔ ممی کو بولتے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ممی نے ساشا کو مخاطب کیا تھا۔

''نہیں'' اس نے اپنی حیرت پر قابو پا کر جواب دیا۔

''ادھر چلا گیا ہوگا'' روبی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا اس سے پہلے وہ ٹرالی کی طرف متوجہ تھی۔

''اب کیا فائدہ'' ممی نے اک گہری طویل سے سانس خارج کی۔

''یہ کیسی سزا ہے ممی! یہ کیسا سفر ہے؟ جس کا اختتام کوئی نہیں'' روبی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ ٹرالی میں رکھ دی تھی۔ اس کا لہجہ دکھ سے بوجھل تھا۔

''تم ٹھیک ہو؟'' ممی نے بات بدل دی تھی اب وہ پھر سے ساشا کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''جی، میں ٹھیک ہوں'' وہ ان کی بات کا مفہوم نہیں سمجھی تھی۔ روبی اس کی سادگی پر بے ساختہ ہنس پڑی۔

''کوئی خوشخبری ہے؟'' ساشا نے حیرت انگیز طور پر ممی کے چہرے پر چمکتی مسکراہٹ کو دیکھا۔

''ایسا تو کچھ نہیں'' وہ جھینپ کر رہ گئی تھی۔

''اچھا...... ایک بات بتاؤ'' روبی نے مسکرا کر کہا۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''حسن تمہیں کیسا لگا ہے؟''

''نائس'' اس سے زیادہ بھلا وہ کیا کہتی۔ سوال بھی عجیب تھا اور جواب بھی مختصر۔ کم از کم روبی کے منہ سے یہ سوال اسے بہت ہی عجیب لگا تھا۔

''ہماری بہو بہت اچھی ہے'' ممی نے گویا خود کلامی کی تھی ''منع بھی کیا تھا اس کے باوجود ہر کام میں اجازت لیتی ہے۔ کچھ پکانا ہو یا چاہیے باہر جانا ہو۔ حتیٰ کہ میکے میں بھی۔ اس کی فرماں برداری مجھے اچھی لگتی ہے۔ حسن خوش نصیب ہے اور ہم بھی'' ساشا تو اس تعریف پر دنگ رہ گئی تھی اور جب ممی نے اس کے ماتھے کو چوم کر دعا دی تو اس محبت پر اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

☆☆☆

انیس اپریل!

آج پھر وہی ہوا تھا۔ ساشا، حسن کے اٹھتے ساتھ ہی بستر چھوڑ کر کھڑی ہو گئی تھی اس نے معمول کے انداز میں اسٹڈی کا دروازہ بند کر لیا تھا ساشا نے کچھ سوچ کر دروازے پر دستک دی۔ مگر دوسری طرف ہمیشہ والی خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا اس کی متواتر دستک کے جواب میں بھی خاموشی۔ ساشا کو عجیب سی گھبراہٹ نے گھیرے میں لے لیا تھا۔

''حسن! دروازہ کھولیں نا'' اس کی آواز میں عجیب سی بے بسی تھی۔ پورا گھنٹہ دروازے کے سامنے کھڑے رہنے کی وجہ سے اس کی ٹانگیں شل ہو کر رہ گئی تھیں۔ یوں ہی کھڑے کھڑے اس کے دماغ میں کلک سے کچھ روشن ہوا تھا اور وہ دوسرے ہی پل لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ رات کے سناٹے میں وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی کوٹھی کے پچھلے صحن کی طرف آ گئی۔ اس کے اندازے کے عین مطابق اسٹڈی کا ایک دروازہ پچھلی طرف بھی کھلتا تھا۔ برابر میں تازہ ہوا کے لیے کھڑکی بھی موجود تھی اس نے کھڑکی سے اندر جھانکنے کی بھرپور کوشش کی تھی پھر مایوس ہو کر دروازے کی طرف پلٹی اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ دروازہ لاک نہیں تھا اس نے ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔

''حسن کہاں ہیں'' اس کا دل گویا دھک سے رہ گیا تھا حسن کی فائلیں، لیپ ٹاپ، گلاسز، سب میز پر رکھے تھے مگر وہ خود کہاں تھا؟ اس کا دماغ گویا سنسنا اٹھا۔ دل کی حالت بھی عجیب تر تھی۔ وہ لرزتی ٹانگوں کو گھسیٹتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوئی تو ایک اور جھٹکا اس کا منتظر تھا۔ ممی صوفے پر بیٹھی تھیں ان کے پیروں کے قریب حسن بیٹھا تھا اور وہ دونوں رو رہے تھے۔

''ممی! معافی کیوں نہیں ملتی؟ میں کب بری ہوں گا۔ میں کب اس گناہ کی سزا سے

بری ہوں گا۔ آپ تو ماں ہیں ممی! مجھے معافی لے دیں۔ اللہ کا واسطہ ہے، مجھے معافی لے دیں۔ مجھے اپنی زندگی جینا ہے، مجھے خوش رہنا ہے، میں خوش رہنا چاہتا ہوں۔ مگر خوشی مجھ سے دور بھاگتی ہے'' حسن کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا حد سے زیادہ شکستہ۔

''آپ نے میرے ساتھ ظلم کیا ہے ساشا کے ساتھ ظلم کیا ہے۔ ایک زخمی دل رکھنے والے انسان کو اس سے نتھی کر دیا'' وہ اونچا پورا مرد رو رہا تھا۔

''آپ مجھے معافی کیونکر دلوائیں گی۔ آپ نے تو خود مجھے معاف نہیں کیا۔ مجھ سے بولتی نہیں۔ میری طرف دیکھتی نہیں۔ پھر آپ نے میری شادی کیوں کی؟ مجھے تنہا ہی جلنے دیتیں۔ اس بے قصور، انجان لڑکی کو کیوں اس بھڑکتے برزخ میں لے آئی ہیں؟''

''میں تجھے خوش دیکھنا چاہتی ہوں'' ممی کے لبوں کا قفل ٹوٹ گیا ''میں چاہتی ہوں، تو آباد ہو جائے، تو میرا اکلوتا بیٹا ہے، خون جگر سے سینچا ہے، میں تیری ماں ہوں، کیا کروں، اس ممتا سے لبریز دل کو پتھر نہیں کر سکتی''

''تو ''ان'' سے کہیں مجھے معاف کر دیں۔ میرا دل مطمئن کیوں نہیں ہوتا'' وہ بچوں کی طرح مچل رہا تھا۔

''انہوں نے بھی تمہیں معاف کر دیا ہے آج سے بہت سال پہلے۔ اسی لیے تو آج میرے سامنے ہو'' ان کا لہجہ بھی بہت ٹوٹا ہوا تھا۔

''ان کے ''دل'' نے مجھے معاف نہیں کیا ممی! مجھے معافی چاہیے۔ میرا رب بھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔ میری نمازیں، میری عبادتیں سب بے کار ہیں''

ممی کے دونوں ہاتھوں پر اپنا چہرہ رکھ کر بے تاشا رونے والے حسن کو اس نے اس انداز میں پہلے بھی تو دیکھا تھا۔ کہاں؟ کس جگہ؟ کب؟ ساشا کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ ہٹ گیا اور وہ بے جان سی دروازے کے قریب بیٹھتی چلی گئی۔ تب اس کے چہرے پر داڑھی تھی، مگر اب نہیں۔

☆☆☆

پچیس اپریل!

نوشی کا فون آیا تھا اور وہ اس کا فون سن کر ایک دم بے تاب سی ہو گئی۔ فوراً کپڑے تبدیل کیے تھے دوپہر کے لیے کھانا تو وہ بنا ہی چکی تھی ممی سے اجازت لے کر وہ گھر سے نکلنے ہی

لگی تھی جب نوشی کا پھر سے فون آ گیا۔

''ساشی! نیر آنٹی کی طرف کل چلیں گے۔ میں امی کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جا رہی ہوں آج ان کے چیک اپ کی ڈیٹ ہے مجھے ابھی ابھی خیال گزرا تھا۔ رپورٹس دیکھیں تو سوچا تمہیں فون کر دوں'' نوشی نے مصروف سے انداز میں بتایا۔

''آنٹی کب جا رہی ہیں نازلی کے پاس'' اس نے بے قراری سے پوچھا۔ ابھی تو اسے آنٹی سے بہت کچھ پوچھنا تھا وہ بھی جو کچھ ساشا جانتی تھی اور جو کچھ وہ نہیں جانتی تھی۔

''ابھی یہ تو مجھے بھی نہیں خبر۔ ماما نے بس اتنا ہی بتایا ہے کہ آنٹی اپنی بیٹیوں کے پاس عنقریب چلی جائیں گی''

''یہ تو آنٹی نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے'' وہ سچ مچ دل سے خوش ہوئی تھی اور ان ہی سوچوں کے دوران کب سہ پہر اور کب شام سے رات اتر آئی، اسے خبر تک نہ ہوئی۔

وہی معمول کی روٹین تھی حسن اسے ڈنر کروانے باہر لایا تھا پھر وہ لانگ ڈرائیو پر نکل گئے تھے حسن کی ہمراہی میں چند پل کے لیے وہ بالکل بھول گئی تھی کہ رات کا دوسرا پہر ابھی باقی تھا۔

ساشا کی شدید ترین خواہش تھی کہ حسن خود اس پر اپنی زندگی کے سارے الجھاؤ واضح کر دے۔

ہمیشہ کی طرح اس کی آنکھ لگتے ہی حسن نے اپنا بازو ساشا کے سر کے نیچے سے بہت ہی نرمی اور احتیاط سے نکال لیا تھا۔ ساشا کی ساری حسیات ایک دم بیدار ہو گئی تھیں۔ وہ ابھی سوئی کہاں تھی اس کا فطری تجسس اسے سونے کہاں دیتا تھا حسن معمول کے مطابق سیدھا اسٹڈی روم کی طرف بڑھ گیا اور اس کے جاتے ہی ساشا بھی چپکے سے اٹھ گئی۔

دروازے کو بغیر دبائے بھی جانتی تھی کہ دروازہ اندر سے لاک ہے۔ مگر پھر بھی اس نے ہینڈل کو دو، تین مرتبہ گھما کر دیکھا تھا اسی پل اسے اپنی پشت پر ایک آواز سنائی دی۔ یہ آواز ممی کی تھی۔ ساشا اچھل کر پیچھے ہٹی۔

''ممی! آپ؟''

''ساشا بیٹی! تم سوئیں نہیں'' وہ بڑی نرمی سے پوچھ رہی تھیں۔

''نیند نہیں آ رہی تھی'' اس نے ہکلا کر جواب دیا۔

''حسن کے بغیر'' ان کے لہجے میں کچھ خاص بات تو ضرور تھی۔ ساشا ٹھٹک کر رہ گئی

''تو کیا یہ بھی جانتی ہیں کہ حسن کہاں ہے؟ گھر میں نہیں؟''

''جی'' اس نے محض سر اثبات میں ہلایا۔

''حسن ادھورا ملا ہے نا تمہیں'' ممی کے لہجے میں برسوں کی تھکن تھی گویا، ساشا پوری جان سے چونکی۔

''پورا حسن چاہیے تمہیں؟'' وہ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامے پوچھ رہی تھیں۔

''ہاں۔ مجھے پورا حسن چاہیے۔ بتایئے ممی! حسن کہاں ہے؟ رات کے دوسرے پہر وہ کہاں جاتا ہے؟ مجھ سے کچھ مت چھپایئے، میں مر جاؤں گی ممی! مجھ سے کچھ مت چھپایئے''

اتنے مہینوں کا لاوا گویا ابل پڑا تھا۔ ساشا ان کے سینے سے لگی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور اس کے ساتھ ممی بھی بے آواز رو رہی تھیں۔

''حسن آپ کا بیٹا ہے اور آپ اس سے نفرت کرتی ہیں کیوں؟ آپ نے کبھی خود سے حسن کو مخاطب نہیں کیا۔ اس نے کون سا گناہ کیا ہے ممی! بتایئے نا۔ میرا دل پھٹ جائے گا''

''آؤ میں تمہیں وہاں لے چلوں، تم حسن کو وہاں سے لے آؤ۔ مجھے، میرے حسن کو، ہمیں جینے کا سلیقہ بھول گیا ہے۔ حسن کو بھی بھول گیا تھا اور اسے دیکھ کر مجھے بھی بھول گیا۔ پھر میں نے سوچا اس کی شادی کر دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا تھا میں چاہتی تھی وہ پھر سے جینا سیکھ لے۔ مجھے حسن سے نفرت نہیں۔ میں اس سے نفرت کرنا چاہوں تب بھی نہیں کر سکتی۔ میں تو خود کو مورد الزام ٹھہراتی ہوں مجھے لگتا ہے میری تربیت میں کجی تھی جو حسن کی شخصیت میں بہت سی کمی چھوڑ گئی۔ تمہیں اس طرح کیسے پتا چلے گا۔ میں تمہیں بتاتی ہوں، بلکہ آؤ پہلے حسن کو لے آئیں''

''ممی! ہم کہاں جا رہے ہیں'' وہ بے حد گھبرا گئی تھی۔ مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کے لیے کہہ رہی تھیں۔

''ممی! بتایئے نا'' اس نے پھر سے دبی آواز میں اصرار کیا تھا۔ کالی رات کے سناٹے، مہیب خاموشی اور جانوروں کی خوفناک آوازیں۔ ساشا کا دل سہما جا رہا تھا، مگر گاڑی جب جانے پہنچانے راستے پر رواں دواں ہوئی تو ساشا گویا ششدر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

قائداعظم اسٹریٹ! پچیس اپریل!

''ساشا! آؤ نا'' گاڑی کافی دور رک چکی تھی اب وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ چل رہی تھیں

ساشا کے قدم گویا من من بھر کے ہو رہے تھے کیونکہ وہ دونوں قبرستان کے پھاٹک کے سامنے کھڑی تھیں وہ بغیر دیکھے بھی جانتی تھی کہ آخری کونے میں موجود ان دو قبروں کے سرہانے کون کھڑا ہے۔

کون توصیف کے کتبے پر لکھے ان درد بھرے الفاظ کو دہرائے گا۔

کج شوق سی یار فقیری دا
کج عشق نے درد رول دتا
کج سجنا حاجت نہیں چھوڑی
کج زہر رقیباں گھول دتا
کج ہجر فراق دا رنگ چڑھیا
کج درد ماہی انمول دتا
کج زہر رقیباں گھول دتا

''رقیب کون ہے ممی!'' اس کے لبوں سے سرسراتے الفاظ نکلے تھے ممی پھاٹک کے پاس بے دم سی ڈھے گئی تھیں اور ان لبوں سے نوحے اور فریادیں نکل رہی تھیں ان کی درد بھری چیخیں سناٹے کو چیر کر نہ جانے کہاں کہاں تک پہنچ رہی تھیں۔

''تم جاسوسی کرنے پھر سے پہنچ گئی ہو'' اس کے قریب ہی حسن کی آواز ابھری تھی۔

آنسوؤں سے بھری سوجی آنکھیں اور ہونٹوں پر زخمی سی مسکراہٹ ''منع بھی کیا تھا پھر بھی...... کبھی ٹیرس سے دیکھتی ہو، کبھی دیوار پر چڑھ جاتی ہو۔ کیا جاننا چاہتی ہو آخر؟ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ میرے دل پر بڑا بوجھ دھرا ہے۔ سانس لینا مشکل ہے''

وہ اس کا ہاتھ تھامے بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا پھر وہ ممی کی طرف مڑا۔ ڈرائیور گاڑی لے آیا تھا۔ حسن نے ممی کو گاڑی میں بٹھایا۔ وہ بڑی حسرت بھری نظروں سے ''حیات ہاؤس'' کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ گاڑی لحہ بہ لحہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو رہی تھی۔

''رقیب کون ہے حسن!'' ساشا کی آواز میں جنگل کے سناٹوں جیسی وحشت تھی۔

''میں...... رقیب ہوں، زیب حسن'' وہ کچی زمین پر دوزانوں بیٹھ رہا تھا۔ پھر اس نے مٹھی بھر مٹی کو ہاتھ میں لیا۔

''ان دو قبر والوں کا مجرم ہوں میں گناہ گار ہوں میں خطا کار ہوں میں بہت برا ہوں ساشا! میں ظالم ہوں، میں نے ظلم کیا، میں نے ظلم کمایا، میں کیسے اس جرم سے بری ہوں گا،

معاف کرنے والے تو مر گئے ہیں۔ اور جو زندہ ہیں، انہوں نے قانون کے شکنجے سے مجھے بچا کر دوہرے عذاب میں مبتلا کر دیا ہے تمہیں ایسے تو سمجھ میں نہیں آئے گا۔ آؤ میں تمہیں بتایا ہوں'' وہ ساشا کا ہاتھ پکڑ کر کچی زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔

''قائلہ میری تھی، بیچ میں توصیف آ گیا'' زیب حسن نے کہنا شروع کیا۔

☆☆☆

قائلہ اور توصیف ایک ساتھ دنیا میں آئے تھے۔ ایک گھنٹے کے وقفے سے توصیف پاکستان میں پیدا ہوا تھا ٹھیک ایک گھنٹے بعد قائلہ کی پیدائش کی بھی اطلاع مل گئی تھی۔

پاکستان میں توصیف کی پیدائش پر جشن منایا گیا تھا نیر خالہ کو تین بیٹیوں کے بعد اولاد نرینہ کی صورت دکھائی دی تھی۔ اسی طرح نویلہ خالہ کو بھی بڑی ہی منتوں مرادوں سے قائلہ کا دیدار نصیب ہوا اور قائلہ کی آمد پر بھی یو کے میں ایک گرینڈ فنکشن ارینج کیا گیا تھا۔

اور ان دونوں کی پیدائش کے ٹھیک تین سال بعد میں بھی یو کے میں پیدا ہوا۔ تین بہنوں کے بعد البتہ میری پیدائش پر کسی نے جشن منانے کا اہتمام نہیں کیا تھا کسی کے پاس فرصت ہی نہیں تھی۔ تب ڈیڈی پر بھی ہن برس رہا تھا۔ تین ہوٹلز کے اونر تھے ممی کی بھی اپنی مصروفیات تھیں۔ اور بہنوں سے میں اتنا چھوٹا تھا کہ ان سے مینٹل لیول مل ہی نہیں سکا۔

نویلہ خالہ صرف میری خالہ ہی نہیں چچی بھی تھیں۔ ہمارے گھروں میں فاصلہ بھی زیادہ نہیں تھا اور نویلہ خالہ میری ممی کی طرح بہت مصروف بھی نہیں تھیں ان کی مصروفیات صرف گھر تک محدود تھیں یا پھر قائلہ اور نومی تک۔

میری اسکولنگ شروع ہوئی تو خالہ نے ہی میرے لیے اسکول کا انتخاب کیا تھا پھر طے یوں ہوا، میں خالہ کی گاڑی میں قائلہ کیساتھ سکول جانے لگا وہ تین سال مجھ سے سینئر تھی اور خالہ کا خیال تھا کہ قائلہ میرا اچھی طرح سے سکول میں خیال رکھ سکتی ہے اور خالہ نے قائلہ کو اچھی طرح سے سمجھا دیا تھا کہ اس نے کس طرح میرا خیال رکھنا ہے۔

گاڑی سے اترنے کے بعد وہ میرا بیگ اور پانی والی بوتل خود پکڑ لیتی تھی اور میرا ہاتھ پکڑ کر سب سے پہلے مجھے کلاس روم میں چھوڑ کر جاتی۔ پھر بریک ٹائم میں لنچ باکس چیک کرنے آتی، آیا کہ میں نے لنچ کیا ہے یا نہیں۔ پھر اپنی زیر نگرانی لنچ کرواتی۔ میں برے برے منہ بناتا محض قائلہ کی ڈانٹ کے خوف سے سینڈوچ کھا لیتا۔ جوس کی بوتل بھی خالی کر لیتا۔ اس کے بعد

قائلہ کے یہ الفاظ میرے لیے باعث مسرت ہوتے تھے وہ میرے گال چوم کر پیار سے کہتی ''زیب! سویٹ بوائے۔ کبھی کہتی، زیب! چاکلیٹی بے بی''

اور مجھے لگتا تھا کہ میں سچ مچ بہت سویٹ ہوں، بالکل چاکلیٹ یا کینڈی کی طرح۔

آف ٹائم ہوتا، تب بھی قائلہ کی چمکتی نیلی آنکھیں بچوں کی قطار میں تلاش رہی ہوتیں پھر یہ ہونے لگا کہ اسکول سے واپسی کے بعد بھی مجھے قائلہ کے گھر بھاگنے کی جلدی ہوتی۔ دھیرے دھیرے عمر کی بتدریج منازل طے کرنے کیساتھ ساتھ قائلہ سے جذباتی وابستگی میرے لیے فطری سی بات تھی۔

اسکول میں قائلہ کا کوئی دوست نہیں تھا جس ٹاؤن میں ہم رہتے تھے وہاں آس پاس قائلہ کی کوئی فرینڈ نہیں تھی اسی طرح اپنے چھوٹے بھائی نومی سے بھی اس کی خاص فرینڈ شپ نہیں تھی، کیونکہ نومی تو مجھ سے بھی دو سال چھوٹا تھا اور یہ شرف، یہ اعزاز صرف میرے حصے میں آیا تھا کہ میں قائلہ کا واحد، اکلوتا دوست تھا وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی میرا بہت خیال رکھتی تھی میری ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھی۔ اور میں دل ہی دل میں نہ جانے کون کون سے جذبات پال رہا تھا اس بات سے بھی بے خبر کہ وہ مجھے ابھی تک مونٹسری کا بسورتا ہوا زیب سمجھتی تھی میں اس کے لیے ابھی تک چاکلیٹی بے بی تھا حالانکہ میں اے لیول کر رہا تھا اور وہ گریجویشن کے بعد نہ جانے کون کون سے شارٹ کورسز بھی کر چکی تھی۔ مزید تعلیم کے لیے نہ تو وہ آمادہ تھی اور نہ ہی خالہ اسے یونیورسٹی بھیجنا چاہتی تھیں۔

قائلہ کے معاملہ میں خالہ بھی بہت حساس ماں واقع ہوئی تھیں۔ حالانکہ کچھ عرصہ پہلے اسے ڈاکٹر بنانا خالہ کی اولین خواہش تھی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے نیا نیا کالج جانا شروع کیا تھا حالانکہ پڑھائی سے مجھے خاص لگاؤ تو نہیں تھا، تاہم نویلہ خالہ کے اصرار اور قائلہ سے ڈانٹ کے خوف کی وجہ سے مجھے ریگولر کالج جانا پڑتا تھا کیونکہ قائلہ کی یہ خواہش تھی کہ میں بیسٹ اسٹوڈنٹ کے ساتھ ساتھ موسٹ ریگولر اسٹوڈنٹ کی اعزازی ٹرافی جیتوں۔ اس نے میرے حوالے سے بہت خواب دیکھ رکھے تھے وہ چاہتی تھی کہ میں اپنے کیریئر پر خصوصی توجہ دوں کچھ بن کر دکھاؤں اور مجھے اس کی ہر خواہش ہر خواب کو تکمیل تک پہنچانا تھا۔

ہم دونوں کی دوستی میں پہلی دراڑ کب پڑی تھی۔ بہت سوچنے کی تو ضرورت ہی نہیں

تھی ہر وقت نظروں کے سامنے ایک فلم سی چلتی رہتی ہے کچھ بھی بھولتا نہیں، ہر کوشش کر کے دیکھ لی ہے میں کیا کروں ساشا! مجھے کچھ بھی بھولتا نہیں''

قبرستان کے سناٹے کو چیرتی حسن کی بھرائی آواز نے تسلسل توڑ دیا تھا ساشا اس کی آنکھوں سے ٹوٹتے ستاروں کو دیکھ رہی تھی اور پھر اس نے اپنا نرم ہاتھ حسن کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا وہ اس بند کتاب کو کھولنا چاہ رہی تھی حسن کے دل پر لکھی ہر تحریر کو پڑھنا چاہتی تھی وہ اس کے دل پر لدے اس بوجھ کو ہٹا دینا چاہتی تھی اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ حسن کو اعتماد اور محبت سے نوازتی۔

''پھر کیا ہوا حسن!'' اس کی آواز سرگوشی سے بلند نہیں تھی۔

''پھر یوں ہوا'' حسن نے پھر سے کہنا شروع کیا۔

''اس دوستی کے رشتے میں پہلی دراڑ قائلہ کے پاکستان جانے کے فیصلے نے ڈال دی، حالانکہ ہر چھٹیوں میں خالہ نومی اور قائلہ کو پاکستان لے کر جاتی تھیں ان کا قیام نیر خالہ کے گھر ہوتا تھا خالہ باقاعدگی سے پاکستان جاتی تھیں۔ تاہم میری ممی نے کبھی ایسی کوشش نہیں کی تھی یہ وجہ بھی بہت بعد میں کھلی تھی کہ ڈیڈی کو ممی کا میکے والوں سے ملنا جلنا پسند نہیں تھا اور ممی، ڈیڈی سے بہت دبتی تھیں۔

مجھے اس وقت خالہ اور قائلہ کے پاکستان جانے کی اطلاع ملی تھی جب وہ دونوں ٹکٹ تک کنفرم کروا چکی تھیں۔ دیکھا جائے تو یہ ایسی غصہ کرنے والی بات تو نہیں تھی۔ وہ پہلے بھی تین، تین ماہ کے لیے پاکستان جایا کرتی تھیں اور میری چھٹیاں خالہ اور قائلہ کے بغیر روکھی اور بے حد بورنگ گزرتیں۔

مگر جب سے یہ دل قائلہ کے عشق میں چپکے چپکے گرفتار ہوا تھا، تب سے تو مجھے قائلہ کا اپنی اکلوتی پھوپھی کے گھر جانا بھی گوارا نہیں تھا، جو کہ دوسرے شہر میں قیام پذیر تھیں۔

''کب ہوگی واپسی؟'' میرے لہجے میں، آواز میں بلکہ ہر ہر انداز میں بے قراری پوشیدہ تھی اور یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ لڑکی ہو کر ایک عورت ہو کر میری اس بے تابی کی وجہ جان نہ پاتی۔

''ابھی تو گئے بھی نہیں، اور تم واپسی کا پوچھنے لگے ہو'' وہ پاکستان جانے کے لیے مجھ سے بھی زیادہ بے تاب تھی۔

''تم وہاں جا کر بور نہیں ہوتیں'' میں اس وقت نویلہ خالہ کے گھر میں تھا اور قائلہ کو پیکنگ کرتے دیکھ رہا تھا اور میری حالت اس وقت کسی ایسے بچے کی طرح تھی جس کا پسندیدہ کھلونا

اس کی پہنچ سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

''نہیں'' وہ بے نیازی سے بولی۔

''وجہ؟ کون انٹرٹین کرتا ہے؟'' میرے لہجے میں واضح ناگواری تھی۔

''توصیف ہے نا، نیر خالہ کا بیٹا!'' وہ دھیمے سے مسکرائی تھی اور مجھ پر اس کی دھیمی مسکراہٹ کا راز منکشف نہیں ہوا تھا۔

''او...... توصیف'' میری بھنویں تن سی گئیں اور اسی پل توصیف کی فون کال آ گئی تھی۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ میری سانسوں میں بسنے والی قائلہ تو توصیف احمد کی اسیر تھی۔

''بھاڑ میں جاؤ تم!'' میں اسے فون کی طرف متوجہ ہوتا دیکھ کر واپس آ گیا تھا۔ اس وقت میری شریانوں میں دوڑتا لہو گویا ابل رہا تھا میرے لیے کسی بھی طور یہ بات ماننا مشکل تھی کہ قائلہ نے مجھ پر توصیف کی فون کال کو فوقیت دی ہے۔ پھر ایسے بیشمار مواقع آئے تھے جب مجھے محسوس ہوا تھا کہ قائلہ، توصیف سے محبت کرتی ہے، اسے پسند کرتی ہے۔

ان دنوں وہ توصیف کے لیے دھڑا دھڑ شاپنگ کر رہی تھی۔ اس کے پاس میرے لیے وقت نہیں تھا حالانکہ میرے ایگزامز کے دنوں میں وہ مجھ سے زیادہ فکرمند رہتی تھی ان دنوں وہ مجھے پڑھانے سے بھی انکاری تھی اور اس کے مشورے نے مجھے آگ لگا دی تھی۔

''تم کسی ٹیوٹر سے پڑھ لیا کرو۔ ایکچوئیلی! میں کچھ دنوں تک بزی ہو جاؤں گی'' اس نے اگرچہ کچھ غلط نہیں کہا تھا وہ سچ مچ کچھ دنوں تک بہت مصروف ہو جانے والی تھی اور اس کی مصروفیت کی خبر میرے اندر بھانبھڑ لگا دیتی تھی۔

ان کی لندن واپسی سے ٹھیک دو دن بعد کی بات ہے اس دن نویلہ خالہ بہت مدت بعد ہمارے گھر آئی تھیں میرے ڈیڈی کے سرد رویے کی وجہ سے وہ کم کم ہی ہمارے گھر آتی تھیں ممی نے کبھی اس بات پر ڈیڈی سے اختلاف نہیں کیا تھا ڈیڈی، ممی کے میکے والوں سے بہت روڈلی ملتے تھے اور ممی نے اس پر بھی کبھی اعتراض نہیں کیا تھا انہیں ڈیڈی کے ماتھے کے بلوں سے بہت خوف آتا تھا اور ممی کی ساری زندگی ڈیڈی کو خوش کرنے کے چکر میں گزر گئی تھی اور اسی جی حضوری والی عادتوں کی وجہ سے ممی نے اپنی اولاد تک کو نظر انداز کر رکھا تھا ڈیڈی کو اپنے پیسے پر خاصا مان تھا۔ تین گورنس تھیں گھر میں خوشحالی تھی اور اسی خوشحالی کی وجہ سے ڈیڈی غریب رشتے داروں سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔

ڈیڈی ایک سخت گیر شوہر اور باپ تھے ممی کو پاکستان آنے جانے تک کی اجازت نہیں تھی بہنوں سے ملنے کی جرأت نہیں تھی ہاں کبھی کبھار فون کر لیا کرتی تھیں اس کے علاوہ ہر طرح کی آزادی تھی اور ممی نے بہنوں سے، اپنوں سے نہ ملنے کے غم کو دل سے نہیں لگایا تھا وہ اپنے حال میں خوش تھیں ان کے پاس فرصت ہی کہاں تھی کہ چھوٹی موٹی پریشانیوں پر کڑھتی رہتیں۔

نویلہ خالہ جب بھی پاکستان آتی تھیں، ہمارے لیے بہت سے تحائف لاتیں جو کہ نیر خالہ ہمارے لیے بھجواتی تھیں میں نے اب تک نیر خالہ اور ان کے بچوں کو صرف تصویروں میں دیکھا تھا اور یہ تصویریں قائلہ بہت شوق سے مجھے دکھاتی تھی اور صرف قائلہ کی خوشی اور شوق کو دیکھتے ہوئے مجھے دلچسپی ظاہر کرنا پڑتی۔ ورنہ توصیف اور نازلی وغیرہ کو دیکھنے میں ان سے ملنے میں قطعاً انٹرسٹ نہیں تھا مجھے ہو بھی کیسے سکتا تھا کیونکہ انیس سال کی عمر میں میرے اندر موجود ایک سوچ نے مجھے پہلے سے ہی الرٹ کر دیا تھا کہ یہ توصیف احمد میرا رقیب ہے اور یہ سوچ جب بھی آن آف ہوتا تھا کچھ نہ کچھ نیا اور انہونا ضرور ہی ہوتا۔

قائلہ کی شخصیت میں اور مزاج میں تبدیلیاں تو میں نے بہت پہلے نوٹ کر لی تھیں اور مجھے ہرگز نہیں پتا تھا کہ اس بدلاؤ کا براہ راست تعلق توصیف سے ہے۔

مختصر یہ کہ قائلہ اب میری نہیں رہی تھی اس کے پاس میرے لیے چند لمحے بھی نہیں تھے میں خالہ کی طرف آتا تو وہ مجھے دیکھتے ساتھ ہی اٹھ جاتی۔ اکثر فون پر مصروف پائی جاتی مجھے دیکھتے ساتھ ہی اسے اپنے بے شمار کام یاد آ جاتے۔ سچ تو یہ ہے وہ میری نظروں کے مفہوم کو جان چکی تھی سمجھ چکی تھی اور یہ رکھائی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

میری جذباتیت نے قائلہ کو مزید مجھ سے متنفر کر دیا تھا، ایک......لندن کی برفیلی رات کو میں نے قائلہ سے اظہار محبت کر کے خود کو مزید بے مول کر دیا۔ قائلہ نے کہا تو صرف اتنا۔

"میں تمہیں اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح سمجھتی ہوں۔ تم پاگل ہو زیبی! یہ ایج ایسی چیزوں کے لیے مناسب نہیں۔ تم ابھی بچے ہو۔ مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی۔ تم نے مجھے مایوس کیا ہے زیبی!"

وہ سخت شاکڈ تھی اس کا خیال تھا میں کبھی ایسی جرأت نہیں کر سکوں گا حالانکہ وہ میری جذباتیت، جنون، جوش اور غصے سے اچھی طرح سے واقف تھی۔

"میں تمہارا بھائی نہیں۔ نہ ہو سکتا ہوں تمہارا صرف ایک بھائی ہے اسے ہی اپنا بھائی

سمجھو۔ میرا اور تمہارا کزنز اور دوست کا رشتہ ہے اور عنقریب تیسرا رشتہ بھی بنا لوں گا" میں نے بلا جھجک کہہ دیا۔

"جسٹ شٹ اپ زیبی! بے شرم، تمہیں ذرا لحاظ نہیں۔ میں تم سے بڑی ہوں" قائلہ نے سخت غصے پر بمشکل قابو پایا تھا۔

"صرف تین سال" میں نے جتایا۔

"تم چاہتے کیا ہو" قائلہ زچ ہو اٹھی۔

"صرف تمہیں۔ تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں" میں نے بے باکی سے کہا۔

"ایسا ممکن نہیں زیبی! تم سمجھتے کیوں نہیں" وہ بہت نرم مزاج تھی اسے غصہ چھو کر بھی نہیں گزرتا تھا بہت حلیم الطبع، بہت ذہین بہت دلکش۔ وہ ہر روپ میں بے مثال تھی۔ اس کی تمام تر عادتیں نویلہ خالہ جیسی تھیں وہ خالہ کی طرح ٹھنڈی اور میٹھی تھی اور اس وقت بھی وہ غصے کو خود پر حاوی نہیں ہونے دے رہی تھی یقیناً وہ مجھے بہت تحمل سے سمجھانا چاہتی تھی اور اس نے مجھے سمجھانے کی ہر کوشش کر کے دیکھ لی تھی مگر میری جذباتیت نے ہم دونوں کے درمیان ہونے والی اس بات کو لیک آؤٹ کر دیا۔

بات بڑوں تک پہنچ گئی تھی اور مجھے اس بات سے قطعاً پریشانی نہیں تھی میں ممی سے کہہ چکا تھا کہ وہ میرا پرپوزل لے کر خالہ کی طرف جائیں مگر ممی تذبذب کا شکار تھیں نجانے کیا وجہ تھی انہوں نے بھی مجھے سمجھانے بجھانے کا بیڑا اٹھا لیا۔

"ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟" ممی کے سمجھانے کا مجھ پر الٹا اثر ہوا تھا۔ میں چلا اٹھا۔

"قائلہ بڑی ہے تم سے" ممی نے وہی گھسا پٹا جواز پیش کیا۔

"میرے لیے یہ بات کوئی معنی رکھتی" میرے ہر ہر انداز میں بغاوت تھی۔

"نویلہ کبھی نہیں مانے گی" ممی کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ وہ کافی دیر خاموش رہنے کے بعد بولی تھیں۔

"کیوں؟ مجھ میں کیا کمی ہے۔ میں کون سا ابھی شادی کروں گا۔ صرف انگیج منٹ کے لیے خالہ کو منا لیں۔ شادی میری اسٹڈیز کے بعد" میں نے بالا ہی بالا سب کچھ طے کر رکھا تھا۔

"اور قائلہ، کیا وہ تم سے شادی کے لیے مان جائے گی؟" ممی کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"آف کورس" میں پراعتماد تھا۔

''کبھی نہیں''، ممی گویا زیرِلب بڑبڑائیں ''قائلہ کبھی نہیں مانے گی''

''کیوں؟ وجہ جان سکتا ہوں'' عادتاً میرے غصے کا گراف بڑھنے لگا تھا۔

''قائلہ اور توصیف کی بچپن سے بات طے ہے'' ممی نے گویا بم بلاسٹ ہی تو کیا تھا۔ کچھ لمحے تک میں محض شاکڈ ہی رہا۔

''بات طے ہے مگر مجھے معلوم نہیں تھا اور یہ قائلہ اسی لیے بھاگ بھاگ کر پاکستان جاتی تھی واہ جی واہ...... یہ بالا ہی بالا سب کچھ نبٹائے بیٹھے ہیں اور مجھے کچھ علم ہی نہیں''

''حسن! تم ابھی بچے ہو ان باتوں میں مت پڑو۔ ابھی تم نے بہت آگے جانا ہے بہت سا پڑھنا ہے۔ کچھ بن کر دکھانا ہے اگر تمہارے ڈیڈی کو خبر ہوئی تو میری اور تمہاری جان ایک کر دیں گے'' ممی ہمیشہ کی طرح ڈیڈی سے خوف زدہ تھیں۔

''مجھے قائلہ چاہیئے ممی! آپ خالہ سے کہیں نا۔ مجھے قائلہ دے دیں۔''

نجانے مجھے پل دو پل میں کیا ہوا تھا، میرا غصہ اور جلال کہیں دور ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا اور میں ممی کے قدموں میں بیٹھا گڑگڑا رہا تھا اور ممی میرے پل پل بدلتے مزاج سے دنگ رہ گئی تھیں۔ انہوں نے جان لیا تھا کہ یہ صرف دل کا معاملہ نہیں۔ میں قائلہ کے حوالے سے مینٹلی بھی اپ سیٹ ہوں۔ مگر یہ جاننے کے باوجود میری ماں نے میرا اس حساس دور اور نازک وقت میں ساتھ نہیں دیا میرا سہارا نہیں بن سکیں۔ اگر وہ کوشش کرتیں تو میں اس جذباتی کشمکش سے نکل سکتا تھا مگر ممی ہی کیا نویلہ خالہ تک مجھے سمجھ نہیں پائیں مجھے برا بھلا کہا۔ انہوں نے کہا مجھے اپنے باپ کی حرام کی دولت کا خمار ہے اور کچھ نہیں۔ ان سب نے مل کر مجھے ڈی گریڈ کیا تھا ساشا! میرے باپ نے میری ماں نے، خالہ نے قائلہ نے......

حالانکہ میں قائلہ کے حصول کی خاطر ان سب کے قدموں میں گر کر گڑگڑایا تھا ڈیڈی کی منتیں کی تھیں۔ خالہ کے پیر پکڑے تھے۔ مگر سب ہی مجھے ایک ناسمجھ اور جذباتی لڑکا سمجھتے رہے اور اس جذباتی لڑکے نے وہ کر دکھایا جس کا یقین خود مجھے آٹھ سال بعد بھی نہیں آتا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب خالہ، قائلہ کا توصیف سے نکاح کر کے خوشی خوشی واپس آئی تھیں یہ ان کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ رخصتی لندن میں ہو۔

انہوں نے ایک بڑی غلطی کی تھی کہ آناً فاناً قائلہ کا نکاح کر دیا۔ وہ کچھ وقت مزید انتظار تو کر سکتی تھیں کم از کم مجھے سنبھلنے کے لیے کچھ سال دے دیتیں۔ پھر چاہیئے قائلہ کی کہیں بھی

شادی کر دیتیں۔ حالانکہ ابھی ان کا ارادہ صرف منگنی کرنے کا تھا میری قائلہ کے لیے پسندیدگی جاننے کے بعد انہوں نے جھٹ نکاح کا پروگرام ترتیب دے ڈالا حالانکہ اس سے پہلے انہوں نے کم از کم پانچ سال بعد قائلہ کی شادی کرنا تھی نومی ابھی پڑھ رہا تھا اور قائلہ کی جاب سے ہی گھر کے اخراجات پورے ہو رہے تھے خالہ پہلے خود جاب کرتی تھیں بیوگی کے بعد وہ کسی پر بوجھ نہیں بنی تھیں اور اب قائلہ انہیں کام نہیں کرنے دیتی تھی۔

دوسری بڑی غلطی یہ تھی۔ انہوں نے فوراً توصیف کو لندن بلوانے کے انتظامات کرنا شروع کر دیے تھے۔ دیکھا جائے تو یہ کچھ غلط یا انہونا نہیں تھا مگر مجھے یہ سب اپنی توہین کا احساس دلانے کے لیے کافی تھا۔ مجھے لگتا تھا میری خالہ نے اور قائلہ نے میرے جذبات میری محبت کا مذاق اڑایا ہے۔ اور خالہ کہتی تھیں کہ ان کی بیٹی کسی ایسے گھر میں نہیں جائے گی جس کی اینٹ اینٹ حرام کی کمائی سے خریدی گئی ہے۔

ہم نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی جس آزاد معاشرے میں آنکھ کھولی تھی۔ جو کچھ ہم نے دیکھا اور جانا تھا۔ وہاں ایسی باتیں بہت مس فٹ تھیں مگر میری دونوں خالائیں ایسی ہی تھیں، درویش قسم کی اور ان کے بچے بھی بالکل اپنی ماؤں کا پرتو۔ کم از کم قائلہ اور توصیف تو ایسے ہی تھے۔

توصیف کے مرنے کے بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ تھا کیا؟ اس میں کیسی کیسی خوبیاں تھیں۔ وہ کتنا پیارا دل رکھنے والا انسان تھا۔ وہ ہیرا تھا، نادر و نایاب۔ بہت قیمتی انسان، اور وہ مٹی میں رُل کر رہ گیا تھا وہ مر گیا تو مجھے احساس ہوا کہ قائلہ ٹھیک ہی اس کے عشق میں گرفتار تھی وہ ایسا ہی تھا ساشا! بہت پیارا، بہت حساس، شیشے جیسا دل رکھنے والا۔

میری قائلہ سے محبت دودھ کے ابال جیسی تھی اور ان دونوں کی محبت لازوال تھی وہ دلوں میں ابھی تک اچھی ''یاد'' بنے زندہ ہیں۔ آج بھی اور ہمیشہ کے لیے میرا یہ دل ان دونوں کی یاد سے کبھی خالی نہیں رہے گا۔ ساشا! مجھے کبھی مجبور مت کرنا کہ میں ان دونوں کو اپنے دل سے نکال دوں یا پھر خاموشی کے اس شہر میں کبھی نہ آؤں۔ مجھے کبھی روکنا مت۔ میرا سکون یہاں پوشیدہ ہے یہاں دفن ہے مگر یہ قبر والے میرے آنسوؤں سے میری منتوں سے بھی نہیں پگھلتے نجانے کیوں انہوں نے اپنے دل پتھر کر لیے ہیں۔ ساشا! نجانے کیوں؟''

حسن اس کے زانوں پر سر رکھے تڑپ تڑپ کر رو رہا تھا ساشا کے ہاتھ اس کے سر پر ٹھہر گئے تھے اور اس کے لبوں سے پھر سے سرگوشی نما آواز برآمد ہوئی تھی قبرستان میں اب بھی

ہولناک سناٹا تھا اور اس سناٹے کو چیرتی حسن کی سسکیاں۔

''پھر کیا ہوا؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''پھر' حسن تھم سا گیا تھا۔اس کے دل کی دھڑکنیں رک رک کر چلنے لگی تھیں اس نے اپنا سر اٹھا کر ساشا کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''بولیے حسن؟''اس کے آواز میں ہمیشہ والی نرماہٹ تھی۔حسن کی ڈھارس سی بندھی۔

''تم ایک وعدہ کرو مجھ سے' وہ نا قابل فہم انداز میں کہہ دیا تھا۔

''کیا؟'' ساشا حیران ہوئی۔

''تم۔تم مجھ سے نفرت تو نہیں کرو گی؟ مجھے کبھی زندگی کے کسی موڑ پر چھوڑ کر مت جانا ساشا!میں نے زندگی کو تمہیں دیکھنے کے بعد پھر سے زندگی سمجھنا شروع کیا ہے۔ مجھے کبھی تنہا مت کرنا۔میں بہت سالوں سے اپنی ذات کی قبر میں قید ہوں،اکیلا اور تنہا'' وہ لرزیدہ آواز میں کہہ رہا تھا۔

''میں وعدہ کرتی ہوں۔میں کبھی آپ کو تنہا نہیں چھوڑوں گی'' ساشا نے اپنے سابقہ لہجے میں بہت نرمی سے کہا تھا۔

''آپ کچھ بتا رہے تھے حسن؟'' قبرستان کے سناٹے کا مخصوص خوف ان دونوں سے کوسوں دور چلا گیا تھا۔

''خالہ نے ہمارے گھر قائلہ اور توصیف کے نکاح کی مٹھائی بھجوائی تھی۔ممی بھی بہت عرصے بعد نویلہ خالہ کی طرف مبارک باد دینے پہنچ گئی تھیں۔انہیں کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ توصیف بہت جلد لندن آ رہا ہے۔

ان دنوں خالہ رخصتی کی زور وشور سے تیاریاں کر رہی تھیں اور میں پھر سے خالہ کی منتیں کرنے پہنچ گیا۔

مجھے یاد ہے۔وہ دن میری زندگی کے اذیت ناک دن تھے وہ راتیں اتنی طویل ہوا کرتی تھیں کہ صبح کی سپیدی دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔میرا ان دنوں صرف ایک ہی کام ہوا کرتا تھا۔خالہ کے گھر چکر لگانا۔فونز کرنا اور بار بار خالہ کو قائلہ کی شادی سے روکنے کی کوشش کرنا ہے۔

مجھے یاد ہے میری دھمکیوں،منتوں،خوشامدوں کا خالہ کے پاس صرف ایک جواب تھا۔

''تم میری بیٹی کے قابل نہیں ہو سکتے۔تم امیچور اور جذباتی لڑکے ہو۔اس کے ساتھ ساتھ بدلحاظ ہو۔دین کا تمہارے پاس علم نہیں۔ورنہ اتنا تو ضرور سمجھتے ایک نکاح شدہ لڑکی کے گھر

نکاح کا پیغام بھجوانا حماقت ہے۔قائلہ توصیف سے محبت کرتی ہے اگر وہ تمہاری طرف ملتفت ہوتی تو پھر بھی میں کچھ نہ کچھ ضرور کوشش کرتی۔وہ اپنے فیصلے خود کر سکتی ہے۔اگر تم مجھے یوں ہی ذہنی طور پر ٹارچر کرتے رہے تو مجھے مجبوراً پولیس کو انفارم کرنا پڑے گا اور مجھے بھول جائے گا کہ تم میرے سگے بھانجے ہو''

خالہ کے لہجے میں بلا کی کاٹ پوشیدہ تھی اور پولیس کی دھمکی نے مجھے غصے سے پاگل کر دیا تھا اور میں نجانے کیوں اپنے مقام اور سطح سے گر گیا میں نے خالہ کو گالیاں دیں میں چلاتا رہا تھا بکواس کرتا رہا انہوں نے میری ساری بکواس سننے کے بعد ہی فون رکھا تھا اور آخری الفاظ جو ان کے لبوں سے برآمد ہوئے تھے وہ آج بھی میرے دل پر نقش ہیں۔

خالہ نے کہا تھا'' تم زینی!تم ایک بہت ہی کمینے لڑکے ہو۔قصور تمہارا بھی نہیں جو حرام تمہاری رگوں میں دوڑ رہا ہے یہ اسی حرام کی کرامات ہیں تم اپنے بزرگوں کو گالی دیتے ہو۔میں تمہاری ماں جیسی نہیں ماں ہوں ماں۔افسوس تو یہ ہے میں نے آستین میں ایک سانپ کو پالا۔تمہاری ماں نے تمہیں پیدا کر کے گورنس کی گود میں پھینک دیا تھا۔میرے پیار اور اس محبت کا خوب صلہ دیا ہے جو میں نے اور قائلہ نے تم پر بے دریغ لٹایا'' خالہ نے فون بند کر دیا تھا اور میں محض چلاتا رہ گیا۔

''اگر آپ میری ماں ہوتیں تو میرے بارے میں ضرور سوچتیں'' میری نفرت کی کوئی انتہا نہیں تھی۔

میری شخصیت میں بے شمار دراڑیں تھیں میں ایک الجھی ہوئی شخصیت کا مالک تھا اور اس الجھاؤ کی ایک بڑی وجہ ہمارے گھر کا ماحول تھا اپنے گھر کے ماحول کو ڈسکس کرنا مجھے کبھی بھی پسند نہیں رہا۔

لیکن میں تم سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتا ممی نے جو بھرم، جو پردہ تمہارے اور اپنے درمیان تان رکھا تھا اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ممی خود پر لگے اس بدنما داغ کو دنیا والوں کے سامنے عیاں کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھیں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔چلو،تمہیں کچھ اپنے اسی ماضی کے بارے میں بھی بتا دیتا ہوں جس کا براہ راست تعلق بھی قائلہ اور توصیف کی موت سے ہے مگر اس سے بھی پہلے تمہیں کچھ اور بھی بتانا ہے۔

میرے ڈیڈی کی زندگی عیش وعشرت اور دولت کے حصول میں کھپ رہی تھی ان کے

نزدیک بیوی اور اپنی اولاد صرف جان کا وبال تھے بڑی تینوں بہنیں اور ممی، ڈیڈی سے ہمہ وقت خوف زدہ رہتے تھے کیونکہ پینے کے بعد ڈیڈی گالم گلوچ کے علاوہ مارنے پیٹنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

میری بہنیں تعلیم کے سلسلے میں گھر سے دور تھیں یہ فرار انہوں نے بخوشی قبول کیا تھا ایسے ماحول میں کوئی بھی نارمل انسان ایب نارمل ہو سکتا تھا۔

رہ گیا تو میں میرے لیے بھی ممی کے پاس وقت نہیں تھا وہ ڈیڈی کو خوش کرنے کے لیے پارٹیز اٹینڈ کرتی تھیں اور ان کی زندگی کا صرف ایک مقصد تھا یعنی ڈیڈی کو خوش کرنا۔

تب خالہ میرے لیے مہربان فرشتہ بن کر آئی تھیں۔ اس دن ڈیڈی نے ممی کو بہت پیٹا تھا ممی کے سر پر کافی چوٹیں آئی تھیں اور ممی ہسپتال میں ایڈمٹ تھیں نجانے خالہ کو کس نے اطلاع کر دی تھی۔ وہ آئی تو ممی سے ملنے تھیں مگر مجھے گم صم، پریشان اور بے تحاشا روتے دیکھ کر گھر لے آئیں اور یوں میں ممی سے بھی زیادہ نویلہ خالہ سے اٹیچ ہو گیا مگر میری جان سے پیاری خالہ نے میرے دل کو کرچی کرچی کر دیا تھا۔

میں جانتا ہوں میں غلط تھا میرا مطالبہ غلط تھا اس ایج میں کی جانے والی ڈیمانڈ اور محبت تک غلط تھی۔ مگر میں جانتے بوجھتے بھی محض ضد اور انا کی خاطر وہ سب کچھ کر گزرا جس نے مجھے انسانی کی معراج سے گرا دیا۔

جس رات توصیف یو کے کے ایئر پورٹ پر کھڑا قائلہ اور خالہ کا انتظار کر رہا تھا ٹھیک اسی رات میرا ذہن ایک پلاننگ کر چکا تھا۔

دوسری رات ان دونوں کی رخصتی کی تقریب تھی۔ خالہ نے وہ ساری رسمیں اور شوق پورے کیے تھے جن کی پاکستانی شادیوں میں بہت اہمیت ہوتی ہے۔

توصیف کی آمد سے پہلے ڈھولکی تک رکھوائی گئی تھی یہ شادی کی تقریب ایک یادگار تقریب تھی جسے میں نے ہمیشہ کے لیے یادگار بنا دیا۔

خالہ نے قائلہ اور توصیف کا بیڈ روم بہت شاندار انداز میں ڈیکوریٹ کروایا تھا اور میں جانتا ہوں، اس سلسلے میں خالہ خاصی مقروض ہو گئی تھیں مگر وہ اپنی لاڈلی بیٹی کے سارے ارمان پورے کرنا چاہتی تھیں۔

سرخ گلابوں سے سجے اس کمرے میں گویا رنگوں کی بہار اتر آئی تھی قائلہ سرخ لباس

میں سجی بنی توصیف کے سامنے بیٹھی تھی نجانے انہوں نے کیا کیا باتیں کی ہوں گی کون کون سے وعدے کیے ہوں گے یقیناً توصیف نے کہا ہو گا کہ وہ خالہ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے رخصتی کے لیے لندن آیا ہے اب قائلہ کو اس کے ساتھ ہمیشہ کے لیے پاکستان جانا ہو گا وہ اس سے وعدہ لے رہا ہو گا اور یقیناً قائلہ نے اس کی ہر خواہش پر سر جھکایا ہو گا۔

اس رات میں انگاروں پر تڑپتا تھا اور صبح قیامت لے کر طلوع ہوئی تھی۔

''قائلہ اور توصیف مر گئے''

ممی اور میری بہنیں چیخ چیخ کر رو رہی تھیں رات کو ہی تو وہ سب خوشی خوشی تقریب کے اختتام پر گھر آئی تھیں اور اب انہوں نے گویا قیامت کی خبر سن لی تھی۔

یہ خبر مجھ پر بجلی بن کر گری تھی یہ کیا ہو گیا تھا؟

اس میں شک نہیں غصہ اور جذبات میں آ کر میں نے انہیں قتل کرنے کا پروگرام بنایا تھا میں نے نویلہ خالہ کی میڈ کو اعتماد میں لے کر اسے ہزاروں پونڈ اور امریکہ کے ویزے کا لالچ دے کر کہا تھا کہ وہ توصیف اور قائلہ کے سوپ یا جوس میں زہر شامل کر دے۔ لیکن اچانک نہ جانے مجھے کیا ہوا تھا مجھے لگا تھا کہ قائلہ کو کچھ ہو گیا تو میں زندہ نہ رہ سکوں گا میں نے اس میڈ کو فون کر کے منع کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا فون نہیں ملا تو میں نے اسے میسج کیا کہ وہ اس پلان پر ہرگز عمل نہ کرے۔

قائلہ اور توصیف کی موت کا سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ میڈ نے وہ میسج نہیں دیکھا اور اس نے طے شدہ منصوبہ کے مطابق انہیں زہر دے کر مار دیا ہے۔

احساس جرم نے مجھے پاگل کر دیا۔ میرے اعصاب جواب دے گئے میں نے خالہ کو فون کر کے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا خالہ مجھے گالیاں دے رہی تھیں۔ بددعائیں دے رہی تھیں صدمے کی شدت نے انہیں پاگل کر ڈالا تھا۔

دوسری طرف قانونی کارروائی فوری طور پر ہو رہی تھی صرف آدھے گھنٹے بعد میں گرفتار ہو گیا۔

نویلہ خالہ تابوت میں بند اپنی بیٹی اور جان سے پیارے بھانجے اور داماد کو پاکستان لے گئی تھیں۔

حوالات میں بند میں کسی اور ہی جہان میں تھا

میرے گھر والوں پر کیسی قیامت بیت رہی تھی مجھے قطعاً پروا نہیں تھی۔

میرے حواس تو اس وقت سلب ہوئے تھے جب ایف آئی آر میرے سامنے آئی ایف آئی آر پر لکھی تحریر نے میرے ہوش اڑا دیے تھے مجھ پر کون سا الزام لگا تھا یہ تو میں جانتا ہی تھا ایف آئی آر کا متن کچھ یوں تھا کہ مقتولہ اور مقتول گیس لیک کر جانے کی وجہ سے جاں بحق ہوئے ہیں اور یہ منصوبہ اور سازش زیب حسن کی تھی جس میں وہ کامیاب ہوا۔ گیس کے ہینڈل کو لوز کر دیا گیا تھا رات کے کسی پہر پائپ میں سے نکلنے والی گیس سے ان کی موت واقع ہوئی تھی مجرم نے تمام منصوبہ بہت چالاکی اور ذہانت سے بنایا تھا۔

اس کے علاوہ کچھ اور قانونی تفصیلات تھیں۔ تاہم میرا دماغ شائیں شائیں کر رہا تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ نے ثابت کر دیا تھا کہ ان دونوں کی موت کسی زہریلی دوا سے نہیں بلکہ آکسیجن کے ختم ہو جانے اور گیس ہیٹر کا برنر کھلے رہ جانے کی وجہ سے واقع ہوئی تھی یقیناً والو لوز ہو گیا تھا یا پھر ٹھیک سے بند نہیں کیا گیا تھا جو بھی تھا میرا اقبال جرم مجھے میرے اپنوں اور قانون کی نظروں میں مجرم تو بنا چکا تھا۔

پھر ایک دن خالہ کی میڈ سے میری بات بھی ہو گئی۔ اس نے میرے خدشات رفع کر دیے تھے اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ سوپ اس نے سنک میں بہا دیا تھا اسے میرا میسج مل گیا تھا ویسے بھی وہ اتنی سنگدل نہیں ہو سکتی کہ محض پیسے کے لیے کسی کی جان لے لیتی۔ وہ سوپ جس میں پوائزن ملایا گیا تھا وہ ان تک نہیں پہنچا تھا اور ان کی موت گیس لیک ہونے کی وجہ سے واقع ہوئی تھی مگر پولیس کے پاس میرا اقبال جرم ریکارڈ ہو چکا تھا اور یہ اقبال جرم مجھے عمر قید کے قریب لے آیا تھا۔

میں پولیس تو کیا خالہ تک یہ بات نہ پہنچا سکا تھا میں نے قائلہ اور توصیف کو مارنے کا منصوبہ ضرور بنایا تھا مگر عین وقت پر میری محبت جیت گئی تھی اور نفرت اور رقابت ہار گئی تھی اور وہ امر بی سے اس جہان فانی کو اپنی وصل کی شب وداع کہہ گئے تھے۔

اتنی جلدی میں اپنی نادانیوں پر پشیمان ہو جاؤں گا یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا یہ آگاہی کے عذاب میری نیندیں حرام کر چکے تھے میں رات رات بھر جاگتا رہتا تھا اب جاگنا ہی میرا مقدر تھا آٹھ سالوں سے میں جاگ رہا ہوں چار گھنٹے نیند کے بعد خود بخود میری آنکھ کھل جاتی ہے پھر باقی کی رات میری جاگتے گزرتی ہے۔

جس صبح کورٹ نے مجھے سزا سنائی تھی میرے گھر سے کوئی نہیں آیا تھا۔ آتا بھی کون؟ ڈیڈی نے میری گرفتاری کے بعد ممی کو طلاق دے کر گھر سے بے دخل کر دیا تھا ڈیڈی جیسا بزنس

مین گھاٹے کا سودا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ڈیڈی کو اندازہ ہو چکا تھا کہ مجھے بڑی سزا کے ساتھ ساتھ بھاری جرمانہ بھی ضرور ہو گا سو انہوں نے مجھے اپنی پراپرٹی سے عاق کر دیا۔

ممی ان دنوں ذہنی توڑ پھوڑ کا شکار تھیں ایک طرف اکلوتے بیٹے کی جدائی اور دوسری طرف ڈیڈی کی سنگ دلی نے ممی کو بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا۔

کورٹ میں تنہا میں کٹہرے میں کھڑا تھا میرا اپنا کوئی بھی نہیں تھا مگر کچھ دیر بعد میری دونوں خالائیں آ گئی تھیں۔

اور ان دونوں نے حکم سننے سے پہلے ہی عدالت سے درخواست کی تھی کہ وہ کیس واپس لے رہی ہیں مجھے باعزت بری کر دیا جائے مجھے نیر خالہ نے اور نویلہ خالہ نے معاف کر دیا تھا میں ششدر تھا میں حیران تھا اور شاید میری خالاؤں کو یقین ہو چکا تھا کہ گیس ہیٹر کے برنر کو لیک کروانے میں میرا کوئی عمل دخل نہیں۔

مگر یہ تو میری بھول تھی نیر خالہ اور نویلہ خالہ نے مجھے معاف کیا تھا۔ اپنے بچوں کا خون مجھے معاف کیا تھا صرف اور صرف اس لیے کہ وہ دونوں کہتی تھیں کہ دو گھر تو برباد ہو ہی چکے ہیں اب یہ تیسرا گھر جو پہلے ہی طوفانوں کی زد میں تھا ٹوٹنے سے بچ جائے وہ نہیں چاہتی تھیں کہ صدموں سے نڈھال میری ماں کو میری دائمی جدائی کا ایک اور صدمہ دیکھنا پڑے۔ ان کی معافی نے مجھے ضمیر کے کوڑوں کے حوالے کر دیا تھا آج تک ان کوڑوں کی زد میں ہوں روز جیتا ہوں روز مرتا ہوں۔

بہت سال بعد جب دل قدرے ٹھہر گیا تو میں نے واپسی کا مقصد کیا مجھے لگتا تھا میرا سکون اسی شہر خموشاں میں پوشیدہ ہے یہیں پر میں نے تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا پھر میں تمہیں روز ہی دیکھنے لگا نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے تمہارے متعلق معلومات اکٹھی کرنا شروع کر دی تھیں میں جان گیا تھا کہ تم بہت حساس دل رکھنے والی لڑکی ہو مجھے لگتا تھا کہ تم میرے گناہوں اور دکھوں کے بوجھ کو ہلکا کرنے میں میری مدد کرو گی۔

مجھے لگا تھا، اک عمر کی مسافت طے کرنے کے بعد مجھے بھی ایک جزیرہ دکھائی دینے لگا ہے اور میں اس جزیرے کی طرف خود بڑھا ہوں میرے مجبور کرنے پر ممی نے میرا پرپوزل تمہارے گھر بھجوایا تھا ٹیرس سے دیکھتی۔ گلاس ونڈو سے جھانکتی اور پھر قبرستان کی چار دیواری تک آنے والی ساشا علیم مجھے متاثر کر گئی تھی۔

میں اس کہانی کا تیسرا کردار ہوں۔ ساشا! تم کیا سمجھتی ہو، میں کتنی سزا کا حق دار ہوں؟''

حسن خاموش ہو گیا تھا اب صرف سائیں سائیں کرتے سناٹے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور ساشا گویا دم بخود تھی اسے سنبھلے کے لیے بہت سے لمحے درکار تھے اور جب اس کا دل قدرے معمول کی رفتار پکڑنے لگا تو وہ از سرِنو ان تمام واقعات کو ذہن میں دوہرانے لگی۔

جو کچھ وہ سوچ رہی تھی سب روز روشن کی طرح عیاں ہو رہا تھا اور پھر جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں واضح ٹھہراؤ تھا۔

''حسن! آپ رب رحیم کا شکر ادا کیا کریں اس نے آپ کو کبیرہ گناہ کا مرتکب ہونے سے بچالیا ہے آپ نے گناہ کی نیت ضرور کی لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ پر اپنا کرم کیا آپ نے کسی کا قتل نہیں کیا حسن! آپ خود کو اس احساس جرم سے آزاد کریں قائلہ اور توصیف نے عین وصل کی شب اسی وقت اسی گھڑی اور اسی لمحے جان دینی تھی اسی لیے کہ لوح محفوظ میں بہت پہلے آسمانوں پر لکھا جا چکا تھا یہ حادثاتی موت ان کی مقدر میں لکھی جا چکی تھی رب نے آپ پر اپنا کرم کیا آپ کو بروقت احساس ہو گیا حسن!'' وہ لرزتی آواز میں کہہ رہی تھی۔

''مگر اس دل میں سکون کیوں نہیں ''اترتا'' حسن بے بس تھا اور اسی بے بسی کے احساس نے اس کی آنکھوں کو نمکین پانیوں سے بھر دیا تھا۔

''اس لیے کہ آپ نے اپنی سچائی ان لوگوں تک نہیں پہنچائی۔ جن کے دل ابھی تک دکھے ہوئے ہیں۔ زخمی ہیں، خون رس رہا ہے، آپ نے نیر آنٹی کو اور نویلہ خالہ کو کیوں نہیں بتایا کہ آپ مجرم نہیں۔ ہاں آپ نے جرم کا منصوبہ ضرور بنایا تھا مگر رب تعالیٰ نے آپ کو اس گناہ سے بچالیا اور وہ اپنے بندوں پر اسی طرح مہربان ہے''

''مجھے یقین آگیا ہے مجھے تو اسی وقت یقین آگیا تھا جب توصیف اور قائلہ تابوت میں بند میری آنکھوں کے سامنے آئے میرے دل نے کہا تھا ہمارا دودھ اتنا ناپاک نہیں ہو سکتا نور بانو کا بیٹا ایسا سنگدل تو نہیں ہو سکتا ہمارے دل نے تجھے اسی شب بری قرار دے دیا تھا بیٹے! جب تجھے سزا سنائی جاتی تھی پر تو نے ''سچائی'' بتانے میں آٹھ سال کیوں ضائع کر دیئے ہیں میرے لعل''

اس آواز نے ان دونوں کو چونکا کر رکھ دیا تھا ساشا اور حسن نے بیک وقت گردن گھما کر دیکھا تھا نیر حیات، حسن کے قریب آرہی تھیں پھر انہوں نے حسن کے منہ کو چوم لیا تھا۔

''تجھ میں اور توصیف میں بھلا کیا فرق ہے میرے شہزادے! تو میری نور آپا کا بیٹا ہے تو میرا زیبی ہے''

''خالہ! میں نے کچھ نہیں کیا میں نے قائلہ کو نہیں مارا۔ میں بھلا اسے مار سکتا تھا نہیں، کبھی نہیں'' دونوں طرف دلوں پر جمی برف پگھل رہی تھی ساشا نے ان دونوں کو دیکھ کر نم آنکھوں کو پونچھا تھا اب وہ قبرستان کے احاطے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

رات کا دوسرا پہر شروع تھا جب نیر حیات کی آنکھ عجیب سے شور کی آواز سے کھل گئی تھی پہلے پہل انہوں نے اسے اپنا وہم جانا تھا مگر پھر اس آواز نے گویا ان قدموں کے نیچے سے زمین سرکا دی تھی۔

''نور بانو آپا۔ یہ تو آپا کی آواز ہے'' دوسرے ہی پل وہ بھاگتی ہوئی گیٹ تک آئی تھیں مگر انہیں آنے میں کچھ دیر ہو گئی تھی، آپا گاڑی میں بیٹھ رہی تھیں پھر یہ گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی مگر ان کی نگاہوں نے بڑا ہی عجیب منظر دیکھا تھا اور سماعتوں نے وہ کچھ سنا، جس کے حرف حرف پر دل یقین کی مہر لگا رہا تھا۔

سامنے ساشا اور حسن پھاٹک کے قریب زمین پر بیٹھے تھے وہ جانتی تھیں کہ ساشا کی شادی حسن سے ہوئی ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے روزینہ اور ساشا سے ملنا ملانا کم کر دیا تھا شادی میں شرکت نہ کرنے کی اصل وجہ بھی یہی تھی اگر وہ چاہتیں تو روزینہ کو بتا سکتی تھیں کہ حسن ان کا سگا بھانجا ہے اور ان کے بیٹے کا قاتل بھی مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا کیونکہ ممتا سے بھرے اس دل نے بڑی بہن کے اکلوتے نور نظر کو کب سے معاف کر دیا تھا مگر انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ سچائی کیا ہے وہ کل تک یہی سمجھتی رہی تھیں کہ زیب حسن نے ہی منصوبہ بنا کر ان کے بچوں کا قتل کیا ہے۔

مگر حقیقت کچھ اور تھی سچائی تو یہ تھی جو زیب حسن کے لب ادا کر رہے تھے اور انہیں زیبی کی ہر بات پر یقین آرہا تھا اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو گواہ تھے اور یہ آنسو اسی آنکھ سے بہتے تھے جو آنکھ خوف خدا سے، بند نہیں ہوتی تھی، آٹھ سال سے زیب حسن کی آنکھ نے میٹھی نیند کا لطف محسوس نہیں کیا تھا۔ یہ سزا کیا کم تھی''

آج جب زیبی اور ساشا ان سے الوداعی ملاقات کرنے کے بعد یو کے فلائی کر گئے تھے تو وہ دریچے میں کھڑی بیتے وقت کو سوچ رہی تھیں۔

آج سے کچھ دن پہلے ساشا ان کے پاس آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں زیبی کی ڈائریاں تھیں جن کو بغیر پڑھے بھی وہ جانتی تھیں کہ ان میں درد کی کون کون سی داستان رقم ہے

ساشا جو چند گنتی کے دنوں میں ان کے قریب رہی تھی انہیں بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح پیاری ہوگئی تھی اور وہ روتے ہوئے اپنے شوہر کی زندگی سے اس ''دوسرے پہر'' کی بھیک مانگ رہی تھی۔

اور وہ کیا ایسی سنگدل تھیں ایک بیٹی کو خالی ہاتھ لوٹا دیتیں۔ انہوں نے اسے دوسرا پہر دان کر دیا تھا اب زیب حسن کو رات کی تاریکی میں چھپ کر آنے کی ضرورت نہیں تھی وہ جب چاہتا، فاتحہ کے لیے شہر خموشاں کا رخ کر لیتا ان دو قبروں کا دیدار کرتا پھول چڑھاتا، دعا کرتا اور مطمئن سا لوٹ آتا۔

ساشا نے کہا تھا آپ حسن کو معاف کر دیں۔ خالہ جان! وہ قاتل نہیں ہے''

اور وہ تو آٹھ سال پہلے ہی زیبی کو ہر جرم سے ہر گناہ سے آزاد کر چکی تھی مگر پھر بھی انہوں نے ساشا کے مان کو نہیں توڑا تھا۔

ساشا اور زیبی ہمیشہ کے لیے یو کے نہیں گئے تھے وہ تو صرف نویلہ سے ملنے کے لیے اور اسے لینے کے لیے یو کے گئے تھے۔

وہ قائلہ اور توصیف کو چھوڑ کر لندن نہیں جانا چاہتی تھیں اسی طرح نور بانو آپا بھی واپسی کے سفر سے خوف زدہ تھیں اب وہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے وطن میں رہنا چاہتی تھیں اور زیبی کی خواہش تھی کہ تینوں بہنیں حیات ہاؤس کو آباد کریں نویلہ سے ان کی اور نور آپا کی بات ہو چکی تھی نویلہ بھی پاکستان میں رہنے کے لیے آمادہ تھی۔

بہت سالوں بعد حیات ہاؤس میں ایک ساتھ خوشیوں کی بارات اترنے والی تھی۔

حسن نے جو کچھ اسے بتایا تھا وہ سب کچھ سن کر اور جان کر اسے جھٹکا ہرگز نہیں لگا تھا بلکہ اس کی خوشی کے لیے یہی کافی تھا کہ حسن نے اس پر اعتبار اور اعتماد کے رشتے کو مضبوط کیا ہے اور اور حسن کے اس اعتبار کو اور بھی مضبوط کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

اسے اب حسن کے لیے نویلہ سے معافی چاہیے تھی حسن کے ہر کردہ نہ کردہ گناہ کی معافی، کیونکہ اسے زیب حسن ادھورے دل، اور ادھورے وجود کے ساتھ نہیں چاہیے تھا وہ اس کے ہر خسارے اور پچھتاوے کا خاتمہ چاہتی تھی۔

زندگی کی شاہراہ پر ان دونوں کے حصے کی خوشیاں ان کی منتظر تھیں اور وہ اپنے سفر پر رواں دواں تھے یہ سفر محبت کا سفر تھا کبھی نہ ختم ہونے والا۔

......❁......

ام ایمن

''دفع ہو جائے، نکل جاؤ میرے گھر سے ذلیل خاندان کی بے غیرت عورت'' کوئی اس کے کان کے قریب زور سے چلایا تھا۔ وہ بے ساختہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر چیخنے لگی۔ اس کی چیخیں سناٹے میں بہت دور دور تک گئی تھیں مگر اس ستم گر تک اس کی آواز نہیں پہنچی تھی۔

''میں احمق تھا جو دوسری مرتبہ بھی بی بی کی باتوں میں آ کر دھوکہ کھا گیا۔ پاگل تھا جو تمہیں چاہتا رہا۔ تمہاری عزت کی، تمہیں مان بخشا، سائبان دیا مگر تم بھی بہت نیچ نکلیں'' اس کی چنگھاڑتی آواز ہوا کے دوش پر لہراتی ہوئی اس کے دل میں پیوست ہو کر رہ گئی۔

''میں تم سے نفرت کرتا ہوں، تھوکتا ہوں تم پر''

''نہیں......نہیں، پلیز ایسا مت کہو...... میں مر جاؤں گی، میرے ساتھ اس لہجے میں بات مت کرو۔ تمہیں کیا پتا مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ میں تمہیں کس قدر چاہتی ہوں۔ پلیز اللہ کے لیے میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ میں تو تمہاری داسی ہوں، پرستش کرتی ہوں تمہاری...... تمہیں کیا معلوم اس پاگل دل میں تمہارے لیے کتنی چاہت ہے'' وہ گھور تاریکی میں اس کا عکس تلاشتی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

''یہ سب سچ نہیں تو اور کیا ہے'' وہ چند چیزیں اس کے منہ پر مار کر دھاڑا تھا۔

''یہ سچ ہی تو نہیں'' اک درد کی تیز لہر اس کی کمر میں اٹھی تھی۔

''بتاؤ یہ سب کیا ہے، کیوں تم نے مجھے دھوکہ دیا'' وہ اب بھی چلا رہا تھا۔ اسے بے دردی سے مار رہا تھا۔

''تمہیں مجھ پر ترس نہیں آ رہا'' وہ اپنے محبوب کے پیروں میں جھکی پوچھ رہی تھی اور وہ

نفرت سے اسے دھتکارتا دروازہ بند کر چکا تھا۔

اس پر زندگی کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

اس پر خوشیوں کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

کون تھا اسے اجاڑنے والا، برباد کرنے والا، رسوائیاں دینے والا، اور اس پل کتنا بڑا انکشاف ہوا تھا۔

''کیا تم نہیں جانتیں'' کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

☆☆☆

اندرون شہر لاہور کی تنگ و تاریک گھٹن و حبس زدہ بدبودار گلیاں بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔

چھوٹے چھوٹے دڑبا نما مکان، جن کی چھتیں بارش اور آندھی کے زور پر چیخنے لگتی تھیں۔ خستہ حال دیواروں کا اکھڑا پلستر۔ چھوٹا سا صحن، ٹین کی چھت کا برآمدہ، مئی جون کی گرمی میں زنگ آلود لوہے کی چھت تپ کر آگ اگلنے لگتی تھی۔ برآمدے کیساتھ بنا واحد کمرہ۔ جس میں تین بان کی چارپائیاں، ایک کرسی، کیکر کی لکڑی سے بنی مضبوط میز اور دائیں دیوار پر لگا کمزور روشنی والا بلب۔

ایمن کو یہ بلب اس لیے پسند تھا کہ ابا نے اپنی وفات سے محض چار دن پہلے اٹھائیس روپے کا خرید کر اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔ ناصر علی اس کا باپ جو کہ محکمہ تعلیم میں معمولی سا کلرک تھا۔ جو حلال کھاتا تھا اور حلال کماتا تھا۔ جسے اللہ نے چار بیٹیاں دی تھیں۔ بلا کی خوبصورت اور حسین وجمیل نازک اندام بیٹیاں۔

ان کے محلے کی عورتیں ناصر علی کی بیٹیوں کو دیکھ کر انگلیاں دانتوں تلے دبا لیتی تھیں۔

خالہ نفیسہ اور سکینہ کے گھر کوئی بھی مہمان لڑکی آتی تو سب سے پہلے ناصر علی کی بیٹیوں کا درشن کرنے اس کے گھٹن زدہ مکان میں پہنچ جاتی۔

''اتنی غربت اور یہ بے تحاشا حسن۔ ناصر علی کا گھر نہیں ہیروں کی دکان ہے'' عورتیں منہ ہی منہ میں بدبداتی رہتیں۔

پورے محلے میں صرف ناصر علی کی بیٹیوں نے اسکول اور کالج کے منہ دیکھے تھے ورنہ اس محلے کی اکثریت ان پڑھ تھی۔ مرد مزدوری پیشہ جبکہ عورتیں کوٹھیوں میں کام کرنے جاتی تھیں۔ اس محلے کے ہر گھر میں غربت گویا کنڈلی مارے بیٹھی تھی۔

کمر توڑ مہنگائی اور پیٹ میں ناچتی بھوک سے تنگ آ کر ہی عورتوں نے بچوں سمیت

زہر کی پڑیا نگل لی تھی۔ ناصر علی کی بیوی زینت محلے کا دورہ کرنے کے بعد نت نئی خبریں بیٹیوں کی سماعتوں میں انڈیلتی۔

''ہم جیسے لوگوں کو تو جینے کا کوئی حق نہیں۔ عیش تو بڑے لوگ کرتے ہیں۔''

''یہ بڑے لوگ کون ہوتے ہیں'' اسارہ چیخ کر پوچھتی۔

''جن کے پاس دولت ہے۔ عہدے ہیں اور بنگلے گاڑیاں'' زینت کی آنکھوں میں حسرت کروٹ لینے لگتی تھیں۔

''یہ دولت ہمارے پاس بھی تو آ سکتی ہے'' اسارہ سے چھوٹی اہل نے خلا میں کسی نادیدہ چیز کو تلاش کرتے ہوئے کہا۔

''مگر کیسے......'' امن نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

''وہ میں تمہیں بتاؤں گی'' اسارہ کے لبوں پر مسکان کھل اٹھی۔ اور اس پل ان تینوں سے چھوٹی ایمن کتاب پر سے نگاہیں ہٹا کر اپنی بہنوں کے حسین چہروں سے پھوٹتی روشنیوں کو دیکھتی رہ گئی۔

گاڑی اس پوش علاقے کے انتہائی وسیع و عریض بنگلے کے گیٹ کے سامنے رکی تو ایمن کی سوچوں کو بھی بریک لگ گئے۔

وہ پانچوں ایک ساتھ گاڑی سے اتری تھیں اور ایک ساتھ ہی انہوں نے پورے لان پر اک طائرانہ نگاہ ڈال کر قدم اندرونی حصے کی طرف بڑھا دیئے۔ ان پانچوں کی ہی سوچیں منتشر تھیں۔ وسیع لاؤنج کے چکنے فرش پر احتیاط سے چلتے ہوئے اہل اور امن ماں کا ہاتھ تھامے ایک ایک چیز کے متعلق معلومات دے رہی تھیں۔ جبکہ اسارہ ان سب سے بے نیاز فریج میں سے فریش اورنج جوس کی بوتل نکالے انتہائی نزاکت سے گھونٹ گھونٹ پی رہی تھی۔ اس کی مخروطی انگلیوں والا دودھیا دایاں ہاتھ ٹیبل کی شفاف چمکیلی سطح پر تھرک رہا تھا جبکہ دوسرے ہاتھ میں اس نے بوتل تھام رکھی تھی۔

''ممی! ہمارے گھر کا تمام فرنیچر امپورٹڈ ہے'' ایرانی صوفے کی مخملی سطح پر ہاتھ پھیر کر اہل نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ایمن نے لفظ ممی پر چونک کر پہلے بہن اور پھر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''ممی! اس کوٹھی کو آرڈر پر تیار کروایا گیا ہے۔ پوری کوٹھی میں بچھے قالین دبیز سے

منگوائے گئے ہیں۔ واش رومز کا نقشہ ایک بہترین پرائیویٹ کمپنی نے تیار کیا ہے۔ ہمارے تو باتھ رومز ہی دیکھنے والے ہیں۔ بہترین اسٹائلش نہانے والے ٹب، قیمتی ماربل کا فرش۔ دیواروں میں نصب آئینے، کرسٹل کا شلف، اینٹی گوا سے منگوائے بڑے بڑے واش بیسن۔ گرینڈا کی سب سے اعلیٰ کمپنی کی گلاس ونڈز'' امن کی زبان فراٹے سے چل رہی تھی۔ وہ گویا ایک ہی سانس میں ہر چیز کے بارے میں ماں کو بتا دینا چاہتی تھی۔ اب وہ ماں کو لیے اوپر والے پورشن کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ سب سے اوپر بڑے کمرے میں ورزشی مشینیں رکھی گئی تھیں۔ زینت کی آنکھیں حیرت وخوشی کے احساس سے پھیلتی چلی گئیں۔

اگلی صبح اسمارہ نے ڈھیروں نوٹ امل کی طرف بڑھائے اور کہا۔

''تم اپنی اور ممی کی شاپنگ کر لینا۔ امن اپنی شاپنگ خود کرے گی جبکہ ایمی کے لیے ڈریسز میں خود خریدوں گی''

''ہاں، ٹھیک ہے'' امل نے تابعداری سے سر ہلایا۔ اسمارہ مختصر ناشتہ کرنے کے بعد ہینڈ بیگ اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

''ایمی! کل تم تیار رہنا۔ شہر کے بہترین کالج میں تمہارا ایڈمیشن کروانے جاؤں گی میں'' جاتے جاتے وہ ایمن کو بھی حکم نامہ تھما گئی تھی۔ ایمن نے بے خیالی میں سر ہلایا۔

ان تینوں کے چلے جانے کے بعد زینت نے ڈٹ کر ناشتہ کیا اور پھر اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گئیں جبکہ ایمن اتنے بڑے گھر میں بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ اسے اپنا جامن کا پیڑ والا چھوٹا سا گھر یاد آنے لگا تھا نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں بھیگتی چلی گئیں۔

ابا زندہ تھے تو زندگی میں کتنے رنگ تھے۔ جب غصے کے عالم میں اماں اس کی پٹائی کر کے گھر سے نکال دیتیں تو وہ گھر میں بنے اونچے سے چبوترے پر بیٹھ کر روتے ہوئے ابا کا انتظار کرتی۔ جوں ہی ابا کے سائیکل پر اس کی نگاہ پڑتی۔ وہ دوڑتے ہوئے ابا کی ٹانگوں سے لپٹ جاتی اور ابا بھی اسے گود میں اٹھا کر پیشانی چومتے پھر سائیکل سے بندھا شاپر اتار کر اس کی طرف بڑھا دیتے۔

ابا کا معمول تھا کہ وہ رات کو کبھی بھی خالی ہاتھ نہیں آتے تھے۔ کبھی جلیبی، پکوڑے یا پھر آلو کی ٹکیاں لاتے۔ ایمن کے ہاتھ میں موجود شاپر کو دیکھ کر اماں کی پیشانی پر بل پڑ جاتے تھے اور اسمارہ اور امل بھی ان باسی ٹھنڈے پکوڑوں کو نظر اٹھا کر نہ دیکھتیں۔ کوئی شام ایسی نہیں گزرتی

تھی جب اماں ابا کی لڑائی نہ ہوتی۔ اماں کو اس غربت سے شدید نفرت تھی۔ وہ ابا کی کلرکی کو کوستیں۔ نہ جانے اس کا باپ اتنا صابر اور شاکر کیسے تھا۔ اماں کچھ بھی کہہ دیتیں ابا کے ماتھے پر کبھی سلوٹ نمودار نہیں ہوئی تھی۔ اس کی بہن امن کہتی تھی کہ ''ایمن بالکل ابا جیسی ہے۔ ویسی ہی کم گو، اور صابر و شاکر''

اس کے گھر میں صرف ابا نماز پڑھتے تھے۔ ایمن نے ابا کی طرح باقاعدگی سے نماز پڑھنا شروع کر دی تھی۔ ابا تہجد کے لیے اٹھتے تو کبھی کبھار وہ بھی ابا کے ساتھ ہی اٹھ جاتی تھی۔ یوں آہستہ آہستہ اسے بھی تہجد پڑھنے کی عادت ہو گئی۔

ناصر علی بے حد شریف اور سیدھا سادا انسان تھا۔ معمولی سی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ کلرک بھرتی ہوا تھا۔ بیٹے کے نوکری لگتے ہی ناصر علی کی ماں اپنے جیسے ہی غریب خاندان سے انتہائی خوبصورت اور قدرے فیشن ایبل سی زینت کو بیاہ لائیں۔ زینت اور ناصر علی کے حالات تقریباً ملتے جلتے تھے۔ زینت کو یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک کنویں سے نکل کر دوسرے کنویں میں آ گری ہے۔ ویسی گلیاں، ویسا ہی محلہ اور اس کے میکے جیسا ہی گھر۔

اسمارہ اور امل کی پیدائش کے بعد ان کے حالات پہلے سے زیادہ خراب ہو گئے تھے ننھی منی پھول سی بچیوں کو مارتے پیٹتے وہ جاہلوں کی طرح اپنی ساس سے لڑتی تھی۔ جب کبھی وہ خوبصورت مکانوں اور کوٹھیوں کے سامنے سے گزرتی تو اس کا احساس کمتری عود آتا۔

امن کی آمد کے بعد وہ حد سے زیادہ چڑچڑی اور بد مزاج ہو گئی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر اس کا پارہ چڑھ جاتا۔ ساس کو گالیاں اور کوسنے دیتی۔ وہ بے چاری کان منہ لپیٹے گھر کے کاموں میں جتی رہتی تھی۔ پوتیوں کے چھوٹے چھوٹے کام کرتے ہوئے انہیں کبھی تھکاوٹ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ دبی آواز میں بیٹے سے شکوہ کرتیں۔

''زینت بچیوں کی اچھی تربیت نہیں کر سکے گی''

وہ صبح سویرے اٹھ کر نماز پڑھنے کے بعد بچیوں کو قرآن پاک پڑھاتی تھیں۔ پھر ناشتہ بناتیں۔ بچیوں کو تیار کر کے سکول بھیجتیں۔ دن چڑھے زینت اٹھتی تھی۔ پھر ناشتہ کرتی، تیار ہوتی اور پھر کسی نہ کسی سہیلی کے گھر چلی جاتی تھی۔

اسے بچیوں سے زیادہ اپنی صحت اور حسن کا خیال رہتا تھا۔ وہ جلد کو مزید چمکانے کے لیے نہ جانے کون کون سے ٹوٹکے استعمال کرتی۔ کبھی مالٹے کے چھلکوں کو پیس کر ابٹن بناتی اور کبھی

مختلف کریموں سے چہرے کا مساج کرتی۔ اگرچہ ان تمام چیزوں کے استعمال سے وہ مزید نکھرتی چلی گئی تھی مگر زیتون بانو کو اس کی یہ ادائیں کچھ پسند نہیں تھیں۔

ایمن کی پیدائش پر زینت نے خوب ہی رونا دھونا مچایا۔ وہ بیٹے کی دل میں خواہش رکھتی تھی مگر اس دفعہ بھی اس کے آنگن میں اک اور حسین پری نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ گلابی مائل دودھیا سفید رنگت، شہد رنگ کانچ سی آنکھوں اور سنہری سرخی مائل بالوں والی ایمن کی موہنی صورت زیتون بانو کے دل میں اتر گئی۔ زیتون بانو کو خوش اور مطمئن دیکھ کر زینت کے سر سے اک بھاری بوجھ ہٹ گیا تھا۔

زینت کے پہلے جیسے ہی رنگ ڈھنگ تھے۔ ناصر علی کے جانے کے بعد خوب بن ٹھن کر نہ جانے وہ کہاں جاتی تھی۔ زیتون بانو نے کئی مرتبہ استفسار کیا تھا مگر زینت ہی کیا جو ٹھیک طرح سے کچھ بتا دے۔ ننھی ایمن بھی اب دادی کی ذمہ داری بن چکی تھی۔ ناصر علی نوکری کے ساتھ ساتھ اب ٹیوشن بھی پڑھانے لگے تھے، وہ صبح کے گئے رات کو بہت دیر سے آتے تھے اور آتے ساتھ ہی کھانا کھا کر سو جاتے۔ بیٹے کی نیند سے بند ہوتی آنکھوں کو دیکھ کر زیتون بانو چاہ کر بھی کچھ کہہ نہیں پاتی تھیں۔

موسم گرما یا سرما کی آمد کے ساتھ ہی زینت کو نئے کپڑے بنوانے کا شوق چڑھ جاتا تھا۔ پھر ناصر علی سے لڑ جھگڑ کر وہ پیسے نکلوا کر ہی دم لیتی تھیں۔ اسے اچھا پہننے اور اچھا کھانے کا شوق تھا اور وہ ہر صورت اپنے یہ دو شوق ضرور پورے کرتی تھی۔ اس کے لیے اسے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی تھی۔ پہلے پہلے وہ کپڑے سلائی کیا کرتی تھی۔ شادی کے پہلے پانچ چھ سال وہ لوگوں کے کپڑے سلائی کر کے اپنی خواہشات پوری کرتی رہی تھی۔ مگر اب اس نے اپنی سہیلی نادیہ کے کہنے پر کچھ چور دروازے کھول لیے تھے۔

”کیا اندھا ہونا چاہتی ہو۔ لوگوں کے کپڑے سلائی کر کر کے...... مت پھوڑو اپنی اتنی حسین آنکھوں کو۔“

”تو پھر کیا کروں۔ ناصر کی تنخواہ میں تو مر مر کر گھر کی دال روٹی ہی چلتی ہے۔ میں اپنے اور بچیوں کے کپڑے اسی طرح کانٹ چھانٹ کر کے بنا لیتی ہوں“ جواباً زینت نے اپنا رونا رویا تھا۔ نادیہ نے اس کے بازو میں چٹکی بھری اور پھر مسکرا کر بولی۔

”اپنی اس حسین صورت سے فائدہ اٹھاؤ“

”کیا مطلب......“ زینت کچھ حیران ہوئی۔

”ادھر آؤ میں تمہیں بتاتی ہوں“ نادیہ اس کے کان کے قریب جھکی۔ پھر ان دونوں نے قہقہہ لگایا تھا۔ زیتون بانو نے ناگواری سے ان دونوں کو ہنسی ٹھٹھول کرتے دیکھا اور پھر سر جھٹکتے ہوئے کپڑے دھونے لگیں۔

اگلی صبح زینت گلابی نفیس سا سوٹ پہنے کہیں جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ دل میں چونکہ چور تھا اس لیے گھبراہٹ بھی ہو رہی تھی۔

”اماں! میں ذرا بازار جا رہی ہوں نادیہ کے ساتھ۔ کچھ دیر تک آ جاؤں گی“ اس نے کپکپاتی آواز میں بمشکل کہا تھا اور پھر تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ نادیہ کے گھر میں جھانکا تو وہ بھی تیار کھڑی اسی کا انتظار کر رہی تھی۔

”اتنی دیر کر دی ہے تم نے...... سورج سوا نیزے پر پہنچ گیا ہے“

”کیا کرتی، ناصر دفتر جاتا تو پھر آتی نا، آج وہ کافی لیٹ دفتر گیا ہے“ زینت نے دبی آواز میں منمنا کر کہا تھا۔

”اچھا! ٹھیک ہے اب چلو، پہلے ہی گیارہ بج گئے ہیں۔ روڈ سے رکشا پکڑ لیں گے“

وہ دونوں آگے پیچھے نکل گئی تھیں۔

”جانا کہاں ہے؟“ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے زینت نے پھولی سانسوں کو ہموار کر کے پوچھا۔

”بتا دیتی ہوں اتنی جلدی بھی کیا ہے؟“ نادیہ نے سامنے سے آتے رکشا کو ہاتھ دے کر روکا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستگی سے بولی۔

آدھے گھنٹے بعد رکشا ایک بہت بڑے جنرل سٹور کے سامنے رُکا۔ نادیہ نے پرس سے نکال کر رکشا والے کو دیئے اور پھر وہ دونوں دکان کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئیں۔ جاوید عرف جیدا سامنے سے آتی نادیہ کو دیکھ کر دلبرانہ انداز میں مسکرایا اور پھر بولا۔

”بادشاہو! آج بڑے دنوں بعد درشن کروائے ہیں“ وہ مخاطب نادیہ سے تھا اور دیکھ زینت کی طرف رہا تھا جس نے سر، منہ سیاہ چادر میں چھپا رکھا تھا۔

”یہ کون ہے؟“ جیدا زیادہ دیر اپنے تجسس پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ نادیہ سامنے رکھی کرسی پر بیٹھی اور پھر بولی۔

"پہلے کچھ ٹھنڈا تو پلاؤ پھر تعارف بھی کرواتی ہوں"

"ہاں...... ہاں کیوں نہیں" جیدے نے چھوٹے کو آواز دے کر دو ٹھنڈی بوتلیں لانے کا آرڈر دیا کچھ ہی دیر بعد چھوٹا پیپسی کی دو بوتلیں لے آیا تھا نادیہ نے ایک بوتل زینت کے ہاتھ میں تھما دی تھی جبکہ دوسری بوتل اپنے لبوں سے لگالی اور غٹاغٹ پینے لگی۔ زینت قدرے جھجک گئی تھی۔ پھر نادیہ کے ٹہوکا دینے پر اس نے نقاب ہٹا دیا تھا۔ جیدے نے ٹھٹک کر زینت کے سرخ تمتماتے سفید چہرے کی طرف دیکھا۔ سبز آنکھوں پر گھنی گھنی سیاہ پلکیں سایہ فگن تھیں۔ خوبصورت کٹاؤ والے ہونٹ گلابی لپ اسٹک سے رنگے تھے۔

نادیہ کے ستے ستے سانولے چہرے کے سامنے زینت کا خوبصورت وجود، نکھرا نکھرا گلابی چہرہ اس بلا کی گرمی میں ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار کا کام دے رہا تھا اسی پل زینت نے بھی نگاہ اٹھا کر جیدے کی طرف دیکھا۔ جیدا ابھی بھی مسکرا رہا تھا۔ وہ کافی دیر جیدے کی دکان میں بیٹھی رہی تھیں۔ اس دوران وہ مسلسل زینت سے باتیں بگھارتا رہا اور نادیہ ان تمام اشیا کی لسٹ ذہن میں دہراتی رہی جو جاتے سمے یہاں سے لے کر جانی تھیں۔

"اب دوبارہ کب آئیں گی زینت جی" جیدا چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ڈھیروں آس لیے پوچھ رہا تھا۔

"لگتا ہے تیر نشانے پر لگا ہے" نادیہ دل ہی دل میں مسکرائی۔

"منگل کو چار تاریخ بنتی ہے۔ ہم دونوں خان جی ریسٹورنٹ میں آئیں گے۔ تم بھی وہیں آجانا" زینت سے پہلے نادیہ جھٹ سے بولی تھی۔ جیدے نے دومن کے سر کو اثبات میں ہلایا اور پھر ان دونوں کو تمام مطلوبہ اشیاء دے کر اللہ حافظ کہنے دکان سے باہر تک آیا۔ وہ دونوں مسکراتے ہوئے بھاری بھرکم تھیلے اٹھائے رکشا کی طرف بڑھ گئیں۔

☆☆☆

نادیہ کے ساتھ نے اس جیسی گھریلو عورت کو اچھا خاصا "چالباز" بنا دیا تھا۔ زینت کو اب مردوں کو ڈیل کرنے کا طریقہ آ گیا تھا۔ اشرف قصائی سے لے کر دودھ والے اختر تک وہ سب کو باتوں کے جال میں الجھا کر اپنا مطلب پورا کر لیتی تھی۔ کھانے کے دسترخوان پر اب ذائقے دار چیزیں نظر آنے لگی تھیں۔ ناصر علی کے ساتھ زیتون بانو بھی ٹھٹکی تھیں۔

"میرے بھائی کو کراچی میں بڑی اچھی نوکری مل گئی ہے۔ اس نے پیسے بھجوائے ہیں"

زینت نے منہ بنا کر ساس کو جواب دیا تھا۔

چند دن بعد وہ ایک مرتبہ پھر جیدے سے ملنے خان جی ریسٹورنٹ پہنچ گئی تھیں۔ اصل میں اسے جیدے سے ملنے کا کوئی شوق نہیں تھا بس خان جی ریسٹورنٹ کے مزے دار کھانے کا ذائقہ نہیں بھولتا تھا۔

وہ دونوں رغبت سے کھانا کھاتی رہی تھیں جبکہ جیدا زینت کو للچائی نظروں سے دیکھتا رہا۔

"دفع دور" زینت نے جوس کا گلاس لبوں سے لگایا اور دل ہی دل میں جیدے کو دو چار موٹی موٹی گالیاں دیں۔

گھر آنے سے پہلے اس نے کھانا پیک کروایا اور پھر دونوں ہنستی مسکراتی گھر آ گئیں۔ زینت نے گھر میں داخل ہو کر بچیوں کو آواز دی تھی۔ تینوں ہی بھاگتی دوڑتی آ گئیں۔ مزے دار بریانی اور قورمے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ یکسر زیتون بانو کو بھول گئی تھی جو کہ ایمن کو دلیہ کھلاتے ہوئے کڑے تیوروں سے زینت کو گھورے جا رہی تھیں۔

رات کو ناصر علی آئے تو انہوں نے تمام واقعہ من وعن سنا ڈالا۔ زینت تو گویا آگ بگولا ہو کر چلا اٹھی تھی۔

"یہ بڈھی خواہ مخواہ مجھ پر الزام لگا رہی ہے۔ پوچھ لو نادیہ سے میں اور وہ اس کی سہیلی کے گھر میلاد پر گئی تھیں۔ واپسی پر ان لوگوں نے ہمیں نیاز دی تھی اور یہ تمہاری ماں نہ جانے کیا کیا کہانیاں گھڑے بیٹھی ہے" زینت نے فراٹے سے جھوٹ پر جھوٹ بولے تھے، بے چاری زیتون بانو اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔

دوسرے دن بھی زینت نے منہ پھلائے رکھا تھا۔ جب بھی بولتی جلی کٹی سناتی۔ زیتون بانو لب سیے اس کی لن ترانیاں سنتی رہی تھیں۔

جیدے کے ساتھ چند گھنٹے نادیہ کی موجودگی میں گزارنا کم از کم زینت کے لیے ایک بے ضرر سی تفریح ہی تھا۔ کبھی آئسکریم، کبھی فالودہ اور کبھی خوشبو والا پان چباتے وہ جیدے کے ساتھ دنیا بھر کی باتیں کرتی تھی اور جیدا نثار ہو جانے والی نظروں سے زینت کو دیکھتا رہتا۔ پورے چھ مہینے یہ آنکھ مچولی والا کھیل چلتا رہا تھا پھر جیدے کو اسٹور کے مالک نے نکال باہر پھینکا تو ساری دیوانگی اور طراری ہوا ہو گئی۔ زینت نے بھی اس موٹے کالے جیدے پر تین حرف بھیجے اور ایک مرتبہ پھر چھوٹے سے صحن میں لگے جامن کے پیڑ کے نیچے چھلنگا سی چارپائی پر لیٹ کر

ٹھنڈی آہیں بھرنا شروع کر دیں۔

اسے گھر میں موجود پا کر زیتون بانو نے گویا سکھ کا سانس لیا تھا۔ دو تین سال مزید سرک گئے اس دوران زیتون بانو اپنے خالق حقیقی سے جاملیں تو تمام ذمہ داریاں اور پورے گھر کے کام کا بوجھ زینت کے کندھوں پر آپڑا۔ مرتا کیا نہ کرتا اب اسے صبح صبح اٹھنا پڑتا تھا بچیوں کو اسکول بھیجنا پھر گھر کے نہ ختم ہونے والے کاموں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

اسمارہ نے میٹرک کر لیا تھا مگر گھر کے کاموں کو ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔ باپ کی سپورٹ پا کر اس نے کمپیوٹر کا کورس کرنا شروع کر دیا تھا پھر کالج کھلے تو وہ ایک مرتبہ پھر مصروف ہو گئی۔ زینت کو بھی اب سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ اسمارہ نے بی اے کر کے کسی اکیڈمی میں پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ مختلف شارٹ کورسز بھی کر رہی تھی۔ امل نے بھی گریجویشن کے بعد اسمارہ کی اکیڈمی جوائن کر لی۔ امن سیکنڈ ایئر میں تھی جبکہ ایمن ابھی سیکنڈری کلاسوں میں تھی۔

☆☆☆

ناصر علی کی اچانک وفات نے انہیں ایک دم بند گلی میں لا کھڑا کیا تھا۔ ان کی قلیل پینشن سے گھر کی گاڑی گھسیٹنا بہت مشکل تھا۔

زینت کو ایک مرتبہ پھر نادیہ کی مدد لینا پڑتی۔ یوں ان کی ملاقات وحید ٹھیکیدار سے ہوئی۔ وحید پہلے سے شادی شدہ اور پانچ بچوں کا باپ تھا۔ مگر زینت کی خوبصورتی دیکھ کر اس کا دل بے ایمان ہو گیا یوں زینت نے وحید سے خفیہ نکاح کر لیا تھا وہ باقاعدگی سے وحید سے ملنے جاتی تھیں کبھی کبھار وہ خود بھی آ جاتا۔ اس دوران زینت، ایمن کو پڑوس میں بھیج دیتی تھیں جبکہ دوسری بیٹیاں اس وقت اکیڈمی اور کالج میں ہوتی تھیں۔ صرف ایمن ہی جلدی گھر آ جاتی تھی۔ انہوں نے کبھی بھی بیٹیوں کو وحید کے سامنے نہیں کیا تھا۔

وحید...... انہیں اتنا خرچہ دیتا تھا کہ وہ پورا مہینہ بہت اچھی طرح سے گزار لیتیں۔ گھر میں رنگا رنگ کھانے پکتے۔ اگر کچھ پکانے کو دل نہ کرتا تو ہوٹل سے پکا پکایا آ جاتا۔ نادیہ ان کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر جل بھن جاتی تھی۔ گزرتے وقت نے بے چاری کی کھال مزید جھلسا ڈالی تھی۔ سانولا چہرہ سیاہ ہو چکا تھا۔

اس دن بھی وہ صبح صبح تیار ہو کر ایمن کو بازار جانے کا بتا کر وحید سے ملنے چلی گئی

تھیں۔ وہ جوان بیٹیوں کی ماں تھیں مگر لگتی نہیں تھیں جبکہ وحید ان سے عمر کم ہونے کے باوجود ادھیڑ عمر لگتا تھا۔

وہ زینت کو دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔ پہلی مرتبہ وحید زینت کو اپنے گھر لے کر گیا تھا۔ اس کی بیوی بچوں کے ہمراہ اپنے میکے گئی تھی۔ وحید کا گھر اچھے علاقے میں تھا۔ کافی بڑا اور کشادہ۔ زینت کو بھی ایسے ہی گھر کی خواہش رہی تھی۔ پہلی مرتبہ انہوں نے آرام دہ بیڈ کا سکون اور اے سی کی ٹھنڈک محسوس کی تھی۔

کھانا بھی ان دونوں اکٹھے کھایا۔ اس دوران وحید مسلسل زینت کی تعریفیں کرتا رہا تھا اور وہ نہ جانے کیوں نو عمر لڑکی کی طرح شرمائے جا رہی تھیں۔

پندرہ بیس دن وہ باقاعدگی سے وحید کے گھر آتی رہی تھیں۔

موسم بدلا تو ایمن بیمار پڑ گئی۔ پہلے تو محلے کے حکیم سے دوائی لیتی رہیں مگر جب افاقہ نہ ہوا تو پھر ڈاکٹر اسد کے کلینک لے گئیں۔

دوائی لے کر جوں ہی وہ دونوں کلینک سے باہر آئیں تو سامنے سے وحید کو آتا دیکھ کر وہ ٹھٹک گئیں۔ وحید نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا اس لیے باچھیں کھل سی اٹھیں۔

''زینت! تم یہاں، کیا بات ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے نا اور یہ کون ہے'' وحید کی اماں کے ساتھ بے تکلفی نے ایمن کو قدرے حیران اور خفا بھی کر دیا تھا وہ ناراض ناراض سی سڑک پر بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کو دیکھنے لگی۔

''آں...... ہاں' یہ میری بیٹی ہے اور اسے بخار تھا اسی کی دوا لینے آئی تھی میں'' زینت نے قدرے گڑبڑا کر تعارف کی رسم نبھائی تھی دل پر پتھر کی بھاری سل رکھ کے۔ اب وہ جلد از جلد کھسکنا چاہتی تھیں کیونکہ وحید بڑی پر شوق نظروں سے ایمن کے معصوم کم سن چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''بڑی خوبصورت بیٹی ہے تمہاری'' وحید نے اپنے ہی انداز میں تعریف کی تھی۔ ایمن کے ساتھ ساتھ زینت کو بھی ناگوار گزرا۔

''کبھی لے کر آنا اسے میری طرف اپنا گھر دکھائیں گے اسے۔ ابلتے گٹروں والے محلے کو بھول جائے گی یہ'' وہ مسکرایا تو زینت نے دانت پیس ڈالے۔

''کیا نام ہے اس کا''

"ایمن" زینت نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تھا۔ کیونکہ وہ ایمن کے چہرے پر پھیلتے غصے کو دیکھ رہی تھیں۔

"بڑا پیارا نام ہے بالکل اس کی طرح، ہاں تو ایمن آؤ گی میرے گھر"

"ہاں کیوں نہیں کبھی فرصت میں لے کر آؤں گی اسے" زینت اسے مزید بولتا دیکھ کر سرعت سے بولیں اور پھر ایمن کا ہاتھ پکڑ کر جانے لگی تھیں جب وحید اپنے موٹر سائیکل کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"آؤ میں تم دونوں کو چھوڑ آتا ہوں"

"نہیں ہم رکشا سے چلے جائیں گے" ایمن تنک کر بولی تھی اور پھر تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ اگر چہ وہ ان دونوں سے قدرے فاصلے پر کھڑی تھی مگر پھر بھی ان کی باتیں ایمن کی سماعتوں میں زہر انڈیل رہی تھیں۔ ایمن کا غم وغصے سے برا حال ہو گیا۔ ادھر وحید، زینت سے شکوے شکایات کر رہا تھا۔

"اتنے دن ہو گئے ہیں تم آئی نہیں ہو"

"بتایا تو ہے کہ ایمن بیمار تھی۔ اسی لیے نہیں آسکی" زینت نے دبی آواز میں کہا۔

"اب کب آؤ گی" وحید جان بوجھ کر باتوں میں انہیں الجھا رہا تھا۔

"دو تین دن تک آؤ گی"

"وعدہ رہا" وحید کی نظریں بھٹک بھٹک کر ایمن کے دودھیا نازک پیروں میں الجھ جاتیں۔

"پکا وعدہ"

"میں خود تمہیں لینے آجاؤں گا" اس نے لگاوٹ سے کہا تو زینت نے فوراً ہی انکار کر دیا۔

"نہیں...... تم میری گلی میں بھی مت آنا"

"مگر کیوں؟ تم میری بیوی ہو" وحید نے لفظ بیوی پر زور دے کر کہا تو ان سے کچھ فاصلے پر کھڑی ایمن کے سر پر گویا دھماکہ ہوا تھا۔

"تم میری مجبوریوں کو سمجھو" زینت نے گویا التجا کی تھی۔ بس ہاتھ جوڑنے کی کسر رہ گئی تھی۔ ایمن نے دل میں تنفر کی اک تیز لہر اٹھتی محسوس کی۔

"میرے دل کے تقاضوں کو تم سمجھو" نہ جانے کس فلم کے ڈائیلاگز جھاڑ رہے تھے اس نے زینت مسکرائیں، قدرے لجائیں اور پھر دھیمی آواز میں بولیں۔

"اب اجازت دو"

"دل تو نہیں کر رہا مگر مجبوری ہے" آخری نگاہ ایمن کے سراپے پر ڈال کر وہ زینت سے مخاطب ہوا تھا اور پھر اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گیا۔

وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم گھر آئی تھیں۔ زینت نے تمام راستے خوب کہانی گھڑلی تھی۔ بہت سے جھوٹ سوچ لیے تھے جو انہیں...... ایمن سے بولنے تھے مگر جب ایمن نے کوئی سوال نہ کیا تو وہ یہی سمجھیں کہ ایمن نے کچھ سنا ہی نہیں ہے۔

تیسرے دن جب ایمن کی طبیعت کچھ سنبھلی تو انہوں نے وحید سے ملنے کی ٹھان لی۔ جب وہ نئے کپڑے زیب تن کر کے باہر آئیں تو ایمن جامن کے پیڑ کے نیچے رکھی چارپائی پر گم سم سی لیٹی تھیں۔ انہیں خوشبوؤں میں بسا اور خوب تیار شیار دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔

"اماں! کہاں جا رہی ہیں" ان کی یہ بیٹی جو اپنے باپ کی طرح بہت کم گو تھی۔ عموماً ان ماں بیٹیوں کے معاملات میں ہرگز نہیں بولتی تھی۔ مگر اس وقت اسے تھانیداروں کی طرح تفتیش کرتے دیکھ کر وہ چونک اٹھیں۔

"بازار جا رہی ہوں۔ کچھ منگوانا ہے تم نے"

"جھوٹ مت بولیں۔ آپ اس آدمی سے ملنے جا رہی ہیں" ایمن نے تلخی سے کہا تھا۔ زینت ٹھٹک گئیں۔

"کیا بکواس کر رہی ہو۔ میرا کیا کام ہے اس آدمی کے ساتھ" زینت نے اعتماد سے عاری لہجے پر بمشکل قابو پا کر کہا تھا۔

"اماں! آپ نہ جائیں" وہ اذیت سے لب کچلتے ہوئے بولی۔

"تو پاگل ہو گئی ہے۔ بخار تیرے سر کو چڑھ گیا ہے"

"ہاں اماں، دعا کریں میں پاگل ہو جاؤں۔ میرا شعور چھن جائے۔ میں اس آگہی کے عذاب سے بچ جاؤں۔ جو آپ اور باجیاں کر رہی ہیں میں سب دیکھ رہی ہوں۔ کاش میرے ابا نہ مرتے" ایمن چلا اٹھی تھی۔

"صبح سے لے کر رات تک وہ جانوروں کی طرح بچوں کو پڑھاتی ہیں اپنا دماغ کھپاتی ہیں۔ تب کہیں جا کر ان کا اپنا خرچہ پورا ہوتا ہے اور اگر میں وحید سے نکاح نہ کرتی تو بھوکے مرجانا تھا تم سب نے"

''تو آپ نے ہمیں مرجانے دیا ہوتا۔ اس زندگی سے بہتر موت ہے'' ایمن حلق کے بل چلائی تھی۔

''اچھا، زیادہ بک بک نہ کرو'' زینت نے گویا ناک سے مکھی اڑائی۔

''اماں! وہ آدمی اچھا نہیں ہے۔ آپ وہاں مت جائیں'' ایمن نے دونوں ہاتھ جوڑ کر التجائیہ کہا۔

''اب تم مجھے بتاؤ گی کہ کیا میرے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا'' زینت تنک اٹھیں اور پھر زیرلب بڑبڑاتے ہوئے بیرونی دروازہ عبور کر گئیں۔

☆☆☆

''میں خود کام کروں گی اور اماں کو گھر سے باہر نہیں جانے دوں گی'' رات کے دوسرے پہلے جب پورے عالم پر سکوت طاری تھا۔ لوگ میٹھی نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ چودہ سالہ ایمن نے بڑے عزم کے ساتھ سوچا تھا۔ اماں کی ایک بات تو درست تھی۔ اسارہ اور امل جو کچھ کماتی تھیں خود پر ہی خرچ کر ڈالتیں۔ ان دونوں کی ڈریسنگ بھی بہت زبردست ہوتی تھی۔ مہنگے ترین جوتے، جیولری اور اعلیٰ کاسمیٹکس، امپورٹڈ پرفیومز، دیگر استعمال کی چیزوں پر بے دریغ پیسے لٹاتے ہوئے انہوں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ اماں گھر کی گاڑی کیسے گھسیٹ رہی ہیں۔

بجلی، پانی اور گیس کا بل دینے کے لیے رقم کہاں سے آتی ہے۔ گھر کا چولہا کیسے جلتا ہے۔ دسترخوان پر پکے پکائے رنگا رنگ پکوان کہاں سے آتے ہیں۔ کون اتنا مہربان ہے جو ترس کھا کر گھر بیٹھے بٹھائے مہینے کے شروع میں ڈھیروں نوٹ پکڑا جاتا ہے۔ سوچنے کے لیے وقت تھا کس کے پاس۔ اسارہ اور امل صبح سویرے گھر سے نکل جاتی تھیں۔ واپسی چھ سات بجے کے بعد ہوتی۔ امن کالج سے آ کر ٹیوشن پڑھانے چلی جاتی تھی۔ اماں بھی اکثر گھر سے باہر رہتیں۔

صرف ایمن ہی گھر میں ہوتی تھی اور تقریباً سارے گھر کی ذمہ داری آہستہ آہستہ اس کے کندھوں پر آ پڑی تھی۔ ناشتہ بنانے سے لے کر رات کے کھانے تک اور چھوٹے سے آنگن کی صفائی ستھرائی بھی اسی کے ذمہ تھی۔ اسکول سے واپسی پر وہ آرام کرنے کی بجائے مختلف کاموں میں جت جاتی۔ یوں بہت چھوٹی سی عمر میں اس نے تمام کام سیکھ لیے تھے۔ اس کے پاس واحد ہنر بھی یہی تھا اور ایمن اسی ہنر سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔

اسکول سے واپسی پر وہ گھر جانے کی بجائے طیبہ باجی کی طرف آ گئی تھی۔ طیبہ باجی

درمیانی عمر کی بیوہ عورت اور چار بچوں کی ماں تھیں اور سینیٹر شاہ عالم کی کوٹھی میں کام کرتی تھیں۔

ایمن نے جھجکتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا تو طیبہ حیران رہ گئیں۔

''تم کام کرو گی''

''ہاں......'' وہ نظریں جھکا کر بولی۔

''مگر کیوں؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے''

''ٹھیک ہے، تم خالہ زینت سے پوچھ لو۔ میں تمہیں سہ پہر کو لے جاؤں گی۔ شاہ عالم تو زیادہ تر اسلام آباد ہوتا ہے اس کی بوڑھی بیوی اکیلی رہتی ہے کوٹھی میں یا پھر چھوٹا دیور کبھی کبھار آ جاتا ہے۔ بی بی بہت اچھی عورت ہے۔ بہت خیال رکھتی ہے میرا۔ میں بی بی سے بات کرلوں گی تم سہ پہر کو آیا کرو گی۔ پہلے ٹائم تم نے اسکول جانا ہوتا ہے''

''مجھے کام مل جائے گا نا''

''ہاں، کیوں نہیں؟'' طیبہ نے اسے یقین دہانی کرائی۔ اور اگلی سہ پہر سے اس نے کام پر جانا شروع کر دیا۔ اسکول سے واپسی پر وہ یونیفارم اور بیگم سمیت ہی شاہ عالم کی کوٹھی میں پہنچ گئی تھی۔

وہ اس کوٹھی کی ظاہری خوبصورتی سے بے نیاز نرم گداز قالین کے ڈیزائن پر ہاتھ پھیرتی بی بی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس چلچلاتی دھوپ میں اتنا طویل سفر کر کے یہاں آنے تک وہ مسلسل سوچتی رہی تھی۔ آج اسے ابا بہت یاد آ رہے تھے اور اس کے لبوں سے اک سسکاری نما آواز نکلی تھی۔ چند سرکش آنسو گالوں پر لڑھک آئے تھے۔

شیریں بیگم نے اندر داخل ہوتے ہوئے بہت حیرانی سے سامنے بیٹھی لڑکی کو بغور دیکھا تھا۔ اس پل ایمن نے بھی جھکے سر کو اٹھا اور پھر بی بی کو دیکھ کر احتراماً کھڑی ہو گئی۔

شیریں بیگم ایک ٹک اس کی حسین بھیگی بھیگی آنکھوں اور نم پلکوں پر اٹکے شبنمی قطروں کو دیکھ رہی تھیں۔

وہ لڑکی بلاشبہ بہت خوبصورت تھی۔ شیریں بیگم نے پلکیں جھپک کر ایک مرتبہ پھر ایمن کو سر سے لے کر پیروں تک دیکھا۔ ایمن اب سرعت سے دودھیا نازک ہاتھوں سے آنکھیں اور گال پونچھ رہی تھی۔ سفید یونیفارم میں وہ کنول کے پھول کی طرح شگفتہ لگ رہی تھی۔

شیریں بیگم اس کے ہوشربا حسن سے نگاہیں چراتی صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"کیا نام ہے تمہارا"

"ام ایمن!" وہ انگلیاں مسلتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

"طیبہ کی رشتے میں کیا لگتی ہو" شیریں بیگم اسے نظروں میں تول رہی تھیں۔

"طیبہ باجی ہماری پڑوسن ہیں"

"کیا کیا کام کرسکتی ہو؟"

"سارے کام آتے ہیں"

"اچھی گفتگو بھی کرسکتی ہو" شیریں بیگم نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی......" ایمن نے حیرانی سے جھکا ہوا سر اٹھایا۔

"میرا مطلب ہے کہ تم میرے ساتھ باتیں کرو گی" شیریں بیگم نے اس کی الجھن دور کرنا چاہی تھی۔ ایمن ہونقوں کی طرح انہیں دیکھتی رہی۔

"جی"

"ہاں تو پھر کل سے کام پر آجانا۔ تمہاری جو ڈیوٹی ہوگی سکینہ بتادے گی۔ اب تم جاسکتی ہو" ایمن حیران پریشان سی اٹھی اور پھر گھر آنے تک مسلسل شیریں بیگم کے متعلق سوچتی رہی۔

"اتنی دیر کہاں لگادی" اماں نے اس کے تھکے تھکے چہرے پر نگاہ ڈال کر سرسری سے پوچھا۔

"نوکری کرلی ہے میں نے" ایمن نے آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مار کر بتایا۔ اب وہ اماں کو ملازمت کی تفصیل بتانا چاہتی تھی مگر زینت نے کوئی توجہ نہ دی، نہ ہی نوکری کی نوعیت کے بارے میں پوچھا۔ ایمن کے دل پر بوجھ آپڑا تھا۔

دو بجے سے لے کر پانچ بجے تک اس نے شیریں بیگم کے گھر رہنا ہوتا تھا۔ سکینہ نے اسے بتایا کہ وہ صرف بی بی کو اخبار اور رسائل پڑھ کر سنایا کرے گی۔ ان سے باتیں کیا کرے گی۔ جتنی مرتبہ انہیں چائے کی طلب ہوگی۔ ایمن ان کے لیے اپنے ہاتھوں سے چائے بنایا کرے گی اور وہ ہر پندرہ منٹ بعد گرما گرم کپ چائے کا پیتی تھیں چاہے موسم گرمی کا ہو یا پھر سردی کا۔

یہ کام نہ تو مشکل تھا اور نہ ہی تکلیف دہ۔ مگر جو کام مشکل تھا اور ایمن کو پہاڑ کے برابر

لگتا تھا۔ وہ مسلسل بولنے کا کام تھا۔

شیریں بیگم پچپن ساٹھ سال کی بوڑھی خاتون تھیں۔ بھاری بھرکم سراپا، موٹے موٹے نقوش اور قدرے صاف رنگت...... وہ کافی باتونی خاتون تھیں۔ نہ ان میں نخرہ تھا اور نہ ہی غرور، وہ ایمن سے کافی لگاوٹ کا اظہار کرتی تھیں۔ یہ چار پانچ گھنٹے اس کے بعد خوشگوار گزرتے تھے۔

اتوار کو چونکہ...... چھٹی ہوتی تھی اسی لیے وہ سارا دن شیریں بیگم کے پاس رہتی۔ اس دن وہ ایمن کو اپنی خاندانی تصویریں دکھا رہی تھیں۔ شیریں بیگم پنجاب کے ایک بہت بڑے جاگیردار کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ ان کے خاندان کا سیاست میں ایک نام تھا۔ ان کی شادی اپنے سے پچیس سال چھوٹے چچازاد شاہ عالم سے ہوئی تھی۔

"یہ میرے چچا شاہ عاصم کی تصویریں ہیں" انہوں نے چند تصویریں ایمن کی طرف بڑھائیں۔

"یہ بیٹا ہے، پچا جان کی دوسری بیوی اور یہ ان کا بیٹا شاہ عادل" شریں بیگم نے ایک اور تصویر ایمن کے ہاتھ میں تھما دی۔

"ہمارے خاندان میں دو دو تین شادیوں کا رواج ہے۔ خود میرے بابا نے دو شادیاں کی تھیں" شیریں بیگم نے تلخی سے کہا۔

"جاگیردارانہ قانون کی رو سے مرد کو ہر قسم کی آزادی ہے۔ وہ کھلے عام سب کچھ کرسکتا ہے۔ چاہے شادیاں کرے، طلاقیں دے یا پھر بے وفائی کرے" ان کی آنکھیں نہ جانے کس احساس سے نم ہونے لگی تھیں۔ ایمن خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہی۔ کبھی کبھی وہ اس طرح تلخ ہو جاتی تھیں۔

"خود شاہ عالم نے بھی تو دو شادیاں کی ہیں۔ اگرچہ دوسری شادی اس نے میرے بے حد مجبور کرنے پر کی تھی۔ اب سنا ہے کہ اسے بھی گھر سے نکال دیا ہے اس نے" انہوں نے ٹشو سے آنکھیں صاف کیں اور پھر اسے اپنے بیڈروم میں آنے کا اشارہ کرکے اندر چلی گئیں۔ ایمن پہلی مرتبہ ان کے بیڈروم میں آئی تھی۔

سامنے دیوار پر شاہ عالم کی تصویر جلوہ افروز تھی۔ دوسری دیوار پر کسی نوجوان لڑکے کی تصویریں ٹنگی تھیں۔ بی بی نے بتایا کہ یہ شاہ عادل ہے۔

"عالم کو اگر کسی سے محبت ہے تو وہ عادل کا وجود ہے۔ اسے صرف عادل کی کشش

لاہور کھینچ کر لاتی ہے‘‘ انہوں نے عادل کی تصویر کو اٹھا کر بغور دیکھا اور پھر کارنس پر سجا دی۔

’’ذہانت اور حسن ان دونوں بھائیوں کو ہمارے دادا سے وراثت میں ملے ہیں‘‘

شیریں بیگم بیڈ پر نیم دراز ہو گئی تھیں۔ گھڑی نے پانچ بجائے تو ایمن ان سے اجازت لے کر چلی گئی تھی۔ مہینہ ختم ہوا تو بی بی نے اسے تین ہزار روپے تنخواہ دی۔ ایمن کی آنکھیں خوشی کے احساس سے چھلک پڑی تھیں۔

گھر آ کر اس نے پوری تنخواہ ماں کی ہتھیلی پر رکھ دی تھی۔ زینت نے بغیر کچھ کہے تین ہزار روپے رکھ لیے۔

’’اماں! اب آپ اس آدمی سے ملنے مت جانا‘‘ بہت دیر سوچنے کے بعد ایمن نے بے حد جھجکتے ہوئے کہا تھا۔ ماں سے ایسی بات کرتے ہوئے اس کی زبان میں لکنت آ گئی تھی۔

زینت نے اک غصے سے بھری نگاہ بیٹی پر ڈالی۔

’’یہ تین نوٹ میرے منہ پر مار کر تو نے بڑا تیر مار لیا ہے۔ آسمان سے چھوتی مہنگائی کو دیکھو اور ان تین کاغذ کے نوٹوں کو دیکھو‘‘

’’ضروری تو نہیں کہ اچھا کھائیں اور اچھا پہنیں...... اچار چٹنی سے بھی تو گزارا ہو سکتا ہے۔ ہمارے محلے میں کئی گھر ایسے ہیں جن کا دو وقت چولہا نہیں جلتا اور وہ ایک وقت کی روٹی کھا کر صبر و شکر کرتے ہیں‘‘ ایمن نے دھیمی آواز میں کہا تو زینت بلبلا اٹھیں۔

’’ناصر علی خود تو مرکھپ گیا ہے اور جاتے جاتے اپنی روح تم میں پھونک گیا ہے اری ان تقریروں سے پیٹ نہیں بھرتے‘‘ زینت نے اپنا ماتھا پیٹنا شروع کر دیا تو ایمن بے دلی سے اٹھ کر کمرے میں چلی آئی۔ امل چارپائی پر بیٹھی نفاست سے ناخنوں پر پنک شیڈ کی نیل پالش لگا رہی تھی۔ ساتھ ہی ہلکے اور گہرے رنگوں کی کیوٹکس کا پورا بکس بھرا پڑا تھا۔ ایمن پائنتی کی طرف بڑھ گئی۔

’’لاؤ تمہارے نیلز پر بھی کیوٹکس لگا دوں‘‘ وہ اپنا کام مکمل کر چکی تو ایمن کی طرف متوجہ ہوئی جو کہ پرسوچ نظروں سے چھت کی کڑیاں گننے میں مصروف تھی۔ امل نے اس کا شانہ ہلایا۔

’’کہاں گم ہو۔ میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں‘‘

’’آں...... ہاں، میں نے نہیں لگانی نیل پالش‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’ایک تو نماز پڑھنی ہوتی ہے اور دوسرے مجھے اس کی اسمیل اچھی نہیں لگتی‘‘ ایمن نے وجہ بتائی تو امل اک پل کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔ جب کچھ نہ سوجھا تو بے وجہ ہی ڈانٹنے لگی۔

’’تم نے کس قسم کی نوکری کرنا شروع کر دی ہے۔ پہلے تعلیم تو مکمل کر لو پھر جاب بھی کر لینا۔ اسارہ کو پتا چلا تو بہت ناراض ہو گی‘‘

’’جب میں آپ کے کسی بھی کام میں مداخلت نہیں کرتی تو پھر آپ لوگوں کو بھی میرے معاملات میں بولنے کی ضرورت نہیں‘‘ ایمن نے تلخی سے کہا۔

’’جاب کس قسم کی ہے؟‘‘

’’آج فرصت ملی ہے پوچھنے کی‘‘ وہ استہزائیہ بولی۔

’’تم اتنی تلخ کیوں ہو رہی ہو؟‘‘ امل نے اس کے سرخ چہرے کی طرف دیکھ کر حیرانی سے کہا۔

’’پاگل کتے نے کاٹ لیا ہے‘‘ وہ زہر خند ہوئی۔

’’بکواس نہیں کرو‘‘ امل کی بھی تیوری چڑھ گئی تھی۔

’’تم تینوں نے آنکھیں اور کان بند کر رکھے ہیں۔ تم تینوں ہی بے حس ہو‘‘ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔ امل پہلے حیران اور پھر پریشان ہو گئی۔

’’ایمن کیا بات ہے‘‘

’’تم نہیں جانتیں کیا، اماں نے دوسری شادی کر رکھی ہے‘‘ ایمن نے اپنے تئیں دھماکہ کیا تھا مگر امل ہنسی تو پھر ہنستی ہی چلی گئی۔ ایمن نے اسے زخمی نظروں سے دیکھا تھا۔ امل بمشکل ہنسی پر قابو پا کر بولی۔

’’نکاح کرنا کوئی جرم ہے‘‘

’’جوان بیٹیوں کی مائیں ایسی حرکتیں کریں تو جرم ہی تصور کیا جاتا ہے‘‘

’’پاگل ہو تم بھی......‘‘ امل نے اس کے گالوں پر پھسلتے آنسو پونچھے اور بولی۔

’’جانتی ہو ہمارے ملک کا ایک طبقہ ایسا ہے جہاں اتنی معمولی باتوں پر رونا دھونا نہیں مچایا جاتا۔ باپ دوسری شادی کرے تو ماں طلاق لے کر ضد میں شادی کرتی ہے اور اولاد کو بالکل کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ جیو اور جینے دو کے نعرے پر یقین رکھتے ہیں۔ اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارنے کا سب کو حق ہے۔ تم خواہ مخواہ ٹینشن لے رہی ہو‘‘ امل نے تو گویا بات چٹکیوں

میں اڑادی تھی۔ ان سب کی سوچ بدل چکی تھی۔ ان کا طرز زندگی بھی بدل رہا تھا بس ایک ایمن
ہی اسی دائرے میں کھڑی تھی جہاں اس کے باپ نے اسے کھڑا کیا تھا۔ وہ اس دائرے سے نکلنا
نہیں چاہتی تھی۔ یہ دائرہ اس کی پناہ گاہ تھا وہ اس میں محفوظ تھی اور محفوظ رہنا چاہتی تھی۔

''تم جس کلاس کی بات کر رہی ہو ہم اس کا حصہ نہیں ہیں۔ ہم ان گندی گلیوں میں
رہتے ہیں یہاں کے لوگ غریب ضرور ہیں مگر عزت دار ہیں۔ ہمارے باپ کی اس محلے میں پہچان
ہے۔ عزت ہے، اگر ان لوگوں کو ذرا بھی بھنک پڑ گئی تو ہماری عزت دو کوڑی کی رہ جائے گی''

''ہم نے نہ ان لوگوں سے رشتہ داری کرنی ہے اور نہ ہی اس محلے میں ہمیشہ کے لیے
رہنا ہے'' امن نے لاپرواہی سے کہا تو وہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

''شگفتہ کلیاں سفید چاندنیوں پر بکھری نوحہ کناں تھیں۔ نازک پتیوں کے رخسار زخم
زخم تھے۔ شبنمی آنسو گلابی شام کے دامن میں گر رہے تھے۔ شہر دل کی نازک فصلیں پورے قد سے
ڈھے گئیں۔ گھٹی گھٹی چیخیں اور آہوں کی آوازیں، سسکاریاں لیتی محبت دم بخود تھی۔ شام ہجر بڑی
درد بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ محبت کا جنازہ اٹھ چکا تھا۔ دلوں میں حشر برپا کر دینے والا
سکوت ہر سو پھیل چکا تھا، سناٹوں کے اس......''

''ویلڈن...... ویری ویلڈن'' اس بھرپور مردانہ آواز کو سن کر نہ صرف شیریں بیگم بلکہ
ایمن بھی چونک اٹھی تھی۔ اس نے کچھ گھبرا کر کتاب بند کی اور گڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔

''تم کب آئے ہو عادل......'' شیریں بیگم نے مسکرا کر پوچھا۔ عادل کو دیکھ کر وہ کھل
اٹھی تھیں۔

''امی دس منٹ پہلے''

''اتنے دنوں بعد بی بی کی یاد آئی ہے'' انہوں نے عادل کا ماتھا چوم کر شکوہ کیا تھا۔

''یاد تو میں آپ کو صبح و شام کرتا ہوں۔ بس مصروفیت کی وجہ سے آ نہیں سکا'' وہ ان
کے قریب صوفے پر ہی بیٹھ گیا تھا۔ ایمن باہر نکلنے لگی تو شیریں بیگم نے اسے روک لیا۔

''کہاں جا رہی ہو...... بیٹھ جاؤ ادھر''

''یہ کون ہے؟'' عادل نے دلچسپی سے اس کے گھبرائے گھبرائے چہرے کی طرف دیکھ
کر بی بی سے استفسار کیا۔

''یہ ایمن ہے'' اس مختصر تعارف کے بعد عادل نے مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا اور نہ
ہی اس کی یہاں موجودگی کے بارے میں پوچھا۔ اس نے یہی سمجھا تھا کہ ایمن بی بی کے عزیز و
اقارب میں سے ہے۔ شیریں بیگم خود ہی اسے تفصیل بتانے لگیں۔

''ایمن بہت لائق اور ذہین لڑکی ہے۔ بہت پیاری باتیں کرتی ہے۔ اس کے
آ جانے سے میری تنہائی دور ہو گئی ہے''

''بولتی تو یہ واقعی اچھا ہے'' عادل مسکرایا اور پھر شگفتگی سے بولا۔

''کیا کرتی ہو؟''

''بی بی کو اخبار اور اچھی اچھی کتابیں پڑھ کر سناتی ہوں'' وہ آہستگی سے بولی تھی۔

''میں پوچھ رہا ہوں کہ تم کون سی کلاس میں پڑھتی ہو''

''دسویں جماعت میں''

''ایمن! تم عادل کے لیے اچھی سی چائے بنا لاؤ''

شیریں بیگم نے نرمی سے کہا تو وہ شکر ادا کرتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ عادل دو تین گھنٹے
مزید بیٹھا تھا۔ پھر دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

''عادل کی عادتیں مزاج سب سے مختلف ہے۔ ہمارے خاندان میں کوئی عادل جیسا
نہیں ہے۔ گوٹھ میں سب عادل کو پسند کرتے ہیں۔ دیوانے ہیں لوگ، اس کے گاؤں والوں کی
خواہش ہے کہ عادل بھی سیاست میں آ جائے مگر اسے سیاست سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ کہتا ہے
کہ سیاست اور سیاستدان دونوں گندے ہیں'' اگلے دو ہفتے مسلسل شیریں عادل کی باتیں کرتی
رہی تھیں۔ سنڈے کی صبح وہ خود آ گیا تھا۔

''تم عادل نامہ سن سن کر بور ہو چکی ہو گی'' وہ اپنی بی بی کے مزاج سے واقف تھا۔ اسی
لیے ایمن کو ناشتہ لے کر آتے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''نن نہیں تو......''

''ڈرو مت اور سچ بتاؤ۔ میں اپنی بی بی کو بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ انہیں غصہ
نہیں آتا اور یہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں اور میں جانتا ہوں کہ دن رات میرا ذکر کر کر کے
انہوں نے تم کو بور کر دیا ہو گا''

''اتنی خوش فہمی بھی اچھی نہیں ہوتی'' شیریں نے اسے چڑایا۔

''اب ایمن کے سامنے میری بے عزتی تو نہ کریں'' عادل نے خفگی سے کہا۔

''آؤ ایمن تم بھی ناشتا کرلو'' ایمن کو پلٹتے دیکھ کر شیریں نے اسے آواز دے کر روکا۔

''میں ناشتہ کر کے آئی ہوں'' وہ آہستگی سے منمنائی۔

''چلو، تم ایسے ہی بیٹھ کر ہمارے نوالے گنتی رہنا'' عادل مزے سے بولا۔

''آجاؤ شاباش'' انہوں نے اسے تذبذب میں کھڑا دیکھ کر ایک مرتبہ پھر کہا تھا۔

ایمن مرے مرے قدموں سے چلتی ان کے برابر رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''بھائی نہیں آئے؟''

''نہیں......'' بی بی نے آہستگی سے کہا۔

''کنول نے خلع لے لیا ہے''

''ہاں بتایا تھا مجھے نذیر نے''

''ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا'' عادل نے تاسف سے کہا۔

''عالم کے مزاج کے ساتھ سمجھوتہ کرنا بہت مشکل ہے'' وہ آزردگی سے بولی تھیں۔

''کنول کے بھی رنگ ڈھنگ کہاں اچھے تھے۔ نہ جانے خود کو کیا سمجھتی تھی'' عادل نے غصے سے کہا

''ایک وقت تھا جب کنول نے آ کر میرے پیر پکڑے تھے کہ میں عالی کو اس سے شادی کے لیے مناؤں اور اب دیکھو، تین سال بھی نباہ نہیں کرسکی''

''آپ کو بھی تو کنول کے علاوہ اس دنیا میں کوئی اچھی لڑکی نظر نہیں آئی جس سے بھائی کی شادی کروا دیتیں'' عادل کے انداز میں خفگی تھی۔ شیریں بیگم کی رنجیدگی میں مزید اضافہ ہوگیا۔

''اس وقت تو بہت اتاؤلی ہو رہی تھی کہ اگر عالی نہ ملا تو مرجاؤں گی، خودکشی کرلوں گی''

''بس ڈرامے ہوتے ہیں عورتوں کے اور یہ ہائی کلاس کی عورتیں'' عادل مزید کچھ کہتے کہتے لب بھینچ کر خاموش ہوگیا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو، نہ انہیں مذہب کا پتا ہے نہ ہی اپنی اقدار، روایات اور خاندانی وقار کو دیکھتی ہیں'' انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس آزاد کی۔ ابھی تو وہ شاہ عالم کے متوقع غصے کو برداشت کرنے کی ہمت پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس نے بھی سارا نزلہ انہیں پر گرانا تھا

کہ جو کچھ کیا ہے آپ ہی نے کیا ہے۔ ایمن اس تمام گفتگو کے دوران سر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔

عادل نے خالی کپ ٹیبل پر رکھا اور پھر جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔

''پھر کب آؤ گے؟''

''جب آپ یاد فرمائیں گی''

''میں کب یاد نہیں کرتی، میرے پاس تم لوگوں کی یادیں ہی تو ہیں'' انہوں نے اپنے قریب جھکے عادل کے سر پر بوسہ دیا اور نرمی سے بولیں۔

''خاتون آپ بھی مراقبے سے نکل آیئے'' عادل نے جاتے جاتے مڑ کر کہا اور پھر شیریں بیگم کی طرف رخ کر کے بولا۔

''بی بی! اس کی گردن کے اسپرنگ قدرے ڈھیلے ہیں'' عادل کی شرارت سمجھ کر بی بی مسکرانے لگی تھیں جبکہ ایمن کا سر مزید جھک گیا۔

☆☆☆

اسے شاہ عالم کی کوٹھی میں آتے تین ماہ ہوگئے تھے۔ اس دوران صرف ایک مرتبہ اس نے شاہ عالم کو دیکھا تھا اور وہ شاہ عالم کو دیکھ کر حیران ہی تو رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیوں اس نے شاہ عالم کا تصور بھی شیریں بیگم جیسا بنا رکھا تھا۔ قدرے ادھیڑ عمر، ہلکے سفید بالوں والا...... مگر شاہ عالم کو دیکھ کر اسے اپنے خیالات بدلنے پڑے تھے۔

وہ تو اکتیس بتیس سال کا ایک بھرپور مرد تھا۔ جس کا چہرہ صحت مندی کی سرخی اور خوشحالی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ عادل کے نقوش نرم تھے جبکہ شاہ عالم کے نقوش میں سختی کی جھلک تھی۔ مجموعی طور پر وہ بہت رعب داب والا غصیلا اور قدرے اکھڑ مزاج مرد دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں کا رنگ گہرا سیاہ تھا اور پلکیں خوب گھنی اور مڑی ہوئیں۔ نہ جانے کیوں ایمن ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھتی رہی تھی۔

گھر میں داخل ہونے کے فوراً بعد اس نے زور زور سے بولنا شروع کر دیا تھا۔ وہ مسلسل بی بی کو پکار رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد بی بی حواس باختہ سی کمرے سے باہر آئیں۔ عالم کو غصے سے چلاتا دیکھ کر انہوں نے خفگی سے کہا۔

''عالی! گھر میں نوکر موجود ہیں یہ کیا بدتہذیبی ہے''

''آپ کو نوکروں کی پڑی ہے اور میں جل جل کر خاک ہو رہا ہوں۔ میرا کوئی احساس

نہیں نوکروں کی فکر ہے۔میری اونچی آواز ان کی طبیعتوں پر گراں گزرے گی یا پھر ان کی آرام میں خلل پیدا ہوگا''

''میرا کہنے کا یہ مطلب نہیں'' انہوں جھنجلا کر کہا۔

''آرام سے بات کرو، تم نے مجھے سنانا ہے یا نوکروں کو''

''میرا تو دل یہ چاہتا ہے کہ میں چلا چلا کر ساری دنیا کو سناؤں کہ آپ بنے بی بی صاحبہ، گاؤں والوں کی مرشد خاص، جاگیردارنی شیریں خاتون نے اپنے چچازاد شاہ عالم پر کیسا ستم ڈھایا ہے۔کنول نام کا عذاب میرے سرلا دنے والی آپ ہیں۔ساری دنیا گواہ ہے اس بات کی۔آپ مکر نہیں سکتیں، اور نہ ہی میں آپ کو مکرنے دوں گا''

''کنول نے بہت برا کیا ہے۔ہمارے خاندان کی کوئی عورت عدالت میں نہیں گئی۔اس نے واقعی ہمیں رسوا کرنے کی کوشش کی ہے'' بی بی نے تاسف سے کہا۔

''اور مزید اس بے غیرت نے پورے پچاس لاکھ کا جھوٹا مقدمہ دائر کروادیا ہے'' عالم غصے سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔

''تم نے چچا جان سے بات کی''

''یہ نیک کام وہ خود کر چکی ہے''

''کیا مطلب؟'' بی بی نے الجھ کر عالم کا چہرہ دیکھا۔

''مطلب آپ اس مطلبی عورت سے پوچھیں، جو آپ کے پیروں میں گر گر گڑ گڑاتی رہی تھی اور آپ کو بھی ترس آیا اسی بے غیرت پر......میرا تو پورا ٹائی ٹینک آپ نے ڈبو ڈالا ہے'' اس کے شکوے ہی ختم نہیں ہو رہے تھے۔

''اور تو کوئی لڑکی آپ کو مظلوم نظر نہیں آئی اس بھری دنیا میں بس اسی کے مگر مچھ جیسے آنسوؤں سے متاثر ہوئی تھیں آپ''

کنول، شاہ عالم کی کلاس فیلو تھی۔پورے چار سال اکٹھے گزارے تھے انہوں نے، نہ جانے کب وہ شاہ عالم کی اسیر ہوئی تھی۔دونوں گھرانے ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے اور کچھ کنول کو بی بی کا تعاون درکار تھا لہٰذا ان کی شادی میں شاہ عالم کے دبے دبے انکار کے علاوہ کوئی رکاوٹ نہیں تھی اور اس کے انکار کی بھلا بی بی کے نزدیک کیا اہمیت تھی۔وہ تو خود شاہ عالم کو شادی کے لیے ان دنوں فورس کر رہی تھیں۔انہوں نے جو دکھ، اپنی ذات پر جھیلے تھے اور جو ہجر کے تنہا

موسم، تنہا راتیں کاٹی تھیں وہ شاہ عالم کا نصیب نہیں بننے دینا چاہتی تھیں۔

''شاہ عالم جس نے آنکھیں ہی ان کی گود میں کھولی تھیں۔وہ جوان کے خاندان کا پہلا وارث تھا۔جس کی آمد کی خبر سن کر ان کے دادا سفید کلف زدہ پگڑی کو اتار کر بھری دوپہر میں اللہ کے حضور سربسجود ہو گئے تھے جس کی آمد پر گویا ایک جشن کا سا سماں تھا۔

پچیس سال بعد سید وجاہت حسین کی حویلی کو وارث ملا تھا۔بڑے بیٹے کی اکلوتی بیٹی کو دیکھ کر ان کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔انہیں یقین ہو چلا تھا کہ وہ پوتے کی شکل دیکھے بغیر اس دنیا سے چلے جائیں گے۔

شاہ عالم کی پیدائش کے دس سال بعد چچا جان کی دوسری بیوی بینا سے عادل پیدا ہوا۔اس وقت بھی حویلی میں خوشیوں کی بارات اتر آئی مگر شیریں کے دل سے آہستہ آہستہ ہر خوشی کا موسم روٹھتا جا رہا تھا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے بالوں میں چاندی کے تار جھلملانے لگے تھے۔

اٹھتیس سال کی عمر میں ان کے دادا نے اپنی موت سے چند ماہ پہلے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھولنے والے ان سے بے تحاشا لاڈ کرنے والے کم سن شاہ عالم سے نکاح کر دیا۔

وہ جو نکاح کے مفہوم سے ہی ناواقف تھا جسے بس اتنا پتا تھا کہ اس کی پیاری بی بی اب گاؤں کی بجائے شہر اس کے پاس ہمیشہ کے لیے رہیں گی۔وہ جو بس اسی بات پر اترایا اترایا پھر رہا تھا۔اس تکلیف دہ حقیقت سے یکسر ناواقف تھا۔

یہ ایک بے جوڑ شادی تھی۔اونچی حویلیوں میں ایسی بے جوڑ شادیاں اکثر انجام پائی جاتی تھیں اور اکثر ہی حویلی کی مظلوم بے زبان عورتوں پر عذاب اترتے تھے۔ان پر بھی ایک عذاب اترا تھا جس نے ان کی آنکھوں میں ہمیشہ کے لیے دھواں بھر دیا۔ان کی پھوپھی کو بھی سولی پر چڑھایا گیا تھا۔فرق صرف اتنا تھا کہ ان کی پھوپھی حویلی کے ایک کمرے میں محصور کر دی گئی تھیں اور انہیں کھلی فضا میں رہنے کی اجازت دے کر گویا ان کے بڑوں نے ان پر احسان عظیم کیا تھا۔

اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ حویلی کی بیٹیاں بند کمروں میں گھٹی گھٹی سسکیوں کے دوران بارگاہ الٰہی میں سربسجود صرف ایک ہی دعا مانگا کرتی تھیں۔

''پروردگار عالم! اب کبھی اونچے شملے والوں کو ''بیٹی'' کی نعمت سے نہ نوازنا'' جب

شاہ عالم سترہ سال کا ہوا تب وہ بڑھاپے میں قدم دھر چکی تھیں۔ ان کے ارمان، خواہشات، امنگیں، امیدیں سب ریت کا ڈھیر بن چکی تھیں۔ ان کے دل میں خوابوں کا جگمگاتا تاج محل ڈھے کر چکنا چور ہو چکا تھا۔ اب وہ صرف ایک کھنڈر مکان تھیں۔ اگر ان کے لب کبھی مسکراتے بھی تھے تو صرف عالم اور عادل کو دیکھ کر، اس دنیا میں اب یہی دو خون کے رشتے باقی تھے اور وہ ان کے شاد آباد رہنے کی ہمیشہ دعا کرتی تھیں۔

''یہ دونوں ان کے باپ دادا کے حقیقی وارث تھے۔ ان کی جاگیروں اور جائیدادوں کے وارث، ان کی نسل کو آگے بڑھانے والے۔

''کہاں گم ہوگئی ہیں...... میں ان دیواروں سے تو مخاطب نہیں ہوں'' عالم کی آواز انہیں ماضی سے کھینچ لائی تھی۔

''کیا کہہ رہے تھے تم؟'' انہوں نے سنبھل کر کہا تو عالم کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''اپنی غمناک داستان سنا رہا ہوں اور آپ سے التجا ہے کہ اس پر غور کریں''

''میں بات کروں گی کنول سے''

''کیا بات کریں گی'' عالم نے تنک کر پوچھا۔

''یہی کہ جلد بازی کے فیصلے نقصان پہنچاتے ہیں۔ اسے یہ انتہائی قدم نہیں اٹھانا چاہئے تھا''

''فار گاڈ سیک بی بی'' اس نے غصے کے عالم میں اپنے ماتھے پر مکا رسید کیا۔

''اس چالاکو نے پہلے ہی آپ کو بہت لوٹا ہے مزید اس کے چکر میں آنے کی ضرورت نہیں، آپ اور ڈیڈی نے تو حد ہی کر دی تھی۔ آپ نے سارے خاندانی زیورات اٹھا کر اس کمینی کو دے دیے تھے اور ڈیڈی نے دوست کی محبت میں پورے ڈیڑھ کروڑ کا پلاٹ کنول کے نام کر دیا''

''تحفہ دے کر جتاتے نہیں ہیں'' بی بی نے گڑبڑا کر کہا۔

''میں تو اس کے حلق میں سے ہر چیز نکلواؤں گا۔ ایسے ہی تو ہضم نہیں کرنے دوں گا اپنے خون پسینے کی کمائی کو'' وہ تن فن کرتا باہر نکلا اور اندر آتی ایمن سے بری طرح ٹکرا گیا۔ اس کے ہاتھ میں جگ گلاس تھے۔ جگ کا مشروب شاہ عالم کی قیمتی شرٹ کو داغدار کر گیا تھا۔

''اندھی ہو دیکھ کر نہیں چل سکتیں۔ نہ جانے کن احمقوں بلکہ اندھوں کو بی بی نے

گھر میں رکھا ہوا ہے'' وہ زیر لب بڑبڑاتا غصے سے واپس پلٹ گیا تھا جبکہ ایمن کو واپس پلٹنا بھول گیا تھا۔

واپسی کے راستے اجنبی ہو گئے تھے۔

واپسی کے راستے کھوٹے ہو گئے۔ نئی راہ، نئی منزل اور اجنبی راہی...... امن ایمن کا دل اسیر ہو گیا تھا۔ شاہ عالم کی محبت کا اسیر۔

اسے اپنے سے اتنے بڑے مرد سے محبت ہوگئی تھی۔ پورے بیس دن، رات رات بھر جاگنے کے بعد اس نے دل ہی دل میں اعتراف محبت کر لیا تھا۔

''محبت کیا ہوتی ہے'' بہت دن خود سے الجھتے رہنے کے بعد اسے محبت کے مفہوم کا پتا چلا تھا۔

کسی کو رات رات بھر سوچنا، صرف ایک نظر دیکھنے کے لیے بے قرار رہنا۔ یہ ہی محبت ہے۔

وہ جو اس کی طویل دعاؤں میں حصہ لینے آ گیا تھا ایمن اسے محبوب نہ کہتی تو کیا کہتی۔

اس نے کبھی بھی اللہ سے اس کے ساتھ کی دعا نہیں مانگی تھی۔ اس نے کبھی بھی شاہ عالم کی ہمراہی کا خواب نہیں دیکھا تھا۔ اس نے آنکھوں میں خوابوں کے جہان نہیں آباد کیے تھے۔

وہ اپنی حقیقت سے آشنا تھی اس لیے چاند کی تمنا کیسے کرتی۔ تاریکیوں میں رہنے والے روشنیوں کے خواب نہیں دیکھتے۔ وہ جانتی تھی کہ شاہ عالم کی حویلی کی فصیلیں بہت اونچی ہیں اس کا خاندان بہت اعلیٰ ہے اور ایمن تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔

شاہ عالم واپس اسلام آباد جا چکا تھا اسی لیے تو اتنی بڑی کوٹھی بالکل ویران ہوگئی تھی۔

کبھی کبھی شاہ عالم کی آمد قدرے ہلچل مچا دیتی۔

بی بی نے اس کی تنخواہ میں دو ہزار کا مزید اضافہ کر دیا تھا۔ ایمن کا تشکر کے احساس سے سر جھک گیا۔

بی بی نے اس پر احساس کیا تھا اور وہ احسان فراموش ہرگز نہیں تھی۔ وہ ان کی پہلے سے بھی زیادہ خدمت کرنے لگی تھی۔ اکثر ان کے پیر دباتی۔ مالش کرتی۔ عادل ایمن سے مطمئن تھا۔ اکثر کچھ دیر رک کر اس کا حال احوال پوچھ لیتا اور پھر آہستگی سے یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتا۔

''تم اچھی لڑکی ہو'' یہ چند الفاظ ایمن کو دنوں سرشار رکھتے تھے۔

اپنی ماں بہنوں کے انداز دیکھ کر اسے یقین تھا کہ کوئی بھی اب انہیں اچھا تسلیم نہیں کرے گا۔

اتوار کے روز اس نے چھٹی کر لی تھی۔ آج کے دن اس نے اپنے بہت سے ادھورے کام سرانجام دینا تھے۔

سب سے پہلے اس نے کپڑے دھوئے بھرپور گھر کی صفائی کی۔ امن گھر پر ہی تھی جبکہ اسارہ اور اماں صبح سے ہی غائب تھیں۔ اماں بھی نہ جانے کہاں گئی تھیں۔ ایمن اپنا کام مکمل کر کے اندر آئی تو امن کو موبائل فون پر مصروف پایا۔ اس کے ہاتھ میں بہت قیمتی موبائل سیٹ تھا۔ اسے اندر آتا دیکھ کر امن نے بات کو مختصر کر کے سمیٹا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''کیوں اس کڑکتی دھوپ میں اپنے حسن کا ستیاناس مارنے کے لیے صفائیوں میں جتی ہو۔ یہاں کون سا کسی شہزادہ عالم نے آنا ہے جس کے لیے اس قدر صفائی ستھرائی کی جائے۔ دھوپ میں رنگ خراب ہو جائے گا۔ اتنی فریش اسکن ہے تمہاری خواہ مخواہ اپنی انرجی اس سے ڈربے نما مکان پر ضائع کر رہی ہو۔ دیکھنا عنقریب ہم کسی شاندار گھر میں شفٹ ہونے والے ہیں۔ وہاں جا کر اپنے ماسیوں والے تمام شوق پورے کر لینا'' اب وہ کسی مہنگی کریم کے ڈبے کو ہاتھ میں لے کر اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

''آؤ ادھر میں تمہارے چہرے کا مساج کرتی ہوں''

''نہیں...... میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کرتی'' ایمن نے ناگواری سے کہا۔

''نہ جانے کس بڈھے کی روح تمہارے اندر سما گئی ہے'' امن نے اپنی بات کہہ کر خود ہی مزہ لیا۔

''تم کس سے فون پر باتیں کر رہی تھیں؟''

''میرا دوست ہے زوہیب'' امن نے بغیر جھجکتے پاؤں جھلاتے ہوئے بتاتا تو ایمن حق دق سی رہ گئی۔

''دوست'' وہ زیر لب بڑبڑائی۔

''ہاں، جس اکیڈمی میں جاب کرتی ہوں میں زوہیب ہی اس کا مالک ہے...... اس نے خود میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ بقول اس کے میں اسے بہت اچھی لگتی ہوں''

''یہ دوستی کس حد تک ہے'' ایمن نے کھوئی کھوئی آواز میں پوچھا۔

''وہ مجھ سے محبت کرتا ہے'' امن گویا قسطوں میں ہر بات بتا رہی تھی اب کے ایمن قدرے چونکی۔

''محبت......''

''ہاں......'' امن مسکرائی۔

''کیا وہ تم سے شادی کرے گا''

''ہاں'' امن کی آنکھیں جگمگانے لگی تھیں شاید محبت کے احساس سے۔

''تمہیں کیسے یقین ہے''

''مجھے اس کی ہر بات پر یقین ہے''

''اس نے تم سے شادی کا وعدہ کر رکھا ہے''

''ہوں......'' امن نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا وہ اس گھر میں بارات لے کر آئے گا؟'' ایمن نے قدرے تلخی سے کہا تو امن مسکرائی۔

''نہیں......''

''تو کیا کسی ہوٹل میں بک کرواؤ گی'' اس کا لہجہ زہر زہر تھا۔

''نہیں...... وہ بارات لے کر ڈیفنس آئے گا''

''کیوں کوئی بنگلہ شنگلہ تمہارے نام لگوانے کا ارادہ ہے اس کا'' ایمن نے طنزیہ کہا۔

''زوہیب اتنا امیر بھی نہیں ہے''

''پھر بھی تم ایسے شخص سے شادی کرو گی جس کے پاس دولت کے انبار نہیں ہوں گے اور جو تمہیں گھر بھی نہیں لے کر دے سکے گا'' ایمن نے بہت گہری بات کہی تھی امن کچھ پل سوچتی رہی۔

''تم بہت سیانی ہو گئی ہو ایمن! نہیں تم شروع سے ہی بہت عقلمند ہو'' امن نے اسے سراہتے ہوئے کہا۔

''زوہیب اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہے، اس کی چار بہنیں ہیں اور اس کے پاس بہت شاندار گھر پہلے سے ہی موجود ہے جس میں زندگی کی ہر سہولت میسر ہے اور پتا ہے ایمن! مجھے اس کے علاوہ مزید کسی اور شے کی چاہ بھی نہیں۔ بس ایک اچھا سا گھر ہو، محبت کرنے والا ہم سفر اور بس، مجھے مزید کسی چیز کی ہوس نہیں''

''کمال ہے تم اسارہ باجی اور اماں کی طرح نہیں سوچتیں، ان کے اندر کس قدر ہوس ہے بے تحاشا امیر ہونے کی'' ایمن نے تلخی سے کہا۔

''ہر ایک کو اپنا معیار زندگی بلند کرنے کا حق ہے۔ ہم کہاں تک کنویں کے مینڈک بنے رہیں گے۔ اپنے اردگرد نظر دوڑاؤ کتنی ہی لڑکیاں ہمارے جیسے گھروں کی شادی کی آس لیے ماں باپ کی دہلیز پر بیٹھی بوڑھی ہوگئی ہیں صرف اور صرف اچھے رشتے کے انتظار میں اور جو بیاہی جا چکی ہیں ان کی زندگی بھی جہنم سے کم نہیں، نکھے، نشئی کلرک اور جمعدار قسم کے شوہروں کے ساتھ زندگی گزارنا کسی عذاب سے کم نہیں اور پھر ان کے درجن بھر بچے'' امن نے زہریلے لہجے میں کہا اور پھر مزید بولی۔

''یہاں رہ کر ہم کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ زوہیب میرے ساتھ کبھی ان بدبودار گلیوں میں آئے گا۔ ہرگز نہیں بعض باتیں میں نے مصلحتاً اس سے چھپائی ہیں''

''غربت کوئی اتنا بڑا گناہ نہیں ہے جس کی پردہ پوشی کی جائے''

''اونہہ...... محض افسانوی باتیں، تم کیا سوچتی ہو کہ کبھی کسی انجینئر، ڈاکٹر یا بینکر کی ماں تمہیں یہاں سے بیاہ کر لے جائے گی تو یہ تمہاری بھول ہے نادان شہزادی''

''میں نے اتنے اونچے خواب کبھی نہیں دیکھے۔ مجھے ادراک ہے کہ میں کیا ہوں اور میری حقیقت کیا ہے'' ایمن نے سنجیدگی سے کہا۔

''ضروری تو نہیں کہ ہماری ماں کی شادی ایک کلرک کے ساتھ ہوئی ہے اور ہم بھی ایسے ہی کسی رشتے کی آس لگائے اس چوزوں کے ڈربے میں بیٹھی رہیں، تمہیں میری باتیں آج نہیں کچھ وقت گزر جانے کے بعد سمجھ میں آئیں گی'' امن نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''کون سا قارون کا خزانہ ہاتھ لگا ہے کہ آپ لوگ ایک دم اونچی اونچی باتیں کرنے لگی ہیں۔'' ایمن نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہمارا اصل خزانہ تو اسارہ ہے'' امن مسکرائی۔

''کیا مطلب؟'' ایمن نے حیرت سے کہا۔

''نہ جانے کس دنیا میں رہتی ہو میری بھولی شہزادی! اسارہ نے ایک اشتہاری کمپنی جوائن کر لی ہے اس کے علاوہ وہ ماڈلنگ بھی کرے گی، عنقریب وہ ٹی وی پر نظر آئے گی۔ اسے تو ابھی سے ہی اتنی بڑی بڑی آفرز مل رہی ہیں'' امن کے انکشاف نے اس کے پیروں تلے سے

زمین کھینچ لی تھی۔

''اسارہ باجی ماڈلنگ کریں گی''

''ہاں''

''ابا کی عزت خاک میں ملانے کا ارادہ ہے آپ لوگوں کا'' ایمن نے تنفر سے کہا۔

''احمق لڑکی! آج کل تو اتنے بڑے بڑے خاندان کی لڑکیاں ماڈلنگ کرتی ہیں۔ اس میں ابا کی عزت پر کوئی حرف نہیں آئے گا، بس ہم لوگوں کا اسٹیٹس بہت بہتر ہو جانے کی امید ہے'' امن نے لاپروائی سے کہا۔

''ایسا نہیں ہونا چاہیے'' وہ بھرائی آواز میں بولی۔

''اسارہ اپنی مرضی کی مالک ہے۔ اس نے اپنے فیصلوں میں کبھی کسی کی مداخلت برداشت نہیں کی خواہ وہ اماں ہی کیوں نہ ہوں'' امن نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

''مگر میں ضرور باجی کو روکوں گی''

''یہ بھی کر کے دیکھ لو'' امن نے تمسخر اڑایا۔

''جب اچھا کھانے اور بہترین پہننے کو ملے گا تو سارے نخرے بھول جاؤ گی''

''میں نے کہا نا کہ میں تم لوگوں جیسی نہیں ہوں''

''بہت شوق ہے تمہیں منفرد بننے کا۔ کون سا ایوارڈ ملے گا تمہیں ایسی باتیں کر کے۔ خواہ مخواہ اپنا خون جلاتی ہو گڑیا'' ایمن نے اس کے گال پر چٹکی بھر لی۔

''ایسے ڈائیلاگ افسانوں میں سجتے ہیں انسانوں کو اپنی زندگی بنانے کے لیے خود ہاتھ پاؤں مارنے پڑتے ہیں۔ جب ہم لوگ اپنی کوٹھی میں شفٹ ہوں گے تو دیکھنا کیسے لوگ ہمارے قدموں میں بچھ جائیں گے''

''کیا آپ کو اپنے رب پر یقین نہیں'' ایمن نے بہت ٹھہر ٹھہر کر کہا تھا۔ امن اک پل کے لیے لاجواب ہوگئی۔

''حلال روزی میں برکت ہے اگر میرا باپ رشوت لیتا تو نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوتا مگر اس نے کم کھانے اور ستھرا کھانے کو ترجیح دی مجھے افسوس ہے کہ تم سب کی رگوں میں میرے باپ کا خون دوڑ رہا ہے جو کہ کبھی بیماری کی حالت میں بھی مسجد جانا ترک نہیں کرتا تھا۔ تم سب میں صرف اماں کے خون کی تاثیر رچی بسی ہے۔ مادیت پرستی، ہوس اور لالچ...... رگوں میں

خون کی طرح گردش کر رہا ہے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اللہ نے مجھے ان زہریلی لعنتوں سے بچا رکھا ہے‘‘ ایمن نے بھرائی آواز میں کہا اور پھر کمرے سے نکل گئی تھی امن کو سوچوں میں گم چھوڑ کر۔

☆☆☆

’’آپ نے ٹھیکیدار سے ملنا نہیں چھوڑا‘‘

’’نہ، تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تھانیدارنی لگ گئی ہو تم ہم سب پر۔ اب سانس بھی تم سے پوچھ کر لینا پڑے گا‘‘ زینت تو گویا آگ بگولا ہو گئی تھیں ایمن کا انداز ملاحظہ کر کے۔

’’آپ آئندہ اس سے نہیں ملیں گی‘‘ ایمن نے دبی آواز میں کہا۔

’’مجھے تمہاری اجازت درکار نہیں ہے‘‘ زینت نے گویا ناک پر سے مکھی اڑائی۔

’’اماں! لوگ باتیں کرتے ہیں کہ نہ جانے زینت کہاں بن ٹھن کر جاتی ہے‘‘ ایمن نے ماں کو احساس دلانا چاہا تو زینت کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

’’لوگوں کی پرواہ کرتی ہے میری جوتی کسی کی جرأت ہے میرے متعلق بات کرے زبان نہ کھینچ لوں میں ان بدچلن عورتوں کی جو تمہارے کانوں میں نہ جانے کیا کیا پھونکتی رہتی ہیں‘‘ زینت نے ہاتھ نچا کر کہا۔

’’اونہہ...... لوگ کہتے ہیں کہ جوان بیٹیوں کی ماں اور اتنے نخرے، کیوں ایسا لباس پہن کر باہر نکلتی ہیں کہ لوگوں کو بات بنانے کا موقع مل سکے‘‘

’’تم کون ہوتی ہو اماں پر حکم چلانے والی‘‘ کمرے میں موجود اسمارہ نے چلا کر کہا تھا اور پھر سرعت سے باہر نکل آئی۔

’’اماں نے جو کچھ کیا ہے آپ کیوں نگاہ چرا رہی ہیں باجی اس حقیقت سے، اگر کسی کو خبر ہو گی تو پھر کیا عزت رہ جائے گی ہماری‘‘ ایمن نے سہم کر کہا۔

’’اماں نے جو بھی کیا ہماری بہتری کے لیے کیا ہے، تمہیں کوئی ضرورت نہیں ان پر الزام لگانے کی‘‘ اسمارہ کا چہرہ حد درجہ سرخ ہو گیا تھا۔

’’آپ کی سپورٹ اماں کو حاصل ہے، اسی لیے یہ کسی طرف توجہ نہیں دے رہیں، ایک بات کہوں باجی! آپ سب اپنے ساتھ اچھا نہیں کر رہیں۔ آپ لالچ......‘‘

’’بہت بک بک کرنے لگی ہو تم، ہم لالچی ہیں‘ بدکردار ہیں، گھٹیا ہیں اور آپ بہت عزت دار خاتون، تو پھر چلی کیوں نہیں جاتیں تم یہاں سے۔ دفع ہو جاؤ ہمیشہ کے لیے۔ ہم جیسے

گھٹیا لوگوں کے ساتھ تمہارا کیا کام۔ کیوں رہتی ہو اس گھر میں جس کا کرایہ ادا کرتی ہوں۔ کسی عزت دار گھرانے میں پناہ لے لو، میں دیکھوں گی کون تمہیں سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے۔ باہر نکلو بھیڑیئے تاک لگائے بیٹھے ہیں...... اونہہ‘‘ وہ غصے سے مسلسل چلا رہی تھی۔ اماں نے فوراً اٹھ کر باجی کو سمجھانا شروع کر دیا۔

’’بچی ہے، نادان ہے۔ آہستہ آہستہ سمجھ جائے گی‘‘

’’اب یہ بچی نہیں رہی، میٹرک کی اسٹوڈنٹ ہے‘‘ اسمارہ نے تنفر سے کہا۔

’’ہمارے جیسوں کا بچپن کہاں، ہم لوگ جس ماحول کی پیداوار ہیں وہاں شعور اور آگاہی کا احساس نوعمری میں ہی ہو جاتا ہے۔ ہم پر زندگی کی تلخ حقیقتیں جلد آشکارا ہو جاتی ہیں ہم نے کہاں بچپن کی خوب صورتیوں کا مزا لیا ہے۔ ہمیں تو آگہی کے عذاب نے بہت پہلے ہی جکڑ لیا تھا‘‘ ایمن نے تلخی سے سوچا۔

کچھ دن مزید سرک گئے، ان دنوں موسم میں پہلے جیسی شدت باقی نہیں رہی تھی۔ گرمی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ ایمن کے میٹرک کے امتحانات بھی ختم ہو چکے تھے۔ اب وہ زیادہ وقت بی بی کے پاس گزارنے لگی تھی۔ اس نے بی بی کی لائبریری سے اچھی اچھی کتابیں لے کر فارغ اوقات میں پڑھنا شروع کر دی تھیں۔ اکثر وہ ایک دو کتابیں گھر بھی لے جاتی۔

اس دن بھی وہ صبح صبح ہی بی بی کی طرف آ گئی۔ سب سے پہلے ان کا ناشتا اپنے ہاتھوں سے بنایا اور پھر ان کے بیڈروم کی طرف آ گئی۔ بی بی جاگ رہی تھیں اور کسی کے ساتھ فون پر مصروف تھیں۔ انہیں کبھی غصہ نہیں آیا تھا مگر اس وقت وہ غصے میں لگ رہی تھیں۔

’’عالی! تم نے ایسی حرکت کی کیوں، تمہیں یہ سب زیب نہیں دیتا‘‘

’’میں نے اچھا کیا ہے اس کے ساتھ یہی کچھ ہونا چاہئے تھا‘‘ ایئر پیس سے شاہ عالم کی چنگھاڑتی آواز سنائی دی تھی۔ ایمن نے ٹرالی گھسیٹ کر بیڈ کے قریب کی اور پھر بی بی کا اشارہ پا کر خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔

’’تم نے کنول کے بھائی پر جھوٹا مقدمہ بنوایا ہے مجھے یقین نہیں آتا عالی! تم منتقم مزاج تو نہ تھے۔ شاید ہماری تربیت ہی ناقص تھی‘‘ انہوں نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

’’یہ سراسر جھوٹ ہے، الزام لگا رہی ہے وہ...... آپ کو میرے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے کنول۔ آئندہ اس نے کبھی آپ کو فون کیا یا پھر آپ نے اس سے بات کی تو پھر میں کبھی آپ

سے نہیں ملوں گا‘‘ ایسی دھمکیاں وہ اکثر ہی دیتا رہتا تھا۔

’’تم پہلے کون سا روز آتے ہو، اتنے فون کروں تب کہیں ایک چکر لگتا ہے تمہارا‘‘ بی بی نے خفگی سے کہا۔

’’شاہ بی بی بہت مصروفیت ہے۔ سر کھجانے کی فرصت نہیں۔ آپ ندیم (نوکر) کو بھیج دیں کم از کم وہ میرا سر تو بوقت ضرور کھجاتا رہے گا نا‘‘ کبھی بڑے موڈ میں ہوتو عالم انہیں شاہ بی بی کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

’’میری بات وہیں رہ گئی، تم کنول کے قصے کو ختم کرو‘‘

’’یہ قصہ اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ آپ کا انتخاب غلط تھا سو آپ تسلیم کر ہی لیں۔ تین سال اس عورت نے میری زندگی میں زہر گھولے رکھا ہے‘‘ اس کے پھر سے شکوے شروع ہو گئے تھے۔

’’تم بھی تو آتش فشاں کا پہاڑ ہو‘‘

’’وہ تو بڑی خوبیوں والی تھی۔ اچھا ہے خود ہی جان چھوڑ گئی ہے میری، ورنہ میرے ہاتھوں ضائع ہو جانا تھا اس نے‘‘ عالم نے بھنا کر کہا۔

’’کون کہتا ہے کہ تم ایک ذمہ دار پوسٹ پر فائز ہو‘‘

’’سارا زمانہ کہتا ہے بس آپ ہی نہ سمجھیں تو اور بات ہے‘‘ وہ شاید مسکرایا تھا۔

’’بہر حال کنول کے بھائی والا معاملہ ختم کرو‘‘

’’بڑی اونچی جگہ سفارش کی ہے اس کنول کی بچی نے...... بہر حال اس کے بھائی کا کیس میرے نہیں خرم کے انڈر ہے لہذا آپ اسی سے بات کریں۔‘‘ شاہ عالم نے مزید دو باتیں کرنے کے بعد فون کھٹاک سے بند کر دیا تھا۔

’’کوئی کل نہیں سیدھی اس لڑکے کی‘‘ بی بی نے تاسف سے کہا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

’’آج جلدی آ گئی ہو؟‘‘

’’جی‘‘

’’واپس بھی جلد ہی جاؤ گی؟‘‘ نہ جانے کس خدشے کے تحت انہوں پوچھا تھا۔

’’جب آپ کہیں گی تب جاؤں گی‘‘ اس نے چائے کا کپ بی بی کی طرف بڑھایا تو

وہ مطمئن سی ہو گئیں۔

’’بی بی! ایک بات پوچھوں؟‘‘ کچھ دیر سوچتے ہوئے اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

’’ہاں کیوں نہیں‘‘

’’آپ کو غصہ تو نہیں آئے گا‘‘

’’کیوں؟ بات کی نوعیت غصہ دلانے والی ہے‘‘

’’شاید...... آپ کو بہت برا لگے‘‘ وہ سر جھکائے دھیمی آواز میں بولی تھی۔

’’نہیں، تم پوچھو کیا پوچھنا چاہتی ہو‘‘ انہوں نے ازلی حلاوت بھرے انداز میں کہا تو ایمن دھیرے سے بولی۔

’’بی بی! شاہ عالم تو بہت پڑھے لکھے ہیں پھر انہوں نے اپنے خاندان کی ان جاہلانہ رسومات کو ختم کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ انہوں نے اس بے جوڑ شادی کے خلاف احتجاج کیوں نہیں کیا۔ انہیں اسٹینڈ تو لینا چاہیے تھا کیونکہ وہ باشعور بھی ہو چکے تھے‘‘

’’اتنی گہری باتیں کہاں سے سیکھی ہیں تم نے‘‘ بی بی نے حیرانی سے ایمن کے چہرہ کی طرف دیکھا۔

’’آپ سے‘‘

’’ایمن! کبھی کبھی مجھے تم بالکل میرا ہی پرتو لگتی ہو۔ تمہارا انداز فکر، سوچیں، خیالات مجھے بہت اٹریکٹ کرتے ہیں‘‘ انہوں نے کافی کھلے دل سے اسے سراہا تھا اور پھر مزید بولیں۔

’’اکیلا شاہ عالم بھلا کر بھی کیا سکتا تھا۔ ہمارے بزرگ جو اس وقت حیات تھے اپنے سامنے کسی کی اونچی آواز تک برداشت نہیں کر سکتے تھے کجا کہ کوئی ان کے فیصلوں کے درمیان بولنے کی جرأت کرتا۔ جس نے بغاوت کرنے کی کوشش کی اسے موت کا پروانہ تھما دیا جاتا۔ شاہ عالم سترہ سال کا تھا جب اسے اس خوفناک حقیقت کا پتا چلا، مجھے آج بھی وہ وقت یاد ہے۔

کالج سے جب وہ آیا تو بہت بکھرا بکھرا لگ رہا تھا اس کی آنکھیں ایسی تھیں گویا خون کی بوندیں ٹپک پڑیں گی۔ وہ شاید بہت دیر تک روتا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ایک مرتبہ پھر رونا شروع کر دیا۔ اس نے کتابیں دیوار سے دے ماری تھیں اور خود میری گود میں سر رکھے دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا۔ اس نے کہا۔

’’میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا سب کو قتل کر دوں گا۔ آپ میرے آئیڈیل تایا جان

کی بیٹی، میری بڑی بہن...... مجھے آپ سے اپنی ماں کی خوشبو آتی ہے۔ آپ کہہ دیں بی بی کہ میں ابھی جو کچھ سن کر آیا ہوں وہ سب جھوٹ ہے، تیمور کی شرارت ہے۔

اگر یہ سچ ہے تو میں اپنے بڑوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کیوں انہوں نے آپ کو زندان میں قید رکھا، آپ کی خوشیوں کے قاتل کس طرح مطمئن پھرتے ہیں۔

ان جاگیروں کے لالچ نے انہیں اندھا کردیا ہے ایک بالغ لڑکی کا کسی نابالغ بچے سے نکاح کرنا کتنا بڑا جرم ہے، کتنا بڑا گناہ ہے مگر یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ جہالت کی دلدل میں دھنس چکے ہیں۔ میں تایا جان کو کبھی معاف نہیں کروں گا کوئی حق نہیں تھا انہیں آپ کی زندگی برباد کرنے کا'' وہ چیختا رہا چلاتا رہا پھر گاؤں چلا گیا۔ پھر جب واپس آیا تو بہت خاموش تھا میرے بہت پوچھنے پر اس نے ٹوٹے لہجے میں بتایا

''میں نے تایا جان سے خوب جھگڑا کیا ہے۔ میرے خیال میں دادا نے انہیں مجبور کیا ہوگا مگر...... پتا ہے بی بی انہوں نے کیا کہا'' وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔

''انہوں نے کہا تم ابھی بچے ہو، پڑھ لو پھر ہم تمہاری شادی کریں گے جہاں تم کہو گے نہایت دھوم دھام سے۔ اس نکاح کی کوئی حقیقت نہیں، بس لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے یہ تمام کارروائی کی ہے۔ ہمیں اپنی زمینوں کی تقسیم گوارا نہیں اور تم ہمارے اکلوتے وارث ہو، تمہاری خوشیاں ہمیں بہت عزیز ہیں، بھول جاؤ، تیمور کی باتوں کو، یہی سمجھنا کسی اور کے متعلق فضول گوئی کی ہے اس نے...... اور رہی شیریں تو حویلی کی بیٹیوں کا یہی مقدر ہے۔

اس کی پھوپھی کا نکاح ہمارے والد نے قرآن پاک سے کردیا تھا اور ان کی دو بہنیں بھی اسی حویلی میں مدفن ہیں...... یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا آرہا ہے، ہم نے کوئی انوکھا کام نہیں کیا''

''سو بابا جان کے کہہ دینے سے عالی مطمئن ہوا یا نہیں مگر میں نے اس کو مزید ذہنی توڑ پھوڑ کا شکار نہیں ہونے دیا...... آج وہ جس مقام پر ہے صرف میری [illegible] اور محنت کا ثمر ہے ورنہ اس وقت تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ عالی کبھی بھی کسی مقام پر نہیں پہنچ سکتا اسے دنیا کی ہر شے، ہر رشتے سے نفرت ہوگئی تھی۔

اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا۔ بہت عرصہ وہ بیمار رہا۔ اس نے کالج جانا چھوڑ دیا۔ اس نے دوستوں سے ملنا ترک کردیا۔ عالی نے اس وقت اسموکنگ کرنا شروع کردی تھی۔ مجھے بہت عرصہ لگا ایک مرتبہ پھر اس کے رشتوں، محبتوں پر اعتماد کو بحال کرنے میں۔ وہ آج بھی میری

اتنی ہی عزت کرتا ہے مجھ سے پہلے جیسے محبت کرتا ہے میری ہر بات مانتا ہے مگر حویلی والوں سے میرے لاکھ کہنے کے باوجود اس نے کوئی تعلق برقرار نہیں رکھا'' وہ گویا تھک چکی تھیں ماضی کی راکھ کریدتے کریدتے۔ ایمن نے مزید کچھ نہیں پوچھا تھا۔ اس کا دل بے حد بوجھل ہوگیا۔ اس کی آنکھوں کی نمی چھلک پڑی تھی۔ وہ برتن سمیٹ کر جھکے سر کے ساتھ کمرے سے باہر نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆

''دولت سے کبھی کسی نے حقیقی خوشیاں نہیں پائیں'' وہ پچھلے تین دن سے مسلسل یہی سوچ رہی تھی۔

''اگر دولت انسان کو سچی خوشی عطا کرتی تو پھر سب سے زیادہ خوش تو بی بی کو ہونا چاہئے تھا۔ جن کے بینک نوٹوں سے بھرے تھے اور یہ نوٹ ان کی آنکھوں میں روشنیاں نہیں بھرتے تھے'' وہ کچی زمین پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے بہت رنجیدہ تھی۔

''اے اللہ میں تجھ سے صرف اپنے دل کا سکون مانگتی ہوں۔ مجھے کسی شے کی طلب نہیں'' اس نے آنکھیں بند کر کے صدق دل سے دعا کی اسی پل کچھ نامانوس سا شور سنائی دیا تھا پہلے پہل ایمن نے اپنا وہم سمجھا مگر شور کی آواز بالکل قریب سے سنائی دینے لگی تھی۔ ایمن ابھی شور کی نوعیت کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ کھٹاک سے لکڑی کا کمزور دروازہ کھلا اور ایک بھاری بھرکم عورت کے ساتھ دو کمزور وجود کی عورتیں اندر داخل ہوئیں اور ان کے پیچھے شرمندہ شرمندہ سا وحید ٹھیکیدار...... ایمن کو لگا قیامت کی گھڑی گویا آن پہنچی ہے۔

''کہاں ہے بدذات تمہاری ماں'' بھاری جسم والی عورت نے ایمن کو تاڑ کر چلاتے ہوئے کہا اسی اثنا میں اماں بھی کمرے سے نکل آئیں۔ اور پھر ان چاروں خواتین کے درمیان غضب کا معرکہ ہوا۔ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے ہوئے دونوں پارٹیاں قطعاً نہیں گھبرا رہی تھیں۔ یہاں تک کہ محلے کی چند ایک عورتیں بھی تماشا دیکھنے پہنچ گئیں۔ ایمن کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

''بے غیرت، بدمعاش عورت تیری جوان بیٹیاں ہیں اور تو دوسروں کے گھروں کو اجاڑتی پھر رہی ہے'' وحید کی بیوی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اماں کو نوچ کھسوٹ ہی دیتی۔

''مردوں کو ورغلانے والی، یہ طوائفوں والی ادائیں ہی تو ہیں جو اس نامراد کو لے ڈوبیں'' وحید کی بیوی نے شوہر کی طرف اشارہ کر کے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

تو اماں بھی غصے سے پھڑ پھڑا ئیں۔

''چل جا دفع ہو، کالی چڑیل......سوکھی مریل...... ٹی بی کی مریضہ وحید کو تم پر لعنت ڈالنی چاہیے۔ بدصورت نہ ہو تو'' اماں نے آگ بگولا ہو کر وحید کی بیوی پروین کو جلی کٹی سنائیں کہ وہ بھی اپنی شخصیت کے بارے میں ایسے الفاظ سن کر تھرا گئی۔

''ٹی بی کی مریضہ ہو گی تم...... یہ نامراد، بے غیرت انسان تیرے اس گورے رنگ پر مرمٹا ہے۔ طوائفوں کے پاس صرف ایک یہی حسن کا ہی تو ہتھیار ہے۔ جس سے شریف مردوں کو اپنے جال میں پھنسا لیتی ہیں'' پروین نے نفرت سے کہا۔

''بدشکلی، چیچک زدہ چہرے والی، کالی بھدی بدزبان عورت...... تیرا یہ نام نہاد شوہر خود ہی میرے پیچھے پڑا تھا ورنہ میں تو اس جیسوں پر تھوکوں بھی نا'' اماں کی گولہ باری بھی جاری و ساری تھی۔

''نی پینی! چل دفع کر اسے، نہ خون جلا اپنا'' پینی (پروین) کی نند نے اسے پکارا تو وہ مزید زہر خند ہوئی۔

''نہ آپاں! مجھے دل کی بھڑاس نکالنے دے۔ آج میں چیخ چیخ کر اس طوائف کے کرتوت بتاؤں گی پوری دنیا کو''

''نہ پینی! تو ایسا کر مسجد میں اعلان کروا کے آ'' اماں نے اسے مزید تپایا۔ پینی نے بلبلا کر اپنے ڈھانچے جیسے ہاتھ کا مکا وحید کے کندھے پر مارا اور چنگھاڑی۔

''وحید! تو منہ میں دانے ڈال کر کیوں کھڑا ہے۔ بول تین لفظ۔ دے ابھی اور اسی وقت اسے طلاق......ورنہ زندہ نہیں چھوڑوں گی میں تجھے''

وحید نے منمنا کر پینی کی خواہش پر عمل کیا تو پروین صاحبہ کی احساس تفاخر سے گردن تن گئی۔

''اپنی سوکھی گردن کے پیچ ڈھیلے کر اور نہ ہی اتنا خوش ہونے کی ضرورت ہے۔ میں تو خود اس منمناتی بھیڑ سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی'' اماں نے تنفر سے کہا اور پھر ان تمام خواتین کے جانے کے بعد سر لپیٹ کر چار پائی پر ڈھے گئیں۔ ان کے کسی انداز سے افسوس کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ اسارہ کی آمد کے ساتھ ہی انہوں نے فخریہ پوری رپورٹ اسارہ کے حضور پیش کی تھی۔

''آپ نے دھکے دے کر انہیں نکال دینا تھا گھر سے'' اسارہ کی بھنویں تن گئیں۔

''میں نے کچھ کم ذلیل نہیں کیا ٹھیکیدار کی بہنوں اور بیوی کو'' اماں نے تفاخر سے کہا۔

وہ مزید بھی کچھ بتانا چاہتی تھی مگر گلزاری کو آتا دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔

''نی زینت! یہ میرے کانوں نے کیا سنا ہے۔ تو نے نکاح کر رکھا ہے''

''نہ آپا! جب تجھے پوری رپورٹ مل چکی ہے تو خواہ مخواہ سواد لینے آ گئی ہے'' اماں نے تیوری چڑھا کر کہا۔

''مجھے تو یقین نہیں آیا'' گلزاری نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''دشمنوں کی ہوائی ہے آپاں! غریب کو بھلا کون جینے دیتا ہے'' زینت نے چہرے پر رنجیدگی طاری کر لی۔

''پھر بھی رائی کا پہاڑ بنتا ہے'' گلزاری نے آنکھیں مٹکائیں۔

''میری جوان بیٹیاں ہے۔ مجھے بھلا ایسی حرکتیں زیب دیتی ہیں'' زینت نے آنکھوں میں آنسو بھر لیے۔

''ہاں یہ تو ہے'' گلزاری نے اتفاق کیا۔

''پر وہ عورت تو بہت چیخ رہی تھی'' کچھ دیر بعد گلزاری نے مشکوک انداز میں پوچھا تو زینت لاپرواہی سے گویا ہوئی۔

''دفع دور کر اس قصے کو آپاں! اور یہ چائے پی، پیسٹری اور کیک کھا۔ اہل مٹھائی بھی لے آ۔ اور الماری میں باداموں والا حلوہ پڑا ہے کسی برتن میں ڈال کے آپاں کو لا دے۔ گھر جا کر کھا لے گی۔ بے چاری کتنی کمزور ہو گئی ہے'' زینت نے چالاکی سے بات بدلی تو گلزاری بھی پیسٹری اور کیک کی طرف متوجہ ہو گئی۔

جانے سے پہلے زینت نے گلزاری کی مٹھی میں تین چار نوٹ دبا دیے تو وہ دعائیں دیتی رخصت ہوئی اور جاتے جاتے مزید بولی۔

''نہ زینت تو لوگوں کی باتوں پر دھیان نہ دینا۔ دنیا کی تو فطرت ہے باتیں بنانے کی۔ تیری جوان بیٹیاں ہیں۔ اگر عورتوں کو نوکیلی باتیں من سے لگا لیں تو چار پائی سے لگ جائے گی اور تیری بیٹیوں کا کیا بنے گا تیرے بعد۔ اچھا اپنا خیال رکھنا، پھر کبھی چکر لگاؤں گی'' گلزاری کے جانے کے بعد زینت بڑبڑائی۔

''دفعہ دور مکار بڈھی''

''چلی گئی گلزاری'' اسارہ کمرے سے نکل آئی تھی۔

''ہاں.....تم سناؤ، کام کا کیا بنا''

''ایک دم فرسٹ کلاس جا رہا ہے۔ دیکھنا اماں! کیسے راتوں رات شہرت اور دولت ملتی ہے'' اسارہ نے مسکرا کر کہا۔

''یہ حسیب رضوی کون ہے؟'' اماں نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

''بہت بڑے صنعتکار کا بیٹا ہے'' اسارہ نے مختصر بتایا۔

''ہم کب تک کوٹھی میں شفٹ ہوں گے''

''ابھی تھوڑا سا کام رہتا ہے اور اوپر والا پورشن ابھی نامکمل ہے۔ دو تین مہینے مزید لگ جائیں گے'' اسارہ نے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر کہا۔

''یہ حسیب رضوی اتنا مہربان کیوں ہے؟''

''اماں! آپ آم کھاؤ پیڑ نہ گننے شروع کرو''

''پھر بھی، ایسے ہی تو وہ کروڑوں روپیہ خرچ نہیں کر رہا'' اماں نے دبی آواز میں پوچھا۔

''میں اسے پائی پائی سود کے ساتھ لوٹا دوں گی''

''میرے پلے تو تمہاری باتیں نہیں پڑنے والیں'' زینت نے جھنجلا کر کہا۔

''آپ کیوں خود کو الجھاتی ہیں''

''پھر بھی کچھ تو بتاؤ؟''

''جتنا فائدہ، میں نے اس ایک سال میں اسے پہنچایا ہے اور جو خوبیاں خصوصاً بزنس کے حوالے سے مجھ میں ہیں وہ کمپنی کی ایم ڈی کے پاس بھی نہیں۔ حسیب رضوی ذہانت اور خوب صورتی کی قدر کرنے والا ہے۔ مجھے بزنس کے خفیہ اسرار رموز بھی آتے ہیں جو کم از کم ایک نیا ورکر اور جہاندیدہ یہ بزنس مین بھی آسانی سے نہیں سمجھ سکتا'' اسارہ نے پرسوچ انداز میں جواب دیا۔

''اللہ تمہیں کامیاب کرے''

''نہ جانے کس قسم کی کامیابی یہ سب چاہتی ہیں'' ایمن نے تلخی سے سوچا۔

☆☆☆

اس کا رزلٹ آچکا تھا۔ گورنمنٹ کالج میں ایڈمیشن بھی آسانی سے مل گیا۔ وقت

دھیرے دھیرے سرک رہا تھا۔ اسارہ کی مصروفیات میں حد درجہ اضافہ ہو چکا تھا۔

اماں کو نئے گھر میں جانے کی بے چینی تھی اور نئے گھر میں جاتے جاتے انہیں تقریباً دو سال لگ گئے۔ ایمن نے انٹر پاس کر لیا۔ ایل ماسٹرز کرنے کے بعد کسی دوائیوں والی کمپنی سے منسلک ہو گئی جبکہ امن ابھی تک زوہیب حسن کی اکیڈمی میں پڑھا رہی تھی۔

جس دن اسارہ نے نئے گھر جانے کی خبر اماں تک پہنچائی وہ دن ان سب کے لیے گویا عید کا دن تھا۔ وہ اس گندے محلے اور اس میں بسنے والے لوگوں سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پا جائیں گی۔ آج کے بعد کوئی انہیں طعنہ دینے والا، طنز کرنے والا نہ ہوگا۔ کوئی ان کی ذات پر کیچڑ نہیں اچھالے گا۔ کسی کو ان کے ماضی کے بارے میں خبر نہ ہوگی۔ ایک اچھی زندگی کا خواب ان سب کی آنکھوں میں جگمگا رہا تھا۔

انہیں جلدی تھی کہ وہ اس ٹین کی چھت والے گھر سے جلد از جلد نکل جائیں۔ یہ ٹوٹی پھوٹی دیواروں والا گھر اب بہت برا اور بالکل ہی کھنڈر محسوس ہو رہا تھا۔ یہ بدبودار تاریک گلیاں، ابلتے گٹر، کوڑے کے جابجا ڈھیر، گندے غلیظ بچے..... کس قدر کراہیت محسوس ہو رہی تھی زینت کو ان سب سے۔ یہ سارا ٹوٹا پھوٹا سامان انہوں نے اپنی دیرینہ سہیلی نادیہ کو خیرات میں دے دیا تھا جو بے چاری رشک کے عالم میں زینت کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''وقت کم بخت اس عورت کو چھوئے بغیر گزر گیا'' نادیہ نے یاسیت سے سوچا۔ خوب صورت لشکارے مارتی سوک میں یہ پانچوں بیٹھیں اور گاڑی اس گندے غلیظ منظر کو پیچھے چھوڑتی چلی گئی۔

''ایمن.....'' کوئی اسے آوازیں دے رہا تھا اس نے تھکی تھکی نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔

''ایمن بی بی! ناشتا کر لیں'' یہ کوئی ملازمہ ٹائپ لڑکی تھی جو کہ اسے نیچے آنے کا کہہ کر چلی گئی۔ نہ جانے کتنے ہی پل گزر گئے تھے اسے اپنی ہمتیں جمع کرتے ہوئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ہی لڑکی اسے دوبارہ بلانے کے لیے آئی۔

''ایمن بی بی! بڑی بیگم آپ کو بلا رہی ہیں''

''آ رہی ہوں'' ایمن نے گہری سانس کھینچی اور پھر دوپٹہ درست کرتی نیچے چلی آئی۔

ایمن ہونقوں کی طرح لاؤنج میں کھڑی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ جانا کہاں ہے۔ اس پل وہ ہی

ملازمہ کچن سے برآمد ہوئی۔

''ایمن بی بی! ڈائننگ ہال اس طرف ہے'' ریشم نے بائیں طرف اشارہ کیا تو وہ قدرے خفت زدہ سی ڈائننگ ہال کی طرف بڑھ گئی اندر کا منظر دیکھ کر تو وہ چکرا کر رہ گئی تھی۔ وسیع وعریض انتہائی قیمتی ڈائننگ ٹیبل پر نفیس برتنوں میں موجود کھانے پینے کے لوازمات اور کرسیوں پر براجمان اماں، امل اور امن کو دیکھ کر حیران بلکہ ششدر رہ گئی تھی۔

اماں نے سلک کا پنک شیڈز والا انتہائی قیمتی اور جدید تراش خراش والا سوٹ پہن رکھا تھا۔ میچنگ جیولری اور میچنگ شوز اور نیچرل سا میک اپ...... اماں تو پوری کی پوری بدل چکی تھیں۔ بلاشبہ یہ کلر ان پر بہت سوٹ کر رہا تھا مگر ایمن کو وہ اسی پل حد سے زیادہ بری لگ رہی تھیں۔ اسے آتا دیکھ کر امل مسکرائی۔

''آؤ ایمی! ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے''

''کیوں......؟'' نہ جانے کیوں اس کا لہجہ حد درجہ روکھا ہو گیا تھا۔

''ہر وقت غصہ نہیں کھاتے، یہ لو فریش اورنج جوس پیو'' امل نے نازک سے گلاس میں جوس انڈیل کر اس کی طرف بڑھایا۔

''میرا دل نہیں چاہ رہا'' ایمن نے بےزاری سے کہا۔

''کیوں بیٹا! پی لو فریش ہو جاؤ گی'' اماں کے الفاظ پر نہیں وہ تو ان کے لہجے کی شائستگی پر ششدر رہ گئی تھی۔

''اچھی خوراک، اچھے لباس اور بہترین رہائش نے اماں کا مزاج یکسر بدل دیا ہے'' ایمن نے حیرانی سے سوچا۔

''امل! تم ایمن کے لیے شاپنگ کب کرو گی۔ بھلا یہ کپڑے پہننے والے ہیں'' اماں نے ناپسندیدگی بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''میں ایسے ہی ٹھیک ہوں''

''اسارہ لے آئے گی رات کو'' امن نے اماں کو بتایا۔

''اتنا سا کام بھی تم نہیں کر سکتیں'' اماں نے خفگی سے کہا اور مزید بولیں۔

''اسارہ کے کندھوں پر اتنا بوجھ لاد رکھا ہے تم لوگوں نے''

''باجی کو کیا ضرورت ہے اتنا بوجھ اٹھانے کی'' ایمن نے یاسیت سے سوچا۔

''یہ آسائشات کیا دل کو سکون پہنچاتی ہیں۔ ہرگز نہیں'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''او کے اماں! میں جا رہی ہوں'' امل ہینڈ بیگ اٹھاتے ہوئے سرعت سے بولی تھی۔

''گڈ بائے ممی!'' امن نے بھی جھک کر اماں سے پیار لی۔ اماں گویا نثار ہی ہو گئیں۔

ایمن ہنوز سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''تم نے کالج نہیں جانا'' اماں نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں''

''کیوں''

''میری مرضی''

''کیا مطلب......'' اماں نے ناگواری سے کہا۔

''میں پرائیویٹ بی اے کروں گی''

''کیوں......؟'' اماں کو غصہ آ گیا۔

''اسارہ نے تمہارا داخلہ اتنے مہنگے کالج میں کروانے کا سوچ رکھا ہے اور تم''

''میں نے باجی سے فرمائش نہیں کی'' وہ تلخی سے بولی تھی۔

''تم بہت بدزبان ہوتی جا رہی ہو، کچھ ایٹی کیٹس اور مینرز بھی سیکھ لو، آخر اب بڑے لوگوں سے ملنا ملانا رہے گا۔ اور اپنے حلیے پر توجہ دو'' اماں نے غصے سے کہا۔

''میں جو ہوں، ویسی ہی نظر آؤں گی''

''وقت اور حالات کے ساتھ خود کو بدلنا پڑتا ہے'' اماں نے اسے سمجھانا چاہا۔

''ہم لوگ نئے گھر میں شفٹ ہوئے ہیں۔ اسی لیے اسارہ کا ارادہ ہے کہ چھوٹا سا فنکشن ارینج کر لیا جائے تاکہ ارد گرد والوں سے بھی جان پہچان ہو سکے۔ اسی لیے میں تمہیں سمجھا رہی ہوں۔ آج میرے ساتھ پارلر چلنا، کٹنگ اور پرمنگ وغیرہ کروا لینا، فیشل کی تو تمہیں ضرورت ہی نہیں۔ دیکھنا میری بیٹی کس قدر چارمنگ لگے گی'' زینت نے اسے پچکارا۔

''میں نے کہا نا کہ مجھے ان سب چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں''

''آہستہ آہستہ دلچسپی پیدا ہو جائے گی'' انہوں نے گویا خود کو تسلی دی۔

''اماں! مجھے یہاں آ کر بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا''

''کیوں بھلا؟'' اماں نے ناگواری سے پوچھا۔

''پتا نہیں، ہر چیز اجنبی اور مصنوعی سی دکھائی دیتی ہے'' اس نے اپنی الجھن بیان کی۔

''ہمیں تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا صدیوں سے یہیں رہ رہے ہیں۔ نہ جانے تم ایسا کیوں سوچتی ہو''

زینت نے لاپرواہی سے کہا۔

''کبھی کبھی دل بہت گھبراتا ہے اماں!''

''نہ جانے کون سی صدی کی روح تم میں سما چکی ہے''

''اماں! ایک بات پوچھوں'' کافی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے آہستگی سے کہا۔

''ہاں، کیوں نہیں''

''آپ کو ابا یاد نہیں آتے''

''لو بھلا یہ کیسا سوال ہوا'' زینت کے منہ میں گویا کڑوے بادام آ گئے۔

''بتائیں نا......'' اس نے اصرار کیا۔

''نہیں'' زینت نے سفاکی سے کہا اور بولیں۔

''ناصر نے مجھے سوائے بھوک کے اور دیا ہی کیا ہے جو اسے یاد کرتی پھروں''

''آپ کو ابا سے محبت نہیں تھی''

''یہ محبت وحبت بھلا کیا ہوتی ہے'' زینت نے ناگواری سے کہا۔

''ہمیں تو صرف آٹے دال کے بھاؤ کا پتا تھا''

''محبت بھلا کیا ہوتی ہے'' اس نے اماں کے الفاظ دہرائے۔

''محبت پتا ہے اماں کیا ہوتی ہے۔ محبت روشنی ہوتی ہے جو دل کو منور کر دیتی ہے۔ محبت ٹھنڈک کا احساس ہے۔ میٹھی چاندنی، بہتے جھرنوں کی سی روانی......سوکھی دھرتی، بنجر دل پر رم جھم بارش کا نام محبت ہے۔ تم کیا جانو اماں محبت کیا ہے۔ کبھی اپنی امن کی آنکھوں میں جھانکنا تمہیں صرف محبت ہی نظر آئے گی یا پھر ایمن کے دل کے نہاں خانوں میں چھپی تصویر کو دیکھنا تم جان جاؤ گی اماں کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ کسی کو بغیر صلے کے چاہے جانے کا نام محبت ہے۔ محبوب کے ساتھ کی تمنا کیے بغیر اسے دیوتا کی طرح پوجنے کا نام محبت ہے۔ تم کیا جانو اماں! بھلا محبت کیا ہے'' وہ زیرلب بڑبڑا رہی تھی۔

☆☆☆

''ممی! دیکھیے گا، شہر بھر کی کریم کو......آپ جان جائیں گی کہ اسارہ کی پہنچ کہاں تک ہے'' اسارہ تفاخر سے کہہ رہی تھی پھر وہ انہیں پارٹی کی تفصیل بتانے لگی۔ اماں کے چہرے پر ہلکی ہلکی سرخی ان کے بے تحاشا خوش ہونے کا پتا دے رہی تھی۔ اس پارٹی کا اہتمام بڑے وسیع پیمانے پر تھا۔

اسارہ کی ہدایات پر اماں، امل اور امن ایک ایک چکر پارلر کا بھی لگا چکی تھی بہت مہنگے بوتیک سے انہوں نے ڈریسز بنوائے تھے جوں ہی شام کی لالی نے پر پھیلائے پوری کوٹھی رنگ برنگی جگر جگر کرتی روشنیوں سے جگمگا اٹھی۔ ہر طرف روشنیوں اور خوشبوؤں کی مہکار تھی۔ میوزیکل بینڈ کو بھی بلوایا گیا تھا۔ گیتوں کی دھن میں بھیگتی شام کی پرنم ٹھنڈی ٹھنڈی سبک ہوا میں مہمانوں کا استقبال کرتی سیاہ جگمگاتی ساڑھی میں ملبوس اپنے حسن کے جلوے دکھاتی اسارہ کو ایمن ہی نہیں امل اور امن بھی ششدر سا دیکھ رہی تھیں۔ زینت کی آنکھیں بھی خیرہ تھیں۔

انتہائی ماڈرل خواتین، چنچل سی بے باک لڑکیاں اور بہترین سوٹس میں ملبوس مرد حضرات......یہ منظر ان سب کے لیے انوکھا اور اجنبی سا تھا البتہ اسارہ تو شاید ان پارٹیز کی عادی ہو چکی تھی۔

زینت کو بھی اس پارٹی کی نوعیت کا اندازہ نہیں تھا البتہ وہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

ہر ایک سے فرداً فرداً تعارف کروایا گیا کوئی صنعتکار تھا، کوئی بزنس میں، کوئی سیٹھ اور کوئی سیاستدان، زمیندار......

''اسارہ! تمہاری فیملی سے مل کر بہت خوشی ہوئی'' کسی سوٹڈ بوٹڈ شخص نے تعریفی انداز میں ان سب کو سراہتے ہوئے کہا۔

''پہلے کسی پارٹی میں تم اپنی فیملی کو لے کر نہیں آئیں'' اک ماڈرس سی خاتون نے اسارہ سے پوچھا تو وہ رٹا رٹایا جملہ بولنے لگی۔

''ایکچوئلی'' ممی لوگ حال ہی میں پاکستان شفٹ ہوئے ہیں''

خوشبوئیں بکھیرتی اسارہ تتلی کی مانند اڑ رہی تھی پھر کسی سیٹھ کا ہاتھ تھام کر زینت کے قریب چلی آئی۔

''ممی! یہ سیٹھ باقر گردیزی ہیں۔ بہت بڑے قالینوں کے تاجر'' اسارہ نے امل اور

امن کا بھی خصوصاً تعارف کروایا تھا اور پھر ایمن کی طرف سیٹھ صاحب خود ہی متوجہ ہو گئے۔

"یہ پرنسس کہاں سے آئی ہیں"

"میری سب سے چھوٹی سسٹر ام ایمن ہے" اسارہ نے اک ادا سے تعارف کی رسم نبھائی۔

"ویری پریٹی گرل" سیٹھ باقر نے تعریفی انداز میں ہونٹ سکیڑے۔

"کیا کرتی ہیں آپ؟"

"ابھی فی الحال تو پڑھ رہی ہے" ایمن کی بجائے اسارہ نے جواب دیا۔

"کون سی کلاس میں"

"تھرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہے" اسارہ نے قدرے دبی آواز میں کہا۔

"اسارہ ڈیئر! یہ بولتی نہیں ہے" باقر گردیزی کی نگاہیں اس کے اجلے بے داغ چہرے پر پھسل رہی تھیں۔

"کیوں نہیں" اسارہ نے ایمن کو بولنے کا اشارہ کیا۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

"یہ ہماری طرف سے اس شام کی سب سے خوبصورت لڑکی کے لیے حقیر سا گفٹ" باقر گردیزی نے کوٹ کی جیب میں سے ایک مخملی کیس نکالا اور ایمن کی طرف بڑھا دیا۔ ایمن نے گفٹ پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھائے تھے۔ اسارہ کے لاکھ آنکھیں دکھانے پر بھی اس نے باقر گردیزی سے مخاطب ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"اصل میں یہ اتنی جلدی کسی سے بھی بے تکلف نہیں ہوتی" اسارہ نے شرمندگی کے عالم میں کہا۔

"کوئی بات نہیں" باقر کے انداز میں لاپرواہی تھی۔

"یہ گفٹ تم لے لو...... اور اسے میری طرف سے دے دینا۔ یقیناً تمہارے ہاتھ سے لینا پسند کرے گی"

"آپ پلیز مائنڈ مت کیجیے گا"

"ارے نہیں تو، ایسا مزاج اس کی شخصیت پر سوٹ کرتا ہے" وہ گھاگ شکاری اک پل کے لیے مسکرایا۔

"پھر ملیں گے ایمن ڈیئر!"

"اونہہ" ایمن زہرخند ہو رہی تھی پھر غصے سے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی۔ اسے باجی اور اماں پر شدید غصہ آ رہا تھا۔

اگلی صبح جب وہ نیچے آئی تو اسارہ کو گھر میں موجود دیکھ کر قدرے حیران ہوئی۔

"تمہیں تمام مینرز سکھانے پڑیں گے" اسارہ نے اسے دیکھ کر تلخی سے کہا۔

"آپ مجھے آئندہ کسی پارٹی میں شرکت کرنے پر مجبور نہ کیجیے گا" ایمن نے بھی غصے سے کہا۔ اسے ابھی تک باقر گردیزی کی گندی نگاہوں سے وحشت ہو رہی تھی۔

"بکواس بند کرو، آئندہ تم ہر پارٹی میں میرے ساتھ جاؤ گی"

"آپ مجھے مجبور نہیں کر سکتیں"

"تمہیں ہر صورت میرے ساتھ جانا ہوگا۔ کل تو میری شوٹنگ ہے اور پرسوں ایک بہت اہم میٹنگ...... سنڈے کو حسیب رضوی اپنے حلقہ احباب کو پارٹی میں مدعو کرے گا اور تم بھی میرے ساتھ جاؤ گی۔ یہ پارٹی اونلی میرے اعزاز میں ہوگی۔ میں نے حسیب رضوی کے بہت پرانے حریف کو مات دے دی ہے۔ تمہیں وہاں چل کر میری اہمیت کا اندازہ ہوگا" اسارہ نے تفخر سے کہا۔

"مجھے کسی پارٹی وارٹی میں شرکت نہیں کرنا"

"دیکھ لوں گی میں تمہیں" اسارہ نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا تھا اور پھر ٹک ٹک کرتی باہر چلی گئی۔ اسارہ کے جاتے ہی اماں میدان میں کود پڑی تھیں۔

"کیا ضرورت تھی تمہیں بک بک کرنے کی"

"آپ نے باجی کے تیور ملاحظہ نہیں کئے" ایمن نے بھرائی آواز میں کہا۔

"وہ اس گھر کی سربراہ ہے، وہ جو کہے گی وہ ہی ہوگا" اماں نے نہ جانے کیا کچھ جتایا تھا۔

"اس گھر پر حکومت کریں، انسانوں پر نہیں" ایمن غصے سے چلائی تھی۔

"اسارہ نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا، میں اس سے اختلاف نہیں کر سکتی" اماں نے تنک کر کہا۔

"باجی کی ہر بات ماننا ضروری نہیں"

"اس گھر میں رہنا ہے تو اس کی ہر بات ماننا پڑے گی" ایمن نے انتہائی دکھ سے اپنی

ماں کی طرف دیکھا تھا۔

''اگر نہ مانوں تو......؟'' ایمن نہ جانے کیا سننا چاہتی تھی۔

''اسے اپنی ہر بات منوانا آتی ہے'' اماں نے ہر ہر لفظ چبا چبا کر ادا کیا تھا۔ ایمن اس قدر دلبرداشتہ ہوئی کہ گھر سے ہی نکل آئی۔ کچھ ہی دیر بعد اس کے پیچھے ڈرائیور بھاگتا ہوا چلا آیا۔

''بی بی صاحبہ! کہاں جانا ہے''

''جہنم میں''

''بی بی صاحبہ! گاڑی میں بیٹھیں میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں'' ڈرائیور نے تابعداری سے کہا۔

''میں رکشا سے چلی جاؤں گی، جاؤ تم''

''نہیں جی، ہمیں آرڈر ہے کہ ہم ہی آپ کو باہر لے جا سکتے ہیں...... آپ کسی لوکل سواری سے ہرگز نہیں جائیں گی'' ڈرائیور نے سختی سے کہا۔ بشیر ہی اسے بی بی کی کوٹھی میں لے کر جاتا تھا۔ نجانے کیوں اسے گاڑی میں سے اترتے ہوئے شرم محسوس ہوتی تھی۔ اسی لیے تو وہ گاڑی گھر سے بہت دور کھڑی کروا دیتی تھی تاکہ کسی کو بھی شک نہ ہو کہ کڑکتی دھوپ میں پیدل چل کر اور کبھی رکشوں میں دھکے کھانے والی ایمن اب ہنڈا سوک میں آتی ہے۔

وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی اور پھر ہمیشہ کی طرح بشیر کو گھر سے کافی دور گاڑی کھڑی کرنے کے لیے کہا۔ خود وہ مختلف سوچوں میں الجھتی جب گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہوئی تو عادل کے ساتھ ایک اسمارٹ سی لڑکی کو دیکھ کر چونک گئی۔ وہ تینوں لاؤنج میں بیٹھے تھے۔

''اتنے دنوں بعد آئی ہو ایمن! کیا طبیعت خراب تھی'' بی بی نے بہت شفقت سے پوچھا تھا ایمن نفی میں سر ہلا کر ان کے قریب بیٹھ گئی۔

''آپ نے مجھے یاد کیا تھا''

''کوئی ایک مرتبہ، جب سے ہم لوگ آئے ہیں صرف تمہارا ہی ذکر ہو رہا ہے۔ اگر آپ اپنا ایڈریس بتا دیتیں تو ہم اب تک آپ کو مہمانی کا شرف بخش چکے ہوتے'' عادل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ کی طبیعت ٹھیک رہی'' وہ شوگر اور بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں۔

''ہاں، بس بی پی شوٹ کر جاتا ہے کبھی کبھی'' انہوں نے نرمی سے کہا اور پھر مزید بولیں۔

''امی! تم نے مجھے اپنا اتنا عادی کر دیا ہے کسی اور کے ہاتھ کی چائے تو میرے حلق سے نہیں اترتی''

''بنا لاؤں چائے؟'' وہ فوراً اٹھتے ہوئے بولی۔

''ارے نہیں تو، ابھی بیٹھو ہمارے پاس'' بی بی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھا لیا۔ پھر فاریہ سے مخاطب ہوئیں۔

''فاری! یہ میری بہت ہی پیاری بیٹی ہے اور امی یہ فاریہ ہے عادل کی کزن اور منکوحہ بھی''

''پیاری تو یہ واقعی ہے'' فاریہ نے کافی کھلے دل سے اسے سراہا اور توصیفی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

''پڑھی ہو ایمن''

''جی، پرائیویٹ بی اے کی تیاری کر رہی ہوں''

''اے اتنا جی جی کرنے کی ضرورت نہیں۔ سیدھی طرح نام لے لو'' عادل نے منہ بنا کر کہا۔

''تم تو ہر وقت مجھ سے جلتے رہا کرو''

''یہ جلنے کلسنے کا کام تمہیں پر سوٹ کرتا ہے اسی لیے کالی بھنگ ہو رہی ہو۔ میں تو اتنا سرخ سفید ہوں کیوں ایمن!'' عادل نے فاریہ کو چڑایا۔

''اتنی خوش فہمی بھی اچھی نہیں''

''خوش فہمی تمہیں ہی اپنے متعلق لاحق ہے...... کریمیں یوز کر کے کے جو تھوڑا بہت رنگ نکھارا ہے مزید جل جل کے سیاہ مت کرو'' عادل، بی بی کے منع کرنے کے باوجود باز نہیں آیا تھا۔ مسلسل اسے چڑاتا رہا۔

''بی بی! سمجھا لیں اسے، ورنہ بری طرح پیش آؤں گی'' فاریہ روہانسی ہو گئی تھی۔

''اصل بیوٹی تو ادھر ہے'' عادل نے ایمن کی طرف اشارہ کیا اور مزید بولا۔

''بی بی! ادھر تو بیوٹیشن کا کمال ہے'' اب وہ فاریہ کی طرف جھک کر کہہ رہا تھا۔ فاری نے اس کے کندھے پر مکا رسید کیا تو وہ خواہ مخواہ کراہنے لگا۔ بی بی ان کی نوک جھوک سے محظوظ ہو رہی تھیں۔ ایمن بھی نہ جانے کتنے ہی دنوں بعد مسکرائی تھی۔

''ہنستی رہا کرو، اچھی لگتی ہو'' عادل نے بہت مخلصانہ مشورہ دیا تھا فاریہ نے بھی اس کی تائید کی۔ ان دونوں کے جانے کے بعد بی بی اس سے مخاطب ہوئیں۔

''ایمن! کیا بات ہے تم کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو'' وہ تو اس کا چہرہ پڑھنے کے فن سے بھی آشنا تھیں۔ ایمن بھلا ان سے کیا چھپاتی۔

''کچھ گھریلو پریشانی ہے'' وہ دھیمی آواز میں بولی۔

''بتاؤ گی نہیں'' انہوں نے اس کا نرم سا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

''میری بڑی بہن ایک کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے اس نے ماڈلنگ کرنا بھی شروع کر دی تھی۔ میرے ابا اگر زندہ ہوتے تو باجی کو کبھی بھی ماڈلنگ کی اجازت نہ دیتے۔ ان کی روح کو کس قدر تکلیف ہوتی ہوگی۔ آپ کو نہیں پتا بی بی! میرے ابا بہت ہی پرہیزگار اور متقی قسم کے صابر و شاکر انسان تھے۔ میں نے پوری زندگی میں انہیں ایک نماز بھی قضا کرتے نہیں دیکھا'' وہ آزردگی سے بتا رہی تھی۔

''اتنے اچھے ابا کی اتنی ہی پیاری اور فرشتہ صفت بیٹی ہے'' بی بی نے اس کے گال پر پھسلتا آنسو پونچھا اور بولیں۔

''آج کل تو بہت ہی اعلیٰ خاندان کی لڑکیاں محض شوقیہ ماڈلنگ کرتی ہیں۔ زمانہ اتنی ترقی کر چکا ہے کہ ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ تم خواہ مخواہ دل پر لے رہی ہو۔ وہ جاب کے ساتھ ساتھ شوقیہ ماڈلنگ کر رہی ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں۔ تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم بہت حساس ہو۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر افسردہ ہو جاتی ہو''۔

''آپ کو کیا پتا بی بی! کہ ہم تو بہت ہی غریب خاندان سے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی اعلیٰ حسب نسب نہیں، نہ ہی باجی ماڈلنگ شوقیہ کرتی ہیں۔ اتنے کم عرصے میں اتنی دولت ناجائز ذرائع سے ہی تو حاصل کی گئی ہے۔ یہ باتیں، یہ زہریلی سوچیں مجھے چین نہیں لینے دیتیں۔ اعلیٰ خاندان کی لڑکیاں اگر ماڈلنگ کرتی ہیں تو ان کا حسب نسب اور دھن دولت ان کے عیبوں پر پردہ ڈال دیتا ہے اور ہم جیسوں کی اچھائیاں بھی عیب بن جاتی ہیں۔

''ایمن! اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنی فکریں مت پالو'' انہوں نے اسے سوچوں میں گم دیکھ کر نرمی سے کہا اور پھر اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے بولیں۔

''اب میرے لیے اچھی سی چائے بنا لاؤ''

''جی اچھا'' وہ تابعداری سے سر ہلاتی اٹھ گئی۔

☆☆☆

''اماں! آج زوہیب کی والدہ آئیں گی'' امن اماں کو بتا رہی تھی جبکہ ایمن نے حیرانی اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر امن کی طرف دیکھا۔

''کس وقت آنے کا بتایا ہے انہوں نے'' اماں نے بھی خوشی سے بھرپور لہجے میں پوچھا۔

''ڈنر یہیں کریں گی''

''ہاں، کیوں نہیں میں ریشم سے کہہ کر بہترین کھانے کا انتظام کرواتی ہوں''

سچ تو یہ تھا کہ ایمن بھی زوہیب کی والدہ کی آمد کا سن کر بے حد مسرور ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ زوہیب کی والدہ امن کے سلسلے میں ہی آ رہی ہیں۔ یہ فطری سی خوشی تھی۔ اسی خوشی کے احساس کے ساتھ اس نے بھی ریشم کے ساتھ مل کر کھانا بنوایا۔

سات بجے کے قریب مہمانوں کی آمد ہوئی تھی زوہیب کی دو بہنیں بھی ساتھ تھیں۔ بڑے اچھے انداز میں وہ ان سب سے ملیں۔ خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ اس دوران اماں نے بھی شائستگی کے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے تھے۔ ویسے بھی اماں کو باتیں بنانا خوب آتی تھیں۔

انہوں نے رشتے کی بات کی اور اماں نے رسماً وقت مانگ لیا۔ بہر حال نیم رضا مندی کا اظہار کر دیا تھا ایک ہفتے بعد باقاعدہ رشتہ طے ہوا اور اسی دوران اہل کے لیے کسی سرجن کا پرپوزل آ گیا۔ اماں کے تو خوشی کے مارے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

''یہ سب ہمارے اسٹیٹس کا کمال ہے۔ ورنہ ان گندی گلیوں میں کس نے شوق سے آنا تھا''

یہ بات سچ تھی اس سے انکار ممکن نہیں تھا اور پھر جو بھی اسارہ باجی کی جاب کے متعلق سنتا خود بخود مرعوب ہو جاتا۔

وہ اپنی کمپنی کی ایم ڈی تھی اور زوہیب کی بہن کا شوہر اسارہ کے انڈر تھا۔ صرف ایک ماہ کے اندر اندر شادی کی تیاریاں کی گئیں۔ مہندی اور بارات کے فنکشن کے لیے ہال میں بکنگ کروائی گئی تھی۔ بہترین فرنیچر جہیز میں دیا گیا۔ قیمتی زیورات، کپڑے اور اعلیٰ قسم کی کراکری: ہر شے شاندار تھی۔ پھر اسارہ نے دونوں بہنوئیوں کو ایک ایک لاکھ سلامی دی۔ اس کی دونوں بہنیں شان سے رخصت ہو گئیں۔ شادی میں اس نے بی بی کو بھی ان کے بے حد اصرار کرنے پر بلایا تھا۔

وہ نہ جانے کیوں شرمندہ شرمندہ سی بوکھلائی پھر رہی تھی۔ بی بی ان کے معاشی حالات دیکھ کر حیران تھیں کہ ایمن نے کیونکر اک معمولی سی جاب کے لیے خود کو تکلیف دی۔ انہوں نے اس سے کچھ بھی نہیں پوچھا تھا جبکہ ایمن دل ہی دل میں شرمندہ تھی۔ وہ انہیں کیا بتاتی کہ یہ ٹھاٹ بھاٹ، یہ شان وشوکت سب مصنوعی ہے۔ صرف چند ماہ پہلے ملنے والی یہ دولت ہمیں زمانے کی نگاہوں میں معتبر کر گئی ہے۔

اماں کی شائستگی آج بھی دیکھنے کے قابل تھی۔ انہوں نے بی بی کو خوب ہی متاثر کر لیا تھا اپنی چکنی چپڑی باتوں سے۔

بی بی نے اماں کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی جسے اماں نے فوراً ہی قبول کر لیا۔

شادی کے ہنگامے سرد پڑے تو زندگی اپنے معمول پر آ گئی۔ امن اور امل کی کمی سب سے زیادہ ایمن محسوس کرتی تھی۔ امن اور امل بھی کم کم ہی ادھر آتی تھیں۔ نئی زندگی نے انہیں حد درجہ مصروف کر دیا تھا۔

اسمارہ اور اماں کے مجبور کرنے بلکہ بے حد غصہ دکھانے پر وہ ایک دو مرتبہ اسمارہ کے ساتھ پارٹی میں چلی گئی تھی مگر اب اس نے جانے سے انکار کر دیا تھا نہ جانے کیوں اسے باقر گردیزی کی نگاہوں سے خوف محسوس ہوتا تھا مگر اسمارہ جان بوجھ کر انجان بنتی تھی اسے خبر ہوئی کہ ایمن نے ابھی تک بی بی کی نوکری نہیں چھوڑی تو اس نے گھر میں ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

''تجھے کیا ضرورت ہے ٹکے ٹکے کی ملازمت کرنے کی۔''

ایمن کچھ نہیں بولی تھی۔ بس خاموشی سے سنتی رہی۔

''تم نے مجھے ذلیل کرنے کی قسم کھا رکھی ہے'' اسمارہ نے چلا چلا کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ اماں بھی اسمارہ کی سائیڈ لے رہی تھیں۔

''وہ دونوں تو ٹھکانے لگی ہیں اب تمہارا بھی بندوبست کرتی ہوں'' اسمارہ نے تنفر سے کہا۔ ایمن خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

کچھ دن مزید سرکے کہ ایک شام باقر گردیزی چلا آیا۔ اسمارہ بھی گھر پر ہی تھی۔ اماں باقر گردیزی کی آمد کا سن کر نہال ہی ہو گئیں انہیں امیر لوگوں سے دوستیاں گانٹھنے کا بہت شوق تھا۔

سیٹھ باقر ڈرائنگ روم میں بیٹھا اونچے بے ڈھنگے قہقہے لگا رہا تھا۔ ایمن کوفت زدہ سی

لان میں آ گئی۔

اور یہ اسی رات کی بات ہے جب اسمارہ نے اس کا سیٹھ باقر سے رشتہ طے ہو جانے کی قیامت خیز خبر سنائی۔

''کیا کہہ رہی ہیں آپ باجی'' ایمن نے کپکپاتے لہجے میں کہا۔

''جو تم سن چکی ہو'' اسمارہ کا انداز حتمی تھا۔

''آپ میرے ساتھ اتنا بڑا ظلم نہیں کر سکتیں'' ایمن نے روتے ہوئے کہا۔

''سیٹھ باقر کے ساتھ شادی کے بعد عیش کرو گی عیش'' اماں نے بھی اس کار خیر میں حصہ لینا ضروری سمجھا۔

''وہ پچاس سالہ مکار بڈھا...... میں کبھی بھی اس سے شادی نہیں کروں گی''

''مرد کی عمر کون دیکھتا ہے اتنی دولت ہے اس کے پاس...... اتنا بڑا بزنس ہے۔ تمہاری تو لاٹری نکل آئی ہے جو سیٹھ باقر کی نظر انتخاب تم پر ٹھہری'' اماں نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

''اگر اتنا ہی شوق ہے تو خود کر لیں'' ایمن نے اسمارہ کی طرف دیکھ کر غصے سے کہا۔

''مزید بک بک کی ضرورت نہیں، اسی ہفتے تمہارا سیٹھ باقر سے نکاح ہے'' وہ تمام معاملات بالا ہی بالا طے کر چکی تھیں۔ ایمن کو بتا کر انہوں نے صرف فارمیلٹی نبھائی تھی۔

اسمارہ نے اس کے باہر جانے پر پابندی لگا دی تھی۔ اسے فون کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ وہ سارہ سارا دن کمرے میں بند روتی رہتی۔ نکاح سے ایک دن پہلے امن آ گئی، اسے بھی ایمن کے نکاح کی یہاں آ کر خبر ملی تھی اس نے سنا تو ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ وہ کسی بھی صورت سیٹھ باقر سے ایمن کی شادی کے حق میں نہ تھی۔ امل کو بھی خبر ہو گئی تھی لہٰذا وہ بھی میدان میں کود پڑی، یہاں تک کہ اس نے اپنے دیور کا رشتہ بھی پیش کیا مگر اسمارہ کی ناں ہاں میں نہ بدلی۔ وہ جو فیصلہ کر چکی تھی اس سے ہٹنا وہ اپنی توہین سمجھتی تھی۔

باقر گردیزی نے دس لاکھ کا چیک ایمن کی شاپنگ کے لیے ڈرائیور کے ہاتھ بھیجا تھا اور وہ ہی چیک اماں اترا اترا کر امل اور امن کو دکھا رہی تھیں۔

''اماں! ایسی آسائشات کا کیا فائدہ کہ ہم سفر ہی ناپسندیدہ ہو'' امن نے تلخی سے کہا۔

''تم دونوں جلتی ہو کہ ایمن کی شادی تم دونوں سے زیادہ دولت مند گھرانے میں ہو رہی ہے''

"ہمیں صرف ایمن کی بدنصیبی کا دکھ ہے۔ وہ شخص کسی بھی صورت ایمن کے قابل نہیں" امل نے بھی غصے سے کہا۔

"اسمارہ اچھا نہیں کر رہی"

"اسی اسمارہ کی وجہ سے تمہیں زوہیب اور امل کو حسن بیاہنے آیا تھا۔ رہتیں نا اس پرانے محلے میں تو میں دیکھتی کیسے تم دونوں من کی مراد پاتی ہو۔ کسی ڈاکٹر، انجینئر نے ان گندی گلیوں میں نہیں آنا تھا۔ تمہیں تو اپنی بڑی بہن کا احسان مند ہونا چاہئے" اماں نے ہاتھ نچا کر کہا تھا۔

"اسمارہ کے بڑے احسانات ہیں مگر ایمن کے ساتھ وہ اچھا نہیں کر رہی" اماں کے جانے کے بعد امل اور امن بھی باہر نکل گئیں۔ کچھ دیر بعد امن دوبارہ آ گئی۔ اس نے بتایا۔

"باقر گردیزی اپنے گنے چنے دوستوں کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں موجود ہے۔ اماں نے مولوی بھی بلوالیا ہے یقیناً کچھ دیر بعد نکاح کی کارروائی شروع کر دی جائے گی" اسی اثنا میں امل بھی چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھا۔ وہ دونوں اس کے کان کے قریب جھک آئیں۔ ایمن حیران پریشان سی ان کی باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"وقت کم ہے جلدی کرو" امن نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

"اٹھو ایمن" امل نے اس کا بازو پکڑ کر کھڑا کیا۔ ایمن کے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ وہ بہت خوفزدہ تھی۔

"مگر گیٹ پر تو گارڈ کھڑا ہے" امن نے پریشانی کے عالم میں گلاس ونڈو سے جھانکا۔

"میں نے پچھلے دروازے کا لاک کھول دیا ہے" امل مطمئن تھی۔ پھر آہستگی سے بولی۔

"اس بیگ میں قیمتی زیورات اور کچھ نقد رقم موجود ہے تم فکر مت کرنا، ہم عنقریب تم سے ملنے کے لیے آئیں گے۔ تمہاری بی بی بہت اچھی ہے، یقیناً وہ تمہاری مدد کرے گی۔ کچھ وقت گزر جانے دو، پھر میں اور امن تم سے ملنے آئیں گے۔ اپنی ساس کو اعتماد میں لے کر میں تمہارا پرپوزل ایک مرتبہ پھر پیش کروں گی۔ حسنین پڑھا لکھا اور اسمارٹ نوجوان ہے کم از کم اس سیٹھ سے ہزار درجے بہتر ہے تم فکر مندمت ہونا، پیچھے سے ہم سب سنبھال لیں گے۔ جاؤ تم، دیر مت کرو...... ورنہ اماں اور اسمارہ نے تمہارا سودا تو کر ہی ڈالا ہے" امل نے اس کی پیشانی چوم کر لان کی طرف کھلنے والے دروازے سے باہر دھکیلا۔

ایمن کی آنکھوں میں آنسو رواں تھے وہ جو اپنی تینوں بہنوں کو خود غرض سمجھتی تھی آج

امل اور امن کی محبت محسوس کر کے اس کی آنکھیں بہہ رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی بہنیں اس کی زندگی کی بقا کی خاطر آگ میں کود پڑی ہیں۔

سیٹھ باقر نے ایمن کے بدلے اسمارہ کو ایک بھاری رقم دے کر ہمیشہ کے لیے خرید لیا تھا۔ اگر امن، اسمارہ کا منصوبہ جان لیتی تو انہوں نے بے خبری میں ہی مارا جانا تھا۔ سیٹھ باقر نے اسمارہ کو اتنی بڑی رقم کی آفر کی تھی کہ وہ خود تن تنہا اگر جیولری کا بزنس شروع کرتی بغیر پارٹنر کے تب بھی اس کے پاس رقم ختم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

رات اتنی گہری، کالی اور بھیانک تھی کہ ایمن کا رواں رواں لرز اٹھا۔ روڈ سے اس نے ٹیکسی پکڑ لی تھی...... بی بی کے گھر کے قریب ٹیکسی رکی اور وہ لرزتے قدموں سے چلتی اندرونی حصے کی طرف بڑھ آئی۔

بی بی اسے رات کے اس پہر اتنی بکھری حالت میں دیکھ کر پریشان ہو اٹھی تھیں اور ایمن کو نہ جانے کیا ہوا وہ ان کے قدموں میں گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ بی بی نے اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر سینے میں بھینچ لیا۔

ان کے دکھ بھی تو ایسے ہی تھے انہیں بھی تو اپنوں نے عذاب دیئے تھے وہ بھی تو اپنی ماں سے شکوہ کناں تھیں جس نے انہیں پیدا کیا تو کیا مگر تحفظ نہ دیا۔ اور ام ایمن بھی تو اپنی ماں سے خفا تھی، ناراض تھی، جسے اپنی پھول سی بیٹیوں کی حفاظت کرنا نہ آئی۔

☆☆☆

اس نے بی بی سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا سب صاف صاف بتا دیا۔ انہیں سب کچھ بتانے کے بعد وہ ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔

بی بی نے اسے بہت پیار دیا تھا بہت مان دیا۔ وہ ایمن کو اپنی تنہائیوں کا ساتھی سمجھتی تھیں۔

ان دنوں بی بی نے اپنے گاؤں میں اسکول کھولنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ یہ خواب تو بہت عرصے سے ان کی آنکھوں میں جگ مگا رہا تھا مگر جب تک ان کے بابا جان زندہ رہے انہوں نے گاؤں میں کسی کو بھی اسکول بنوانے کی اجازت نہیں دی تھی اسی لیے تو گوٹھ کی اکثریت ان پڑھ تھی۔

انہوں نے اپنی حویلی کیساتھ بنی بڑی سی عمارت کو باقاعدہ اسکول کی شکل دے دی

تھی۔اسکول کے لیے بہترین اسٹاف کے لیے انہوں نے اخبار میں اشتہار دے دیا تھا۔رہائش اور کھانے پینے کی سہولت موجود تھی۔اسی لیے تو کم ہی عرصے میں گوٹھ کے قریب شہر اور اردگرد کے گاؤں میں سے انہیں جاب کے لیے درخواستیں ملنے شروع ہو گئیں۔

اسکول کی کامیابی نے ان کی بوڑھی آنکھوں میں رنگ بھر دیئے تھے۔انہیں اتنے سالوں بعد اپنی زندگی کا مقصد مل گیا تھا وہ اور ایمن مہینے میں دو تین چکر گوٹھ کے لگا لیتی تھیں۔

اس دن بھی جب وہ دونوں گوٹھ سے واپس شہر آئیں تو گھر میں موجود ایمن اور امل کو دیکھ کر ایمن کی خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی۔وہ اس سے ملنے کے لیے آئی تھیں اور انہوں نے ایمن کو بتایا تھا کہ باقر گردیزی اور اسارہ اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہے ہیں اور یہ کہ وہ جب بھی باہر نکلے بہت ہی احتیاط کے ساتھ۔اسی طرح دو تین مہینے مزید گزر گئے اور ایک روز امل اپنی ساس کے ساتھ چلی آئی۔اس کی ساس واقعی بہت نیک اور اچھی خاتون تھیں۔انہوں نے بی بی سے ایمن کے رشتے کی بات کی اور نہ جانے کیوں بی بی نے بہت واضح لفظوں میں انکار کر دیا۔

امل کو اس انکار کی توقع نہیں تھی۔وہ تو یہی سمجھ رہی تھی کہ بی بی اس معاملے میں ان کے ساتھ تعاون کریں گی اور ایمن محفوظ ہاتھوں میں چلی جائے گی مگر بی بی نے امل کو بہت نرمی سے دبے دبے لفظوں میں سمجھایا۔

''ایمن اب بھی محفوظ ہاتھوں میں ہے یہ میری بیٹی ہے اور اس کے بارے میں تم پریشان مت ہو، میں ہوں نا ایمن کا ساتھ دینے والی'' بی بی کے لاکھ سمجھانے پر بھی امل مطمئن نہیں ہوئی تھی اور فی الحال وہ ایمن کو ساتھ بھی نہیں لے جاسکتی تھی۔وہ چاہتی تھی کہ اسی گھر میں ایمن کا نکاح ہو جائے حسنین کے ساتھ اور پھر پیپرز تیار ہونے کے بعد ایمن ڈائریکٹ کینیڈا حسنین کے پاس چلی جائے۔امل کو پریشان دیکھ کر انہوں نے اسے اپنے کمرے میں بلوا لیا اور پھر واضح لفظوں میں اپنا ارادہ ظاہر کر دیا۔اب کے امل بھی حیران پریشان رہ گئی تھی۔اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ بی بی سچ کہہ رہی ہیں۔

''آپ جو کرنا چاہتی ہیں جلد از جلد کر لیجیے' میں ایمن کو محفوظ دیکھنا چاہتی ہوں'' امل نے ان کے ہاتھ چوم کر آہستگی سے پرنم آواز میں کہا تھا۔

''میں صرف ایک ہفتے کا وقت چاہتی ہوں''

اور پھر بی بی نے جو کہا تھا اس پر عمل کر کے بھی دکھا دیا۔امل اور امن ایمن کا نکاح

ہونے کے بعد بھی حیران تھیں۔بے یقین تھیں۔

''مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ ابا اور دادی کی ساری دعائیں صرف تمہارے لیے تھیں'' امن نے چپکے سے اس کے کان میں شاہ عالم کو دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

''ایمن کو اس کی اچھائیوں کا صلہ ملا ہے'' امل نے بھی آہستگی سے کہا تھا۔

''مجھے لگ رہا ہے کہ آج ابا اور دادی کی روح بہت مسرور ہو گی''

''ایمی! اللہ تمہیں ڈھیروں خوشیوں سے نوازے'' امن نے اس کی پیشانی چوم کر کہا تھا۔اسے دعاؤں کی بہت ضرورت تھی۔ابا کی، دادی کی اور اماں کی دعاؤں کی۔اسے افسوس تھا کہ اس کی بہنیں دعاؤں کے انمول تحفوں کے بغیر رخصت ہو گئی تھیں کہ اماں کو فرصت ہی اس وقت کہاں تھی بیٹیوں کو دعا دینے کی۔

بی بی کی محبت اور دعا اس کی ہم سفر تھی۔اسے کیوں اجنبی راہوں سے خوف محسوس ہوتا۔وہ اللہ کی شکر گزار تھی جس نے بن مانگے ہی اسے سب کچھ عطا کر دیا تھا۔

اس کا محبوب اس کے ہمراہ تھا۔اب راستوں کی کٹھنائیاں اور راہوں کے پتھروں سے ٹھوکر لگ جانے کا خوف نہیں تھا۔وہ جانتی تھی کہ دو ہاتھ ایسے ہیں جو اسے سنبھال لیں گے۔

اس نے بیس سال کی عمر میں زندگی کا ہر روپ دیکھ لیا تھا، بدصورت، کریہہ اور بہت حسین بھی۔

اور زندگی شاہ عالم کے ہمراہ بہت حسین ہو گئی تھی۔وہ شاہ عالم جسے اک نظر دیکھ کر ہی وہ اسیر ہو گئی تھی۔وہ چاہے جتنا بھی غصیلا، نک چڑھا اور موڈی تھا غیر محسوس طریقے سے اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔

وہ نکاح کے کچھ ہی عرصہ بعد بی بی کے اصرار پر اسلام آباد شفٹ ہو گئی تھی۔عالم پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ایس پی کے عہدے پر فائز تھا۔اسے تنہا رہنے کی عادت تھی۔بقول بی بی کے کنول اور اس کے درمیان جھگڑا بھی یہی تھا۔وہ چاہتا تھا کہ کنول لاہور میں بی بی کے پاس رہے۔چھوٹی چھوٹی باتیں ہی وجہ اختلاف بنی تھیں۔مگر ایمن کو ساتھ لانے میں اس نے کسی بھی قسم کا اختلاف نہیں کیا تھا۔بی بی کے ساتھ ساتھ عادل بھی حیران تھا۔وہ اکثر ایمن سے ٹھنڈی آہ بھر کر کہتا۔

''مجھے تو لگتا ہے سید شاہ عالم صاحب ایمن بی بی کے حسن سے متاثر ہو ہی گئے ہیں''

اسلام آباد میں آ کر روٹین لائف شروع ہو گئی تھی۔ وہ صبح خیز تھی، چار بجے کے قریب اس کی آنکھ کھل جاتی۔ نماز پڑھنے اور تلاوت کرنے کے بعد وہ عالم کی تمام چیزیں نکال کر ترتیب سے رکھ دیتی پھر اس کا من پسند ناشتا بناتی۔ اس کی تیاری میں مدد بھی کرواتی۔ اکثر شاہ عالم اس سے کہتا تھا۔

''اے...... میری عادتیں نہ بگاڑو'' یا پھر کبھی کبھی یوں کہتا۔

''جان بوجھ کر مجھے اپنا عادی بنانا چاہتی ہو''

''یہی سمجھ لیں''

''کیوں؟'' وہ تنگ کر پوچھتا۔

''اس لیے کہ اگر کبھی خدانخواستہ آپ مجھے کنول کی طرح چھوڑ دیں، تو کم از کم میں آپ کو یاد تو آتی رہوں گی''

''اونہہ...... ایسے کام تو نوکرانیاں بھی کر لیتی ہیں، انہیں تو یاد نہیں کیا جاتا'' وہ جان بوجھ کر طنزیہ انداز میں کہتا تھا۔

''بیوی اور نوکرانی میں بہت فرق ہے'' ایمن سنجیدگی سے کہتی۔

''کیا فرق ہے؟'' وہ مزید اسے بولنے پر اکساتا۔ ایمن نے کچھ نہ کہا بس خاموش رہی۔

''بولو بھی......؟''

''مجھے نہیں پتا''

''کیوں نہیں پتا...... جواب دو میری بات کا'' عالم کو خوانخواہ غصہ بھی بہت آتا تھا۔

''بتاؤ...... بولو'' وہ مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور پھر معنی خیزی سے بولا۔

''میں بتاتا ہوں تمہیں کہ نوکرانی اور بیوی میں کیا فرق ہے'' اس نے لفظ بیوی پر زور دے کر کہا اور مزید بولا۔

''نوکرانی گھر کے کام کرتی ہے جبکہ بیوی گھر کے کاموں کے ساتھ ساتھ بیڈروم بھی شیئر کرتی ہے آئی تھینک میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا'' اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا تھا۔ وہ کافی بے باک تھا' ایمن نے مزید اسے چھیڑنے سے توبہ کی...... پھر کافی دن عالم نے انہی الفاظ کو اس کی چڑ بنائے رکھا۔

چند دن بعد وہ عالم کے ساتھ ایک پارٹی میں شرکت کی غرض سے آئی۔ اس نے جو دو تین پارٹیاں اٹینڈ کی تھیں وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ یہ پارٹی بھی یقیناً اسی قسم کی ہوگی۔ مگر یہاں آ کر

اس نے اپنے خیالات بدل لیے۔

اگرچہ مکس گیدرنگ تھی مگر سب ہی لوگ بہت ڈیسنٹ تھے۔ زیادہ تعداد عالم کے دوستوں کی تھی جو کہ فیملیز کے ہمراہ آئے تھے۔ ایمن جو دل ہی دل میں کافی خوفزدہ تھی اب پر سکون ہو چکی تھی۔ اس کے ذہن سے اک نادیدہ بوجھ ہٹ گیا تھا۔

''عالم! تمہاری وائف بہت کیوٹ ہے''

''تھینکس'' اس نے یہ تعریف اپنا حق سمجھ کر وصول کی تھی۔ تقریباً سب کو ہی ایمن پسند آئی تھی۔ خرم کی بیوی تو کچھ زیادہ ہی ایمن پر فدا ہو گئی تھی۔

''عالم! ایمن تو بہت کیوٹ ہے، چارمنگ اور انوسینٹ ہے''

''پھر کب آ رہی ہو ایمن ہمارے گھر'' انہوں نے بڑے خلوص سے کہا تھا۔ ایمن نے فوراً ہامی بھر لی۔ مسز عارف بھی ان کے قریب چلی آئیں اور ایمن سے کہا۔

''یہ پارٹی تم دونوں کی شادی کی خوشی میں ارینج کی گئی ہے''

''نہیں، کنول سے جان چھوٹنے کی خوشی میں، قسم سے بیوی تو وہ تمہاری تھی اور تگنی کا ناچ ہم سے نچواتی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ تمہارے ساتھ ساتھ ہماری بھی جان چھوٹ گئی'' خرم نے عالم کے کان میں سرگوشی کی تو اس نے بھی خرم کے کندھے پر اک دھپ رسید کی۔

واپسی پر ایمن کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔

''بہت خوش دکھائی دے رہی ہو...... اپنی تعریفیں سن سن کر'' شاہ عالم نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے کہا۔

''سب لوگ بہت اچھے تھے، خصوصاً خرم بھائی کی بیگم ندا مجھے بہت اچھی لگیں''

''اس نے شاید تمہاری زیادہ تعریف کی تھی'' شاہ عالم نے چونک کر کہا۔

''جی نہیں، وہ مجھے ویسے ہی بہت اچھی لگی تھیں'' ایمن نے مسکرا کر کہا۔

''خواتین کی یہ بہت بری عادت ہے۔ جہاں کہیں کسی نے تعریف کے دو بول بولے یہ فوراً ہی نثار ہو جانے کے لیے تیار ہو گئیں''

''اچھا، تو آپ جیلس ہو رہے ہیں میری تعریف سن کر'' ایمن نے ابھی تو پتے کی بات کی تھی۔

''میں کیوں جیلس ہوں گا...... وہ بھی تم سے'' عالم نے استہزائیہ کہا۔

''خود سے تو کبھی اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ میری تعریف کر دیں۔ اب اگر میں کسی کو اچھی لگی ہوں تو کتنا افسوس ہو رہا ہے آپ کو''

''میں نے تمہاری کبھی تعریف نہیں کی'' شاہ عالم نے سوچتے ہوئے کہا۔

''نہیں تو'' ایمن رنجیدگی سے بولی۔ ان تین چار مہینوں میں اسے نہیں یاد آیا کہ کبھی عالم نے اسے دیکھ کر سراہا ہو۔

''چلو آج گھر چل کر فرصت سے تمہاری تعریف کروں گا'' شاہ عالم نے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''مجھے...... ایسی تعریف کی ضرورت نہیں، اتنی اچھی تو میں لگ ہی رہی تھی، آپ نے ایک بار بھی غور سے نہیں دیکھا''

''ایکچو لی! میری تعریف کا انداز قدرے مختلف اور جارحانہ ہے۔ تم نازک سی جان کہاں برداشت کر پاتی ہو۔ اب اگر مجھے مزید طعنے مارے تو یہیں گاڑی میں تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دوں گا'' وہ کس بات کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ایمن کا سارا لہو گالوں میں جمع ہو گیا۔ اس نے شرم سے مغلوب ہو کر قدرے رخ پھیر لیا تھا۔

''بہت خراب ہیں آپ''

''اچھا......'' وہ معنی خیزی سے مسکرایا۔

''دھیان سے ڈرائیونگ کریں، مجھے مرنے کا ابھی کوئی شوق نہیں''

''کس بات کا شوق ہے''

''آپ پر مر مٹنے کا'' اس کی زبان خواہ مخواہ ہی پھسل گئی تھی۔ عالم زیر لب مسکراتا رہا۔

گھر آ کر بھی اس کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔

ایمن چائے بنا لائی تھی، پھر کپڑے چینج کرنے کی غرض سے بیڈ روم میں چلی آئی۔ عالم بھی اس کے پیچھے ہی آ گیا۔

''ابھی چینج نہ کرو، ابھی تو میں نے تمہیں غور سے دیکھنا ہے''

''پلیز......'' وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

''کیوں اپنی تعریف نہیں سنو گی۔ سچ کہہ رہا ہوں، پچھلی ساری کسر پوری کر دوں گا'' اس نے مسکراتے ہوئے مگ رکھا اور اس کے قریب چلا آیا۔ وہ بالوں میں برش کرتے ہوئے چونکی۔

''تم بہت خوبصورت ہو، مجھے کچھ کچھ اچھی لگتی ہو'' وہ اس کے بالوں پر ٹھوڑی ٹکا کے مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا اور ایمن اس کی پناہوں میں خود کو محفوظ تصور کر رہی تھی۔

☆☆☆

''آپ مجھے ہنی مون پر نہیں لے کر گئے'' وہ دو دن بعد گھر آیا تھا اس دوران ندا بھابھی اس کے پاس رہی تھیں۔ اس وقت وہ عالم کے پہلو میں لیٹی شکوہ کناں تھی۔

''یہ خیال آپ کو کیسے آیا؟'' عالم نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

''سب لوگ شادی کے بعد ہنی مون پر جاتے ہیں''

''سب کون؟''

''ندا بھابھی وغیرہ بھی گئے تھے نادرن ایریاز...... خوب گھوم پھر کر آئے تھے وہ لوگ، میں نے تصویریں بھی دیکھی ہیں'' ایمن نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''تو آپ بھی ہنی مون منانا چاہتی ہیں''

''ہاں......'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو اس میں اتنا رنجیدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے ابھی منا لیتے ہیں ہنی مون'' شاہ عالم نے مسکان لبوں میں دبائی اور اس کی گردن کے گرد بازو حمائل کر کے خود سے قریب کر لیا۔

''جی نہیں'' اس نے تنک کر کہا۔

''ہنی مون میں لوگ کسی دوسری جگہ جاتے ہیں گھومتے پھرتے ہیں اور''

''اور دن رات رومانس جھاڑتے ہیں، تو یہ کام ادھر رہ کر بھی ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ناران اور کاغان کی سڑکوں پر مارے مارے پھرنے کے بعد ڈائیلاگ جھاڑے جائیں'' شاہ عالم نے اس کی بات کاٹ کر کہا تو وہ قدرے خفا ہو گئی۔

''مجھے لگتا ہے کہ یہ پٹیاں تمہیں ندا نے پڑھائی ہیں اس سے تو میں پوچھ لوں گا'' شاہ عالم کے دھمکانے پر وہ پریشان ہو اٹھی تھی۔

''ارے نہیں، ندا بھابھی کا تو کوئی قصور نہیں، میں نے خود ان سے پوچھا تھا۔ اچھا چھوڑیں اس بات کو یہ بتائیں لاہور کب جائیں گے؟''

''کیوں''

''بی بی سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے'' وہ اداسی سے بولی۔

''وہ تو گوٹھ گئی ہیں''

''کب آئیں گی؟''

''کچھ دن رہیں گی شاید'' وہ سوچتے ہوئے بولا۔

''پہلے تو نہیں رہتی تھیں وہاں''

''ہاں، شاید اسکول کا کوئی کام ہے''

''ایک بات پوچھوں؟'' ایمن نے آہستگی سے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''ہاں......''

''عادل اور فاریہ کے درمیان جھگڑا ہوا ہے''

''ہوں......'' عالم نے ہنکارا ابھرا۔

''کیوں؟''

''فاریہ کے ڈیڈی نے کچھ زمینوں کا مطالبہ کیا ہے''

''مگر کیوں؟'' ایمن الجھی۔

''وہ فاریہ کا مستقبل محفوظ دیکھنا چاہتے ہیں۔ دوسرے معنوں میں انہیں ہمارے خاندان پر بھروسہ نہیں، کیونکہ ہمارا خاندان دو دو تین تین شادیوں کی وجہ سے بدنام ہو گیا ہے'' شاہ عالم نے سنجیدگی سے کہا۔

''عادل کیا کہتا ہے؟''

''فی الحال تو خاموش ہے، دیکھو کیا ہوتا ہے''

''بی بی کیا کہتی ہیں......ان کا کیا ارادہ ہے؟'' ایمن نے پریشانی سے پوچھا۔

''وہ تو یقیناً ان کی ڈیمانڈ پوری کر دینے کے حق میں ہی فیصلہ دیں گی''

''اور اگر عادل نہ مانا تو''

''تو پھر مجھے کیا پتا'' عالم اس کے پے در پے سوالوں سے زچ ہوا تھا۔

''کس قدر پریشانی کی بات ہے مگر آپ کو تو کوئی پروا نہیں''

''اب میں کیا کروں، فاریہ کے ڈیڈی کے گھٹنے پکڑوں یا پھر عادل کی منتیں کروں کہ یار تم ہی مان جاؤ......وہ بڈھا تو نہیں سنتا کسی کی'' عالم نے جھنجلا کر کہا تو ایمن غصے سے اٹھ گئی۔

''کہاں جا رہی ہو''

''بھاڑ میں''

''یہ کون سی جگہ ہے''

''پیراڈائز ہے''

''مجھے بھی لیتی جانا......کیا اکیلے ہنی مون منانا ہے پیراڈائز میں'' عالم نے دہائی دی اور پھر اسے زور زور سے پکارنا شروع کر دیا۔ ایمن گھبرا کر واپس آ گئی تھی۔

''کیا کر رہی ہو؟''

''آپ کے لیے دودھ گرم کر رہی تھی''

''مجھے تو نہیں دودھ پینا''

''کیوں؟''

''میری مرضی''

''تو نہ پییں میں منتیں تو نہیں کروں گی'' ایمن نے جان بوجھ کر کہا۔

''بی بی تو کہتی تھیں تمہارے منہ میں زبان نہیں ہے اب بھی آ کر تمہاری زبان کے جوہر دیکھیں تو عش عش کر اٹھیں''

''تو آپ میری شکائتیں لگائیں گے بی بی سے''

''ہاں''

''مگر کیوں؟ میں تو اتنی خدمت کرتی ہوں آپ کی......کبھی تعریف تو نہیں کی، الٹا شکایتیں لگانے کی دھمکیاں دیتے ہیں''

''کون سی خدمت کرتی ہو جو اب تمہیں ایوارڈ دیا جائے'' شاہ عالم نے اسے چڑایا۔

''مجھے کسی ایوارڈ کی ضرورت نہیں مجھے تو'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔ ''ہاں بولو......خاموش کیوں ہو گئی ہو۔ کہہ لو مجھے برا بھلا جو کہنا ہے'' شاہ عالم نے چہرے پر مسکینی طاری کر لی تھی۔ ایمن خاموش رہی تو وہ اسے بولنے پر اکسانے لگا۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتی بیڈ روم کے دروازے تک آئی اور پھر آہستگی سے بولی۔

''مجھے صرف اور صرف آپ کی محبت چاہیے، اتنی ہی جتنی کہ میں آپ سے کرتی ہوں'' وہ کہہ کر رکی نہیں تھی جبکہ شاہ عالم ششدر سا بند دروازے کو دیکھتا۔

☆☆☆

"میں کنول ہوں اور تم یقیناً شاہ عالم کی بیوی ہو" اس دن ندا کے گھر کنول سے ایمن کی مڈبھیڑ ہوگئی تھی۔

"ہاں" ایمن نے تفاخر سے کہا۔

"کیا تم جانتی ہو کہ میں ندا اور عالم یونیورسٹی فیلو تھے"

"نہیں"

"میری اور شاہ عالم کی لومیرج تھی" کنول کے بتانے پر ایمن جھٹ سے بولی۔

"میں نے تو سنا ہے کہ آپ ہی شاہ عالم سے شادی کی خواہش مند تھیں"

"تمہیں یقیناً اس بڑھیا نے بتایا ہوگا۔ بہت چالاک بڈھی ہے۔ تم بچ کر رہنا اس سے، عالم ہر بات مانتا ہے اس کی" کنول نے حقارت سے کہا تو ایمن کے دل کو سخت ٹھیس پہنچی بی بی کے متعلق کنول کے کے خیالات جان کر۔

"بی بی تو بہت اچھی ہیں"

"بڑی ڈرامہ باز بڈھی ہے۔ اربوں کی جائیداد کی مالک ہے مگر دل چڑیا جتنا ہے۔ کسی کو کچھ دینے کا حوصلہ نہیں ہے اس میں، میں نے کتنی ہی منتیں کی تھیں کہ اسلام آباد والا پلازہ میرے نام کردو مگر نہ جی...... مجھے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ عالم نہیں مانتا" کنول نے کڑوے لہجے میں کہا۔

"عالم نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ بی بی کا انتخاب غلط ہے" ایمن زیرلب بڑبڑائی۔ کنول کے جانے کے بعد ندا نے گہرا سانس کھینچا اور بولی۔

"ایسی عورت کے ساتھ تین منٹ رہنا بہت مشکل ہے کجا کہ عالی نے تین سال گزارے تھے۔ وہ بھی بی بی کے مجبور کرنے پر"

جب وہ گھر آئی تو عالم پہلے سے ہی موجود تھا۔

"کہاں گئی تھیں آپ"

"ندا بھابھی کی طرف گئی تھی" ایمن نے آہستگی سے بتایا۔

"خیریت...... بڑی اداس اداس لگ رہی ہو"

"کنول سے ملاقات کا نتیجہ ہے" وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔ شاہ عالم چونک گیا۔

"ندا سے ملنے گئی ہوگی، تم نے اسے منہ نہیں لگانا تھا"

"مجھے اس سے ملنے کا بھی کوئی شوق نہیں تھا کجا کہ منہ لگانا" ایمن نے تھکی آواز میں

کہا۔ اور بولی۔

"پتا ہے عالم! وہ بی بی کے متعلق بہت گھٹیا زبان میں بات کررہی تھی۔"

"اپنے ازلی لالچ اور تلخ کلامی کی وجہ سے آج اس انجام کو پہنچی ہے۔ جن فرینڈز سے ملنا وہ گوارا نہیں کرتی تھی اب بھاگ بھاگ کر ان کے گھر جاتی ہے جب تک وہ یہاں رہی کبھی ندا یا خرم سے ملنا پسند نہیں کرتی تھی" نہ جانے کس رو میں عالم نے یہ چند باتیں کرلی تھیں ورنہ کنول کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔

"دفع کرو اس ذکر کو میرے لیے اچھی سی چائے بنالاؤ" ایمن سر ہلاتے ہوئے اٹھ گئی تھی۔

اور یہ اسی شام کی بات تھی جب عادل چلا آیا۔ بہت غصے میں دکھائی دے رہا تھا وہ کافی دیر اپنے مزاج کے خلاف چنگھاڑتا رہا۔

"یار! غصے سے نہیں عقل سے کام لو" عالم نے اسے کول ڈاؤن کرنا چاہا۔

"میں انکل کی ڈیمانڈ ہرگز نہیں پوری کروں گا"

"تم نے کون سا جائیداد انکل کے نام کروانی ہے، یہ سب وہ فاریہ کے تحفظ کے لیے چاہ رہے ہیں" عالم نے اسے سمجھایا۔

"کنول بھی تو پراپرٹی کی ڈیمانڈ کرتی تھی" عادل نے بھنا کر کہا۔

"وہ تو شروع سے ہی لالچی اور مطلبی تھی جبکہ فاریہ ایسی نہیں ہے"

"پھر بھی میں ان کی بات ماننا اپنی توہین سمجھتا ہوں انہیں مجھ پر اعتماد نہیں" عادل نے غصے سے کہا۔

"یار! بھلا وہ اعتماد کیوں کریں...... ان کی بہن پر، ڈیڈی نے سوتن لا بٹھائی تھی محض چند دن کے لیے ہی سہی مگر تمہیں کیا پتا کہ کیسا طوفان اٹھا تھا اس وقت"

"ہاں عادل! تم انکل کی بات مان لو، ہر باپ اپنی بیٹی کا تحفظ چاہتا ہے" ایمن نے بھی آہستگی سے کہا تھا۔

"ان کی بیٹی کو میں نقد رقم اور بھاری قیمتی زیورات تو دے سکتا ہے مگر اپنی خاندانی جائیداد نہیں" عادل نے پتھریلے لہجے میں کہا تھا نا جاگیردار۔ ایمن کے کہنے پر شاہ عالم نے انکل سے تفصیلاً بات کی تھی۔ وہ بے چارے اپنا موقف بیان کرتے رہے جبکہ عالم نے انہیں قائل کر

کے ہی چھوڑا تھا۔

اللہ اللہ کر کے شادی کی ڈیٹ فکس کی گئی تھی اور پھر آناً فاناً بی بی نے فاریہ کو بیاہ لانے کا فیصلہ کرلیا۔ ڈیٹ بھی وہ لوگ چھ ماہ کی دے رہے تھے مگر بی بی نے ایک نہ سنی اور عادل کا واپس لندن جانے کا بہانہ بھی کام کر گیا۔ یوں اتنے لڑائی جھگڑوں اور تلخیوں کے بعد فاریہ صاحبہ بیاہ کر لندن سدھار گئیں اور ان سب نے بھی گویا سکون کا سانس لیا۔

فاریہ اور عادل کے جانے کے بعد شاہ عالم نے ایمن کی پہلی خواہش کو بھی پورا کردیا تھا۔ اس نے کبھی عالم سے فرمائش نہیں کی تھی۔ کبھی شاپنگ کے لیے ضد نہیں کی، نہ فضول پیسے مانگتی تھی وہ جو رقم دیتا تھا ایمن اسی میں مہینے کا راشن خرید لاتی جب عالم نے ایمن کو دبئی جانے کا بتایا تو ساتھ بطور خاص ہنی مون کا ذکر کیا اور بولا۔

''اسے اپنا ہنی مون ٹرپ ہی سمجھنا''

''دبئی میں ان کا قیام صرف پندرہ دن کا تھا مگر ایمن صاحبہ تیسرے دن ہی بیمار ہو گئیں۔ عالم خوب جھنجلایا تھا۔

''کیا ضرورت تھی بیمار ہونے کی۔ اگر یوں ہی بیڈ پر لیٹنا تھا تو گھر میں ہی ٹھیک تھیں تم''

''میں جان بوجھ کر تو بیمار نہیں ہوئی'' وہ روہانسی ہو کر منمنائی تھی۔ رات کو عالم اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا واپسی پر ایمن ہی نہیں شاہ عالم بھی حد درجہ خوش تھا۔ بار بار فرط مسرت سے اس کا ہاتھ چوم کر کہتا۔

''یہ بیماری تو مبارک ثابت ہوئی ہے''

پہلے وہ اس کے لیٹنے بیٹھنے پر جھنجلاتا تھا اور اب ہر وقت اسے آرام کرنے کی تلقین کیے رکھتا۔ اس نے بی بی کو فون پر خوشخبری سنادی تھی۔

دبئی ایئرپورٹ پر بالکل اچانک ہی اسارہ پر اس کی نظر پڑی تھی۔ اسارہ نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آنکھوں میں گویا خون اتر آیا۔ اسارہ کے چہرے پر اتنی نفرت تھی کہ ایمن لرز اٹھی۔

گھر آنے کے بعد بھی جب وہ اسارہ کے چہرے پر پھیلے زہریلے تاثرات کا تصور کرتی تو خوف سے اس کی ٹانگیں لرزنے لگتی تھیں۔

اس خوف نے دو مہینے ایمن کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ نارمل

ہوگئی جبکہ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اسارہ یقیناً اسے بھول گئی ہوگی مگر یہی اس کی سب سے بڑی بھول تھی۔

اسارہ بھولی نہیں تھی اسے بس یاد تھا وہ بھول بھی کیسے سکتی تھی اپنی بے عزتی کو جو سیٹھ باقر نے اس کی کی تھی۔ اسے بھری محفل میں شرمندہ کیا، کیچڑ اچھالا تھا اس پر، اسے سرعام گالیاں دیں۔

پھر اس پر فراڈ کا کیس دائر کردیا۔ دو مہینے اسے حوالات میں رہنا پڑا۔ وہ کیسے اس اذیت ناک وقت کو بھلا دیتی۔

حوالات سے باہر نکلنے کے بعد وہ بھوکی شیرنی کی طرح اسے ڈھونڈتی رہی تھی مگر ہر دفعہ ہی ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اسے ایمن کا سراغ نہیں مل رہا تھا اور نہ ہی اہل اور امن کچھ بتاتی تھیں۔

تھک ہار کر وہ دبئی چلی گئی۔ اس نے دبئی کے تاجر کے بیٹے سے دوستی گانٹھ لی۔ اب اکثر ہی دبئی آتی جاتی رہتی تھی۔

اور دبئی آنا اس کے لیے مبارک ثابت ہوا تھا۔ اس نے ایمن کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک شاندار مرد تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد وہ ایمن کے متعلق سب جان گئی تھی۔

''اونہہ...... میں انگاروں پر لوٹوں، زمانے بھر کی رسوائیاں سمیٹوں اور تم عیش وعشرت کی زندگی گزارو'' وہ نفرت سے سلگ رہی تھی۔

''میری کامیابیوں کو گرہن لگانے والی تمہیں میں بھی چین لینے نہیں دوں گی'' سیٹھ باقر نے جو رقم اس اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروادی تھی۔ اسارہ نے جیولری کی ایک بڑی اور وسیع برانچ کھول لی۔ وہ بہت تیز دماغ رکھتی تھی لہٰذا دنوں میں ہی اس کے بزنس نے ترقی کرنا شروع کردی۔ ساتھ ساتھ وہ سیٹھ باقر کو بھی ایمن کے حوالے سے مطمئن کر رہی تھی۔ اس نے سیٹھ باقر سے جھوٹ بولا کہ ایمن کو اچانک ملک سے باہر جانا پڑ گیا ہے مگر جھوٹ کہاں تک چھپتا، سیٹھ کو تمام حقیقت کا پتا چل گیا۔ پھر اس نے اپنی رقم کا مطالبہ کیا۔ اسارہ نے پیسہ واپس کرنے سے انکار کردیا یوں اسے جیل کی ہوا بھی کھانا پڑی۔ سیٹھ نے اس کے جمے جمائے بزنس پر قبضہ کرلیا اور وہ محض غصے سے بھڑ بھڑ جلتی رہ گئی۔

اس کا ماڈلنگ کا کیریئر بھی تباہ ہوگیا۔ اب صرف جاب باقی تھی...... حسیب رضوی کے ساتھ۔

ایمن کو خوش و خرم دیکھ کر وہ آگ بگولا ہو گئی تھی۔ ایمن سے انتقام کے چکر میں وہ ہر حد عبور کر دینا چاہتی تھی۔

ایمن کی پرسکون زندگی میں اس نے ہولے ہولے شک کے پتھر مارنا شروع کر دیے تھے۔ اس نے بھرپور گیم کے ذریعے شاہ عالم کو ایمن سے متنفر کر دیا تھا اس نے ایمن اور سیٹھ باقر کی تصویروں کو اپنی پسند کے مطابق بنوا کر شاہ عالم کے پتے پر پوسٹ کر دیں۔ ایک انتہائی شرمناک ویڈیو بنوائی، چند رومانوی خطوط لکھے اور پھر اپنی جیت کا مزا لیتی رہی۔

''کسی بھی عزت دار شخص کے لیے اتنا ہی کافی ہے'' وہ بے انتہا مسرور تھی۔ دو دن بعد اسے اپنی کامیابی کی رپورٹ مل چکی تھی۔

''ایس پی شاہ عالم نے اپنی محبوبہ بیوی کو رات کی تاریکی میں تن تنہا دھکے دے کر گھر سے نکال دیا ہے''

☆☆☆

وہ بی بی کی گود میں سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

''اس نے میرا اعتبار نہیں کیا بی بی!''

''بس بیٹی مت رو، مجھے تکلیف ہوتی ہے''

''رونا میرے نصیبوں میں لکھا جا چکا ہے'' اس کا رواں رواں کرلا رہا تھا۔

''اسی لیے مجھے خوف آتا ہے بیٹیوں کے نصیبوں سے۔ تو دعا کر اللہ تجھے بیٹی کبھی بھی نہ دے'' انہوں نے تکیے پر سر پٹخنا شروع کر دیا تھا۔ رات تک ان کی طبیعت بے حد بگڑ چکی تھی۔ عادل ملک سے باہر تھا جبکہ عالم نے کہاں اس کی فون کال ریسیو کرنا تھی۔ وہ تو اس سے آخری حد تک متنفر ہو چکا تھا۔

وہ بی بی کو ہسپتال لے کر چلی گئی تھی۔ رات تک ان کی طبیعت کچھ سنبھلی تو ایمن کی جان میں جان آئی۔

صبح تک وہ گھر آ چکی تھی اور بی بی ایک مرتبہ پھر تمام تفصیل سننا چاہتی تھیں۔ ایمن نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔

''تم جانتی ہو ایمن! یہ سب کس نے کیا ہے؟''

''جی''

''کون؟ سیٹھ باقر''

''نہیں'' ایمن نے سر جھکا کر کہا۔

''پھر کون ہو سکتا ہے؟''

''اسارہ'' ایمن کی آواز بھرا گئی تھی۔

''تمہاری بڑی بہن جو ماڈلنگ کرتی تھی'' بی بی نے حیرانی سے کہا اور پھر خود ہی بولیں۔

''اس نے تم سے انتقام لیا ہے''

''ہاں''

''تم نے اس کے پسند کیے رشتے کو ٹھکرا دیا اور گھر سے چلی آئیں۔ اور اسارہ نے'' بی بی نے انتہائی دکھ کے عالم میں ایمن کا چہرہ دیکھا۔

''عالی یہ سب نہیں جانتا، میں اسے حقیقت بتاؤں گی، تم کیوں غم کرتی ہو۔ مت پریشان ہو اللہ بہتر کریگا''

اور ایمن بی بی کے دلاسے اور تسلیوں سے وہ مطمئن ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ عالم، بی بی کی بات سمجھ جائے گا۔ ایمن جانتی تھی کہ اب اس کی بے گناہی ثابت ہو جائے گی۔ وہ بہت پرسکون انداز میں سوئی تھی مگر جب اٹھی تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔

رات کے نہ جانے کون سے پہر وہ نرم دل، حساس عورت دل پر غموں اور تنہائیوں کا بوجھ لیے اس فانی دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔

ایمن کو تو گویا سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ اندر سے بالکل مر چکی تھی۔ اس کے دکھوں، غموں اور تکلیفوں پر دلاسا دینے والا وجود منوں مٹی تلے جا سویا تھا۔ تین دن وہ ہوش سے بے گانہ رہی تھی۔ بی بی کو ان کے آبائی قبرستان میں دفنایا گیا تھا۔ پورے گوٹھ میں بھی کہرام مچ گیا تھا۔ ملازموں نے بتایا کہ شاہ عالم ہی انہیں گوٹھ لے کر گیا تھا۔ ایمن بس خاموشی سے سب سنتی رہی۔

امل کو بی بی کی وفات کا پتا چلا تو وہ تعزیت کے لیے چلی آئی۔ ایمن کی بکھری حالت دیکھ کر اس نے اسے بہت تسلیاں دی تھیں۔ وہ امل کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی تھی۔

''امل! نہ جانے کیوں مجھے ان سے اماں سے بھی زیادہ محبت تھی۔

''وہ تھی ہی اس قدر اچھی کہ ان سے بے حد محبت کی جاتی۔ بہت کم ایسے لوگ ہوتے

ہیں جو دوسروں کی راہیں روشن کرتے ہیں خود کو جلا جلا کر'' امل نے بھی محبت سے کہا۔

''امن کیوں نہیں آئی''

''بس ایسے ہی مصروف تھی وہ'' امل چاہنے کے باوجود اس کی حالت کے پیش نظر امن کے بارے میں نہیں بتا سکی تھی۔

''میں چند دن بعد چلی جاؤں گی''

''کہاں'' ایمن نے حیرت سے پوچھا۔

''حسن کے پاس''

''اماں کیسی ہیں؟''

''جیسے پہلے تھیں'' امل نے پھیکے سے انداز میں کہا۔

''میں تمہیں کیسے بتاؤں امل! کہ اسارہ باجی نے میرے ساتھ کیا کیا'' ایمن نے نہایت دکھ سے سوچا مگر کہا نہیں۔

''انہوں نے مجھے اجاڑ دیا، برباد کر دیا اور پھر خود ہی فون کر کے مجھے بتایا کہ انہوں نے اپنی بے عزتی کا بدلہ مجھ سے لیا ہے۔

کیا کوئی اس قدر بھی سنگدل اور کٹھور ہو سکتا ہے'' اس نے تھک کر سوچا۔

امل چلی گئی تھی...... اور وہ امل کی بے اولادی کا دکھ بھی دل میں سموئے زندہ تھی۔ جی رہی تھی۔

عالم نے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا اسی طرح مزید پانچ مہینے گزر گئے۔ وقت گزر رہا تھا مگر اس کے دل پر گویا ایک غم کی گٹھڑی ٹھہر گئی تھی۔

☆☆☆

''یہ شیخ عمیر کون ہے؟'' حبیب رضوی نے تنک کر پوچھا تھا۔

''تم کون ہوتے ہو مجھ سے پوچھنے والے'' اسارہ نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔

''بتاؤ، کیا رشتہ ہے تمہارا اس کے ساتھ''

''دوست ہے میرا''

''اور اس کے باپ سے کیا تعلق ہے؟''

''وہ باس ہے...... میں نے اس کی کمپنی دوبئی میں جوائن کر لی ہے'' اسارہ نے

لاپرواہی سے کہا۔

''میں تمہاری محتاج نہیں''

''تم بہت اونچا اڑنے لگی ہو''

''تمہیں کیوں جیلسی کی بیماری لگ گئی ہے''

''آئندہ تم شیخ عمیر سے نہیں ملو گی''

''اونہہ...... میں نے کہا نا کہ مجھے تمہاری اجازت درکار نہیں''

''تم نے میرے اسی لاکھ روپے واپس کرنے ہیں'' حبیب نے گویا جتا کر اسے اوقات یاد دلانا چاہی تھی۔

''اور جو میں نے تمہیں کروڑوں کے حساب سے فائدہ پہنچایا ہے وہ کس کے کھاتے میں لکھو گے''

''تم مجھ سے دوگنا وصول کر چکی ہو''

''اور تم بھی ان اسی لاکھ روپوں کو بھول جاؤ''

''پچھلی مرتبہ جیل جانا بھول گئی ہو'' حبیب مکاری سے مسکرایا۔

''تم بے حد غلیظ انسان ہو''

''اپنے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے میری محبوبہ صاحبہ''

''بکواس بند کرو'' اسارہ نے چلا کر کہا اور استعفیٰ اس کے منہ پر مار کر چلی گئی تھی جبکہ حبیب کی نفرت کے احساس سے بھنویں تن گئیں۔

☆☆☆

وہ ایک ماڈل اور کنگ لیڈی کے قتل کے مقدمے کی وجہ سے حد درجہ مصروف تھا۔ قتل کرنے والا موقع پر گرفتار ہو چکا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ ایک بڑے صنعتکار کا نور نظر تھا۔

''اس کے پاس بڑی بڑی سفارشیں آ رہی تھیں مگر وہ ہر ایک کو نظر انداز کر رہا تھا۔

''انسانی خون اتنا ارزاں بھی نہیں'' اس نے فون بزی کر دیا تھا کہ کوئی اسے ڈسٹرب نہ کر سکے۔

''ابتدائی تفتیش سے پتا چلا تھا کہ مجرم مقتولہ سے محبت کرتا تھا۔ مقتولہ کی آج کل کسی غیر ملکی سے دوستی کا سن کر مجرم برداشت نہیں کر سکا اور اس نے اپنی محبوبہ کی جان لے لی تھی۔ علاوہ

از یں کچھ بھاری بھر کم رقم کا بھی جھگڑا تھا۔

جب بھی کوئی ایسی واردات ہوتی وہ دنوں ڈسٹرب رہتا تھا۔ اب تو بات بھی کچھ اور تھی۔ گھریلو بے سکونی نے اسے بہت چڑ چڑا سا کر دیا تھا۔

رات کے تین بجے اسے ایک فون کال نے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ گھریلو ملازمہ نے اسے بتایا کہ ابھی سے دس منٹ پہلے وہ ایک بیٹی کا باپ بن چکا ہے۔ یہ خبر ایسی تھی کہ اس سے رہا نہیں گیا۔

جب وہ لاہور پہنچا تو ایمن گھر آ چکی تھی۔ وہ اپنے بیڈروم میں تھی اور اس کے بے تحاشا رونے کی آواز نے شاہ عالم کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ کچھ انہونی کے احساس نے اسے بے حد پریشان کر دیا تھا۔ جوں ہی وہ بیڈروم کے دروازے تک پہنچا اندر سے آتی چیخوں کی آواز نے اس کے قدم زنجیر پا کر دیے تھے۔

''باجی تمہیں کس نے مار دیا۔ تمہیں کس نے قتل کیا۔ تم تو میری بربادی کا سن کر پوری طرح جشن بھی نہیں منا سکی ہو۔ دیکھو تم نے جو چاہا، بالکل ویسے ہی ہوا۔ مجھے عالم نے گھر سے نکال دیا، اپنی زندگی سے نکال دیا۔ تمہاری خواہش پوری ہوگئی۔ تمہارا انتقام اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ تم نے اپنی توہین کا بدلہ لے لیا۔ پھر تم کیوں چلی گئی ہو'' وہ اور بھی نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی جسے سن کر شاہ عالم کے قدموں کے نیچے سے زمین سرک رہی تھی۔

''اسارہ باجی تجھے کس کی نظر لگ گئی'' پھر اپنی بیٹی کے رونے کی آواز سن کر وہ اک پل کے لیے خاموش ہوئی اور پھر ایک مرتبہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔

''بی بی! آپ کی دعا پوری نہیں ہوئی۔ ایک اور بدنصیب بیٹی اس دنیا میں آ گئی ہے''

شاہ عالم جھکے سر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ ایمن ایک دم ہی سہم کر خاموش ہو گئی تھی۔ عالم دھیمے قدموں سے چلتا اس کے قریب آیا۔ اس کی گود میں لیٹی بچی کو اٹھایا، چوما اور پھر بولا۔

''میری بیٹی کو آئندہ کبھی بھی بدنصیب مت کہنا۔ یہ تو بہت بخت آور ہوگی۔ میں اسے بی بی کی طرح جائیداد کی خاطر رسموں کی بھینٹ نہیں چڑھاؤں گا۔ یہ بہت سا پڑھے گی، یہ نارمل زندگی جیے گی۔ حویلی کی عورتوں کی طرح میں اسے اب نارمل زندگی نہیں بخشوں گا۔ یہ میرا اپنی بیٹی سے وعدہ ہے'' ایمن نے دیکھا کہ شاہ عالم کی آنکھوں سے آنسو گرا اور بچی کے کمبل میں جذب ہو

گیا۔ ایمن ششدر تھی، حیران تھی اس کایا پلٹ پر پھر شاہ عالم نے گڑیا کو ایمن کی طرف بڑھا کر کہا۔

''معافی کا لفظ بہت چھوٹا ہے ایمن! پھر بھی میں چاہوں گا کہ تم اپنی بیٹی کی خاطر مجھے معاف کر دو'' اس کی آنکھیں بھیگی بھیگی سی تھیں۔ ایمن کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ آہستگی سے اس کے قریب آئی اور پھر اس کے کندھے پہ سر ٹکا کر بے آواز رونے لگی۔

''جو گناہ تم نے کیا ہی نہیں اس کی معافی بھلا کیا ہوئی۔ مجھے ابھی پتا چلا ہے کہ مقتولہ تمہاری بہن تھی جس نے مرنے سے پہلے مجھے تمام حقیقت بتا دی تھی۔ اس نے مجھے اپنی گھٹیا سازش کے متعلق بتا دیا تھا اور درخواست کی تھی کہ میں تمہیں واپس گھر لے آؤں...... اسی پل فائرنگ کی آواز سنائی دی اور میرا اس سے رابطہ ختم ہو گیا میں نے فوراً اس کے گھر میں ریڈ کیا اور مجرم کو موقع پر گرفتار کر لیا گیا میں جانتا ہوں یہ صدمہ تمہارے لیے بہت بڑا ہے مگر میں مجرم کو سزا دلوانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا'' شاہ عالم نے اسے یقین دہانی کروائی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ایمن کو معتبر کر دیا تھا اور وہ جان گئی تھی کہ رحم دلی، خلوص، معافی اور اچھائی، کبھی ضائع نہیں جاتی۔

وہ اپنے گھر میں بے حد خوش اور مطمئن تھی۔ اکثر گوٹھ اسکول کے دورے پر چلی جاتی۔ بی بی کی تربت پر دعائے خیر پڑھتی۔ گاؤں کی عورتوں کے مسائل سنتی۔ پھر اس نے گاؤں میں ہسپتال بنوانے کا ارادہ کر لیا۔ یہ بی بی کا ایک اور خواب تھا جسے اس نے پایہ تکمیل تک پہنچانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔

آج بہت عرصے بعد نہ جانے کیوں دل بے حد گھبرایا تو وہ اماں سے ملنے چل دی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ باجی کی موت کا اماں پر کیا اثر ہوا ہے مگر یہاں آ کر وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ اماں لاؤنج میں رکھے مخملی صوفے میں دھنسی ناخنوں پر کیوٹکس لگا رہی تھیں میوزک آن تھا اور اماں کے لب ہل رہے تھے۔ ایمن نے غور سے دیکھا۔ اماں کے بال کھلے تھے شاید انہوں نے انہیں نیا نیا ڈائی کروایا تھا۔ ایمن اماں سے ملنے کے لیے آگے بڑھی تو انہوں نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔

ان کی آنکھوں میں پہچان کا کوئی رنگ نہیں تھا اور جب آدمی اپنی پہچان بھول جاتا ہے تو اسے اپنی شکست تسلیم کر لینی چاہیے۔

اماں نے اسے دیکھ کر بلند آواز میں ملازمہ کو پکارا اور اسے گھر سے نکالنے کا آرڈر دیا۔

جاتے سے ریشم نے انتہائی دکھ کے عالم میں اسے بتایا۔

''بی بی! بڑی بیگم کا ذہن ٹھیک نہیں رہا'' اور وہ ششدر سی اس بڑی محل نما کوٹھی کو حیرانی سے دیکھنے لگی۔ جس میں زندگی کی ہر آسائش موجود تھی۔ جس کا ہر بیڈروم بڑی نفاست سے سجا تھا۔ جس کے کچن کا نقشہ امریکن طرز کا تھا۔ جس کے ہر بیڈروم کے ساتھ اٹیچ باتھ تھے اور وہ بھی اتنے شاندار کہ دیکھتے رہنے کو جی کرتا۔ خصوصاً اسارہ کا کمرہ اور اس کا باتھ روم جس میں بڑے بڑے قد آور آئینے نصب تھے۔ جس کی دیواریں گویا کانچ کی تھیں۔ جس کے واش بیسن بہت بڑے بڑے تھے اور سنگ مرمر سے بنا نہانے والا ٹب جس میں داخل ہونے کے لیے صندل کی خوشبودار لکڑی کی سیڑھیاں بنوائی گئی تھیں۔

''اور اس کی بہت ہی پیاری، خوبصورت اور حد درجہ ماڈرن بہن اسارہ جسے بہت زیادہ امیر بننے کا شوق تھا۔ جو خود کو بزنس کوئین سمجھتی تھی۔ جس کا ذہن اتنا شارپ تھا کہ بڑے بڑے بزنس مین اس کی باتوں کے جال میں الجھ جاتے۔ جو فراڈ بھی بہت ایمانداری کے ساتھ کرتی تھی۔ جسے ہمیشہ کے لیے نمبرون رہنا تھا وہ اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی۔

امل نے اسے بتادیا تھا کہ امن، زوہیب سے خلع لینے کے بعد اپنی ذاتی اکیڈمی چلا رہی ہے۔ اس کے دو بچے تھے۔ وہ اپنی زندگی سے مطمئن تھی۔ زوہیب نے اپنی اکیڈمی میں پڑھنے والی ایک خوبصورت اسٹوڈنٹ سے نکاح کرلیا تھا۔ امن زوہیب کی بے وفائی کے بعد اس سے اچھے طریقے سے الگ ہوگئی تھی۔

امل کینیڈا میں ہوتی تھی۔ اور اس کے پاس اولاد کی نعمت نہیں تھی۔ اس کے بابل کی بیٹیوں کے ہزار دکھ تھے۔ وہ کس کس کو بیان کرتی اور نہ جانے کیوں اتنی پیاری بیٹی اور شاہ عالم جیسے شوہر کیساتھ بھر پور زندگی گزارنے کے باوجود ''ام ایمن'' نامکمل سی تھی، ادھوری سی تھی، کیونکہ اس کا میکہ آباد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے بابل کا آنگن سنسان تھا۔

......❀......